تشکر

اپنے آباءواجداد، عزیز واقارب اور رشتہ داروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اوران کے ساتھ تعلق قائم کرنا ایک فطری جذبہ ہے جو ہم سب میں موجود ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کو ایک مرتبہ پھر فعال کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو مجلس عاملہ کی ماہانہ میٹنگ میں اکثر یہ بات زیرِغور آتی تھی کہ ہماری نئی نسل اپنے عزیز واقارب اور رشتہ داروں سے دور ہوتی جارہی ہے، اپنے بزرگوں کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے قابلِ فخر کارناموں سے ہم میں سے بیشتر لوگ قطعی طور پر ناواقف ہیں۔ اسی لیے ادارہ کے دائرۂ کار کی حد بندی میں تین بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا:

۱۔ عزیز واقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلق اور محبت کو قائم رکھنا اور بڑھانے کی کوشش کرنا۔

۲۔ضرورت مند رشتہ داروں کی مدد اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے خدمات انجام دینا۔

۳۔اپنے آباءواجداد کے متعلق معلومات حاصل کرنا۔ خاص طور پر برادری کے وہ حضرات جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اوران کو محفوظ کرنا۔ ادارہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کا تحفظ کرے۔

چنانچہ اس سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ممبران میں مولانا سید اصلح الحسینی (مرحوم) سید ظفر الدین احمد (مرحوم) سید احمد (مرحوم) سید مظفر ضیاء (مرحوم) سید عارف نیازی، سید احمد ہمدانی، سید محمد احمد واسطی، ڈاکٹر ظفر زیدی اور عثمان غنی راشد کے ساتھ راقم کا نام بھی شامل تھا۔

اس کمیٹی کے بیشتر ارکان اپنی روزمرہ مصروفیات کے سبب زیادہ فعّال کردار ادا نہ کرسکے، سوائے مولانا اصلح الحسینی اور سید ظفر الدین احمد صاحب کے۔ میں اور ادارہ انتہائی شکرگزار ہیں کہ ان حضرات نے باوجود ناسازئ طبعیت کے نہ صرف اس کام کے لئے وقت نکالا بلکہ انتہائی قیمتی تاریخی معلومات فراہم کیں۔ مجھے یاد ہے ۱۹۸۶ء کا پورا سال جب میں ان کے گھر واقع جہانگیر روڈ جاکر معلومات حاصل کرتا تھا تو طریقہ کار یہ تھا، آپ موضوع منتخب کرتے اور پھر کتابوں، تاریخی حوالوں اور اپنی یادداشت سے مضمون تحریر کراتے۔ میں اس کو فیئر کرتا اور پھر آپ اصلاح فرماتے۔ محترم چچا سید ظفر الدین مرحوم کے کئی مضمون جو اس کتاب میں شامل کیئے جارہے ہیں وہ آپ کی بہترین تحریری کاوشوں کا مظہر ہیں۔

۱۹۷۰ء میں پاکستان ہجرت کے بعد فروری ۱۹۸۶ء میں پہلی بار گلاؤٹھی جانا ہوا، میں شکرگزار ہوں اپنے چچازاد بھائی مولانا سید نسیم الدینؒ کا جنہوں نے مدرسہ منبع العلوم کی مکمل تاریخ، منشی مہربان علیؒ کی تاریخی وصیت اور چند دیگر انتہائی قیمتی تاریخی قلمی کتابوں کے نسخوں کی فوٹو کاپیاں دیں۔ منشی جی مرحوم کی وصیت تقریباً دوصدی قبل تحریر کی گئی تاریخی دستاویز ہے جو اب اس کتاب کا حصہ ہے۔

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۱ء تک اس کام کے علاوہ چند ہی مضامین کا اضافہ ہوسکا اور پھر فروری ۱۹۹۲ء سے میرے سعودی عرب آنے کے بعد روز وشب کی مصروفیات، وطن سے دوری اور ادارہ سے عملی طور پر علیحدگی نے اس کتاب کی تکمیل کو ناممکن کردیا۔

چند سال قبل اپنے پرانے کاغذات کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری تمام محنت اور کاوشیں جن کی شروعات ہم نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کی تھی، ضائع ہونے کے قریب ہیں، اگر ایسا ہوا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ کام مکمل کرنے کا جذبہ ایک بار پھر بیدار ہوا، اللہ تعالیٰ سے مدد اور استقامت کی بھی دعا کی۔ جدہ سعودی عرب میں مقیم اپنے بڑے بھائی سید رضی الدین ہاشمی سے دل کی بات کی تو انہوں نے نہ صرف ہمت بندھائی بلکہ اپنے ساتھ ندیم ماہرؔ (مقیم دوحہ/قطر) جو رشتہ میں ہمارے بھتیجے ہیں، پر مشتمل تین افراد کی کمیٹی تشکیل دی۔ ندیم ماہرؔ دوحہ قطر میں ادبی دنیا کی جانی پہچانی مقبول شخصیت ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور بہترین منتظم ہیں ۔ گوکہ وزارۃ داخلہ قطر میں اہم عہدے پر فائز ہیں لیکن تمام تر مصروفیات کے باوجود نہ جانے کہاں سے اتنا وقت نکال لیتے ہیں کہ بیک وقت کئی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں بس، اسی کے ہوکر رہ جاتے ہیں، یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور شاید یہی ان کی کامیابی کا بھی راز ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ مستند کتابوں سے کئی تاریخی دستاویزات اور قلمی نسخے ہم نے اس کتاب میں شامل کئے جو نہ صرف قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے بلکہ اس کتاب کی اہمیت کو بھی اجاگر کریں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میجر رفیع الدین باور کی کتاب ''برن سے بنوں تک'' کا ذکر کروں گا جو تیس سال قبل بلندشہر کی تاریخ پر لکھی گئی ایک معیاری تحقیقی کاوش ہے۔ مولانا بدر عالم مرحوم کے والد بزرگوار حاجی تہور علی کی نادر کتاب ''یادگار علوی'' (یہ کتاب ۱۱۵ سال قبل مرادآباد سے شائع ہوئی) سے ماخوذ مضمون، ''الدن ایک صدی قبل'' اور ''موضع سینٹھ'' پر محترم چچا سید مسعود علی رضوی (مرحوم) کا تیس سال قبل لکھا گیا مضمون جو کہ سینٹھ کی سوسالہ تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح قصبہ گلاؤٹھی پر مولانا اصلح الحسینیؒ، سید ظفر الدین احمدؒ، ندیم ماہرؔ اور سید رضی الدین ہاشمی کے لکھے گئے مضامین قصبہ کی تاریخ اور حالات کو جاننے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔

محترم سید منصور عاقل صاحب کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے نہ صرف حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ بہترین مشوروں سے رہنمائی بھی فرمائی۔ آپ کی اجازت سے کئی مضامین ہم نے آپ کی تحریر کردہ تاریخی کتاب ''گلاؤٹھی'' سے لئے ہیں، جو اس موضوع پر آپ کی بہترین تحقیقی ادبی کاوش ہے۔

اخیر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہمارے کام کو سراہا اور اسکو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہمارا کسی بھی طور پر تعاون فرمایا۔ خاص طور پر محترم عبدالستار خان ایڈیٹر اردو نیوز جدہ اور برخوردار چوہدری ایاز رفیق اردو نیوز جدہ کا مشکور ہوں جنہوں نے میری معاونت کرتے ہوئے کتاب کی تصحیح، تخریج، حاشیہ آرائی اور تصاویر کو شامل کرنے میں مدد فرمائی۔ محترم جہانگیر احمد شمسی پروپرائیٹر جے اینڈ اے پرنٹنگ سروسز میرے خصوصی تشکر کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب کی طباعت کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر مکمل کیا۔ یہاں اپنے چھوٹے بھائی عزیزم وسیم الدین ہاشمی کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی ہوگی جنہوں نے از اول تا آخر اس کام میں ہماری پوری ٹیم کی مدد کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلصین کو اپنے فضل سے نوازے۔

مجھے افسوس ہے بہت سارے احباب اور عزیز و اقارب جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اس کتاب میں شامل ہونے کے مستحق تھے، وقت کی کمی اور معلومات تک رسائی نہ ہونے کے سبب اس کتاب کا حصہ نہ بن سکے۔ مجھے ہمیشہ ملال رہے گا کہ اپنی مصروفیات اور کم علمی کی بنا پر اس کام کو مکمل کرنے میں تاخیر ہوئی۔ کاش وہ حضرات جنہوں نے اس کام کی بنیاد رکھی تھی اپنی زندگی میں اس کو مکمل ہوتا دیکھ پاتے۔

نسیم الدین ہاشمی

☆☆☆

نایاب لوگ

محترمہ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی تصنیف ''نایاب ہیں ہم'' کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی اُن لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں جواب دور دور نظر نہیں آتے اسی لئے نایاب ہیں۔ محبت، وفا، سچائی، شرافت، لگن اور سادگی کے پتلے اپنے اصولوں پر برگد کے پرانے پیڑ کی طرح قائم، دائم، صابر، شاکر، زندہ اور مگن عظیم انسان۔

ایسے ہی انسانوں میں تھے ہمارے قصبہ گلاؤٹھی کے جناب منشی سید مہربان علی اور حافظ سید شفیع الدین مرحوم جو اٹھارہویں اور ۱۹ویں صدی میں افق پر ابھرے اور چھا گئے۔ انکی سماجی تعلیمی اور سیاسی خدمات کا ذکر اس کتاب کا اہم باب ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ انکے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ ہم ان کی خدمات کا قرض نہیں اتار سکیں گے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زیر نظر کتاب ''تذکرہ سادات گلاؤٹھی''، تاریخ کے گمشدہ اوراق خالصتاً تحقیقی دستاویز ہے، جس میں تفصیل سے نہ صرف سادات گلاؤٹھی کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ ان تمام اعزہ کو بھی شامل کیا ہے جن کا تعلق مدرسہ سادات ہاپوڑ، موضع الدن، موضع سیٹھ، قصبہ ڈاسنہ، دھولانہ یا سراوے سے ہے۔ منشی مہربان علی کی وصیت ایک اہم تاریخی دستاویز ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کے والد حاجی تہور علی کی نادرو نایاب کتاب ''یادگار علوی'' جو ۱۱۵ سال قبل مراد آباد سے شائع ہوئی، الدن سے متعلق ان کا مضمون نہ صرف الدن بلکہ وہاں کے خاندانوں کے بارے مکمل معلومات دیتا ہے نیز زیر نظر کتاب کی افادیت میں قابل ذکر اضافہ ہے۔ مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور مولانا فخر الدین (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) پر مضامین اس کتاب کی شان ہیں۔ ان بزرگوں سے ہماری نسبت یقیناً قابل فخر اور ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔

اس برادری کی تاریخ میں شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ سب سے پہلے شہید سید سرفراز علی تھے، دوسرے شہید سید رحمت اللہ صاحب جو بہادر شاہ ظفر کی فوج کے ملازم تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بلند شہر میں پھانسی پر لٹکائے گئے تھے۔ کتاب میں شامل مضمون شہید خالد واسطی ستارۂ جرأت اور تمغۂ بسالت حاصل کرنے والے پہلے مجاہد کی جرأت کی داستان بیان کرتا ہے۔

ہماری اس سرزمین نے سید ابوالحسن ناطقؔ اور سید عبدالوحید فداؔ جیسے جلیل القدر شاعر پیدا کئے۔ اس کتاب میں دیوان ناطقؔ سے ماخوذ مولانا ناطقؔ کی سوانح حیات پر مضمون شامل کیا گیا ہے۔ ہمارا آج (حال) بھی بڑا روشن ہے۔ جناب سید منصور عاقل کا شمار ملک کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے، ہم بلا شبہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تعلق ہماری برادری سے ہے۔ اس کتاب کی تدوین وترتیب میں ادارہ ان کا ممنون اور مشکور ہے، ان کی کتاب گلاؤٹھی سے ہم نے استفادہ کیا بلکہ انہوں نے گاہے گاہے اپنے مشوروں سے نوازا۔

سماجی سرگرمیوں میں مصروف عمل ایک قدآور شخصیت جناب سید تنظیم واسطی (مقیم برطانیہ) جن کی خدمات پر ایک مختصر مضمون شامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تنگی صفحات کی وجہ سے ہم انصاف نہیں کر سکے، تحریک اسلامی میں دنیا کے مسلمانوں کے لئے ان کی جدوجہد بڑی عظیم بھی ہے اور قابل تقلید بھی، خدا دیر تک ان کا سایہ قائم رکھے۔ آمین

قیام پاکستان کے بعد برادری کے جن لوگوں نے قانون کے شعبہ میں بڑا نام کمایا ان میں سید ناصر الدین اور عثمان غنی راشد سرفہرست ہیں۔ سید عثمان غنی راشد سے میری ملاقات کے عنوان سے مضمون کتاب کا حصہ ہے۔ یقیناً نہ صرف وہ ایک بڑے قانون داں اور وکیل تھے بلکہ ایک بہت اچھے انسان تھے۔ سرکاری اور کارپوریٹ سیکٹر میں قیام پاکستان کے بعد جو شخصیات قابل ذکر ہیں ان میں جناب محمد احمد واسطی، جناب محمد احمد سالار، جناب نور احمد سالار، جناب تسلیم واسطی اور جناب سید فصیح الدین کے نام شامل ہیں۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ باوجود کوشش کے، خاطر خواہ مواد ہم اس اشاعت میں شامل نہیں کر سکے۔ خدا کرے کہ ہمیں اس قرض کو ادا کرنے کا موقع ملے۔ پاکستان بننے کے بعد ''گلاؤٹھی اور اس کے مکیں'' آپ کو گلاؤٹھی کی سیر کرانے کی ایک سعی ہے۔ جو کہ امید ہے آپ کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

سید رضی الدین ہاشمی

☆☆☆

مجھے کچھ کہنا ہے

اپنی مٹی کی محبت، وطن سے پیار، اس سے لگاؤ، عہد رفتہ اور یاد رفتگاں یہ سب وہ جذباتی سلسلے ہیں کہ آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی حال میں اِن میں گرفتار رہتا ہے یا ہو ہی جاتا ہے۔

یہی کچھ تقسیم ہند کے بعد کی صورتحال ہے۔ گو کہ قصبہ گلاؤٹھی کے بیشتر سادات خاندانوں نے ہجرت کر کے پاکستان کو اپنا مسکن بنالیا لیکن کچھ سروں میں وہی سودا (جو ایک عام آدمی کو بھری صفوں میں ممتاز کر دیتا ہے) سوار ہوتا ہے۔ جس کا آغاز ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی سے ہوا۔ یہ چند گلاؤٹھی کے محبین کی ایک جماعت تھی، یہ چند لوگ تھے جن کو پچاس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنے پسینہ کے اندر اُس بھینی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی تھی جو کھیت میں ہل چلانے کے بعد ایک کسان کو اُس کی محنت میں سے آتی ہے۔ اُن نفوس کو وہ ذائقہ اپنی زباں کے کوروں پر محسوس ہوتا تھا جو آموں کے باغات اور خربوزے اور تربوز کی بیلوں کے بل کھاتے مناظر سے لطف اندوز ہو کر ملتا تھا۔ اُن دیوانہ واروں کو وہ گرمی کی شدت میں دالان کے درمیان بڑا فرشی پنکھا یاد آتا تھا جس کی کمی ایئر کنڈیشن بھی پوری نہیں کر سکتا۔

یہ کام شجرات کی ترتیب سے شروع ہوا اور عید ملن، امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات، سرکردہ شخصیات کو توصیفی اسناد و شیلڈ پیش کرنے سے ہوتا ہوا، رفاہی کاموں (تقسیم زکاۃ و امداد) سے بڑھ کر الحمدللہ گلاؤٹھی اور اس کے مضافات کے سادات کی تاریخ کی تدوین تک لے آیا۔ یہ اللہ کا کرم ہے اور ان لوگوں کا خلوص ہے۔

۲۰۱۴ء کے اوائل میں جناب سید رضی الدین ہاشمی صاحب اور سید نسیم الدین ہاشمی صاحب جو کہ میرے رشتہ میں تو چچا ہوتے ہیں مگر بڑے بھائیوں کی حیثیت سے ان کی سرپرستی ہمیشہ ساتھ رہی ہے، ان حضرات نے کتاب کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں بات کی۔ اس کام کو کرنے کا ارادہ میں نے بڑی مدت پہلے کیا ہوا تھا جس کا آغاز اپنے دیرینہ رفیق جناب مظہر غیاث ہاشمی کے ہمراہ نوّے کی دہائی میں کیا تھا لیکن وسائل کی کمی اور میرے دوحہ قطر آنے سے یہ کام تقریباً موقوف ہو گیا اور مظہر بھائی بھی کسب معاش کے لیے دہلی منتقل ہو گئے۔ لہٰذا مجھے یہ لگا کہ شاید یہ صحیح وقت پر صحیح قدم ہے۔ اور اس طرح اس کتاب پر کام شروع ہوا۔

تاریخ ایک حسّاس موضوع ہوتا ہے جس میں ہمیشہ کمی اور زیادتی کے امکانات برقرار رہتے ہیں۔ جب تک مستند حوالے اور مستند شخصیات کا ذکر نہ ہو تو اسے دل ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ الحمدللہ زیر ترتیب کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حوالوں کے ساتھ ساتھ مستند شخصیات کے مضامین شامل کئے جائیں تاکہ اس کی اہمیت برقرار رکھی جا سکے۔

شخصیات سے متعلق شواہد اور معلومات اکٹھا کرنا ایک مشکل امر ہے خاص کر جبکہ درمیان میں سرحدی فاصلے حائل ہوں، چاہے ٹیکنالوجی کتنی بھی ترقی کر جائے لیکن فطرت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ رہی کہ اس کتاب کی اشاعت میں تاخیر در تاخیر ہوتی

رہی۔ بہت ساری ایسی شخصیات رہ گئیں، جن کا ذکر اس کتاب میں ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں کیا جا سکا، جس کی بڑی وجہ مواد کی عدم دستیابی اور متعلقہ افراد کی جانب سے عدم سنجیدگی ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلا حصہ ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کی تشکیل اور اس کے اغراض ومقاصد اور دوسرا حصہ قصبہ کی عمومی تاریخ اور مضافات میں واقع سینٹھ ،الدن اور ہاپوڑ پر مشتمل ہے، جہاں سادات کی آپسی رشتہ داریاں تھیں۔اُن آبادیوں کا ذکر ہے۔

تیسرے حصہ میں علمائے کرام کا ذکر ہے۔گلاؤٹھی کا ایک امتیاز یہاں کا مدرسہ منبع العلوم جامع مسجد بھی ہے۔اس ادارہ کی خدمات، اس سے فیضیاب ہونے والی شخصیات، مدرسین اور منتظمین کے ذکر کے بغیر یہاں کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ایک زمانہ تھا جب یہاں سادات کے ہر گھر میں ایک حافظ اور ایک عالم موجود ہوتا تھا۔علاوہ ازیں مفید عام اسکول جو کہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔چوتھے حصہ میں ادب وثقافت ہمارا موضوع رہا ہے۔ ناطقؔ وشمسؔ وخیالؔ وامیرؔ ومضطرؔ وفداؔ واخترؔ وحامدؔ کی یہ زمین ادب کے لحاظ سے بڑی زرخیز رہی ہے جس کا ذکر اس حصہ میں کیا گیا ہے۔

پانچواں حصہ ان شخصیات پر مشتمل ہے جنہوں نے مختلف میدانوں خواہ سیاست ہو، سائنس، درس وتدریس، سماجی خدمات، تجارت، معیشت، ٹکنالوجی، کمپیوٹر وغیرہ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہو اور کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔

چھٹے حصے میں ایک خاص مضمون ''پاکستان بننے کے بعد گلاؤٹھی اور اس کے مکین'' جناب رضی الدین ہاشمی صاحب نے تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے گلاؤٹھی کی یادوں کو اس انداز میں سمو دیا ہے کہ قاری اُس کے سحر میں مدتوں گرفتار رہے گا بلکہ صاحب مضمون کے خلوص اور محبت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔

ہمیں اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا احساس ہے لیکن ہماری نیت میں خلوص ہے، ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی حرف حرف آخر نہیں، غلطیوں کی گنجائش رہی ہے اور رہے گی۔

یہ کاوش آپ کے سپرد ہے۔ہمیں کسی بھی قسم کی کوئی خوش گمانی نہیں بلکہ ہم قارئین کی خدمت میں گزارش گزار ہیں کہ ہم سے جو خامیاں رہ گئی ہیں یا جن شخصیات کا ذکر ہم سے رہ گیا ہے، ہماری نشاندہی فرمائیں، ان شاءاللہ اگلے ایڈیشن میں ان کی تلافی اور اصلاح کی بھر پور کوشش کی جائے گی۔جن لوگوں نے اس کام میں ہمارا تعاون فرمایا ان کے لئے دل سے دعا ہے کہ اللہ انہیں خوش وخرم رکھے۔اس کام کو مقبول ہی نہیں بلکہ شرفِ قبولیت سے نوازے۔آمین

ندیمؔ ماہر

☆☆☆

آغازِ کلام

’’خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے‘‘

’وطن اور اہلِ وطن‘ بظاہر یہ الفاظ معمولاتِ زندگی میں زبان زدِ خاص و عام رہتے ہیں اور اپنے معنی کے اعتبار سے بھی نہ مشکل ہیں نہ وضاحت طلب لیکن یہ اُن لفظوں کی طرح ہیں جو ماورائے معانی بھی جذبات واحساسات کی بیکراں وسعتوں کے حامل ہیں یہی وجہ ہے کہ وطن کے حوالے سے محبت اور اہل وطن کی نسبت اخوت ہر انسان کی جبلت یا فطرت کا نشانِ امتیاز بن جاتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اُس مٹی سے اپنے تعلق کو کبھی فراموش نہیں کرتے جس نے انھیں جنم دیا اور جس کا قرض اتارنا وہ اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔

درحقیقت ’’تذکرہ ساداتِ گلاؤٹھی‘‘ کتاب کا مطالعہ ہی میرے لئے درج بالا سطور تحریر کرنے کا محرک بنا اور کتاب کے مرتّبین کے لئے دل سے دعائیں نکلیں کہ گلاؤٹھی کی مٹی کا قرض مجھ پر بھی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ زیرِ نظر دستاویز کی مجلسِ ادارت کے اراکین عزیزانِ گرامی سید رضی الدین ہاشمی، نسیم الدین ہاشمی اور ندیم ماہر کی یہ قلمی کاوش وطن کے لئے اور بالخصوص اُن اہل وطن کے لئے جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی دانش و حکمت، علم و تدبّر اور ذہانت و ذکاوت سے وطن کا نام روشن کیا اُن کے اخلاص کی مظہر ہے۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ بہرحال ماضی و حال کی شخصیات پر جن ذرائع سے معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ معتبر بھی ہیں اور مستند بھی۔ حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینیؒ ایک نابغۂ روزگار عالم دین، محقق اور شعر و ادب پر ناقدانہ بصیرت رکھنے والے گلاؤٹھی کے عظیم فرزند تھے۔ مجلس ادارت نے ان کے جو مضامین شامل کئے ہیں وہ گلاؤٹھی کی تاریخ کا گنجینۂ معارف کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں گلاؤٹھی سے تعلق رکھنے والی ہستیوں میں اردو اور فارسی ادب کے نامور شاعر سید محمد حسین یقین، منفرد فکر و اسلوب کے شاعر شمس الحق خیال اور انوار الحق کمالی کے علاوہ سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی بھی شامل ہیں جو برصغیر کے شعر و ادب کی کہکشاں پر نصف صدی سے زیادہ مدّت تک ایک کوکبِ درخشاں کی صورت جلوہ بار رہے۔ شعر و ادب کے علاوہ سیاست و صحافت بھی آپ کی جولانگاہ بنے اور آپ کو ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی کا رکن رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ دیگر کے علاوہ ایک اور نام سید ظفر الدین احمد کا ہے جو ایک ماہر تعلیم، سکالر اور ساداتِ گلاؤٹھی کے شجرہ ہائے نسب کے محقق کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کا مقالہ بعنوان ’حسب نسب اسلام کی روشنی میں‘ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ محترم حاجی تہور علی صاحب کی ایک نہایت تحقیقی کاوش ’اُلدن۔ ایک صدی قبل‘ میرے لئے نہایت جاذبِ توجہ ثابت ہوئی کہ اُلدن جو میرٹھ ضلع کا ایک قصبہ بھی نہیں بلکہ ایک گاؤں تھا اُس کی مٹی نے آسی اُلدنی جیسی عظیم علمی شخصیت کو جنم دیا جنہیں آج تک علمی حلقوں میں غالب پر ایک معتبر و مستند شارح سمجھا جاتا ہے۔ میں رضی الدین ہاشمی کی اس رائے سے متفق ہوں کہ سادات گلاؤٹھی کے ساتھ ہاپوڑ، اُلدن، دھولانہ اور سینٹھہ کے سادات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے کیونکہ ان مقامات کے درمیان رشتہ داریاں اور قرابتیں اس کثرت

سے تھیں کہ انہیں نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ بہرکیف میں اس فہرست میں قصبہ ڈاسنہ کا بھی اضافہ کرنا چاہوں گا۔

مرتّبین کے قائم کردہ جس اختصاص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ وطن اور اہل وطن کی فلاح و بہبود کے جذبہ سے سرشار مرکوزِ توجہ ایسی ہستیاں تھیں جن کی خدمات سے کوئی بھی مورّخ صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ منشی مہربان علیؒ اور حافظ شفیع الدینؒ کے نام کتاب کا انتساب اس حقیقت کا جواز فراہم کرتا ہے۔ رکن مجلسِ ادارت سید نسیم الدین ہاشمی نے کتاب میں منشی سید مہربان علی کا وصیت نامہ شامل کر کے جو ایک مخطوطہ ہے کتاب کی افادیت و اہمیت کو دوچند کر دیا ہے اور وطن کے اکابروزعماء کے احوال وکوائف کو سند اعتبار عطا کر دی ہے جن میں پروفیسر ڈاکٹر سید نفیس احمد جیسی شخصیت بھی شامل ہیں جنہیں گلاوٹھی کے ایک فرزند اور عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں کی حیثیت سے تقسیم ملک سے قبل باؤنڈری کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کے چیرمین اور ڈین آف فیکلٹی کے منصب پر فائز رہے۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں بھی ارتھ سائنسز ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین رہے۔ آپ کو حکومت پاکستان کی جانب سے ’’تمغۂ امتیاز‘‘ عطا کیا گیا۔

اختتام سے قبل میں سید رضی الدین ہاشمی کو اُن کے مضمون ’’پاکستان بننے کے بعد گلاوٹھی اور اس کے مکین‘‘ پر ہدیہ تہنیت پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے گلاوٹھی کے مضافات، کوچہ و بازار اور ماضی و حال کی ایسی خوبصورت لیکن حقیقت پسندانہ مصوّری کی ہے جس نے میرے بچپن کی یادوں کو تازہ کر کے مجھے آبدیدہ کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مضمون پڑھ کر ہر وہ شخص جس کی بچپن کی یادیں گلاوٹھی سے وابستہ ہیں متاثّر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں وطن کی محبت اور یادوں سے سرشار اراکین مجلس ادارت کو یہ تاریخی دستاویز مرتّب کرنے پر خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور ان تمام خواتین وحضرات کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے اس کارِخیر میں معاونت فرمائی۔

سید منصور عاقل

اسلام آباد مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۱۵

☆☆☆

پہلا باب

ہماری تنظیم

ہماری تنظیم کا مقصد

مولانا سید اصلح الحسینی

قرآن حکیم کی ایک آیت ہے کہ جس میں پوری نوع انسانی کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو ایک ہدایت کی گئی ہے۔

یَاایُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا o اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ o اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

ترجمہ: ’’لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے‘‘ (سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

یہ آیت ہم سبھی نے تشریح اور توضیح کے ساتھ بارہا سنی ہے لیکن اس میں جو ہدایات مضمر ہیں ان پر غور کرنے کی طرف پوری توجہ نہیں دی اور عملی طور پر اپنی معاشرتی زندگی میں اپنے معاملات کی بنیاد بنانے کی طرف اور بھی کم توجہ دی۔ بے شک خاندان اور قبیلہ کی تقسیم معاشرتی تعارف اور انتظامی ضرورتوں کے لیے ناگزیر ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ منشورِ وحدت جو انسانوں کو مثبت طور پر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور وہ شعورِ قومی جو قوم کے افراد میں بھائی چارہ کی روح پیدا کرتا ہے، اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اگر مختلف نسلی اور قبائلی وحدتوں میں اخوت اور وحدت کا یہ شعور نہ ہو تو معاشرہ مختلف اور منتشر وحدتوں (Units) کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر نسبی خاندان اور قبیلوں میں مزاجوں اور رجحانات کے اختلاف کے باوجود جو چیز وحدت کو برقرار رکھتی ہے وہ صلہ رحمی کا اسلامی تصور ہے جس کے دنیوی فوائد کی طرف بھی دینی ادبیات میں توجہ دلائی گئی ہے اور آخرت کا اجر و ثواب بیان کر کے اس کو قائم رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

صلہ رحمی کی ترغیب میں جو بہت سی روایات بیان کی گئی ہیں ان کی تفصیل پیش نظر نہیں ہے۔ اجمالی طور پر رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات کا حوالہ اس کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ رحمی تعلقات ایک فریادی کی شکل میں مشکّل ہو کر عرش الٰہی کے قریب اس طرح فریاد کریں گے کہ اے رحمٰن الرحیم! آپ نے ان رحمی تعلقات کو اپنے اس رحمٰن کی معنویت کا فیض بخشا ہے اور اسی اسم (رحمان) کے حوالے سے ہم آج آپ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ جس شخص نے دنیا میں ہم کو ملایا، وابستہ رکھا (تعلقات کے حقوق ادا کیے) آج کے دن آپ بھی اس کو اپنی راحتِ رحمت سے وابستہ رکھیے اور جس نے ہم کو کاٹا ہے یعنی آپ نے جو ہمارے حقوق متعین کیے تھے ان کو نظر انداز کر کے قطع تعلق کیا ہے آپ بھی آج ان کو اپنی رحمت سے کاٹ دیجیے۔

رحمی تعلقات کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس کو ہمیں اپنے ذہن میں متعین کر لینا چاہیے۔ لفظی اور معنوی طور پر اس کا مفہوم خاصا وسیع ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ دو افراد کے درمیان کوئی مشترک ماں اگر ہے تو اس کے ماں کے تعلق سے افراد ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں اور اپنی واقعی وسعت اور امکان کی حد تک ان کو ادا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

اس سلسلے میں ہم قانونِ وراثت کے بعض اصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی وراثت اس کی اولاد، والدین، دادا، پردادا اور ان کی اولاد تک پہنچتی ہے جن کو علم وراثت کی اصطلاح میں عصبیات کہا جاتا ہے۔ اسی کے دوش بدوش ماں نانی اور اسی طرح مادی سلسلہ کے اجداد اور جدات وراثت کی اصطلاح میں ذوی الارحام کہلاتی ہے، لیکن حقیقتاً اسلام کا دیا ہوا یہ تصورِ تعلق بڑا وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ ہم مذہب اور اس کے آگے پوری انسانی نسل تک حاوی ہو جاتا ہے۔

تفہیم کی سہولت کے لیے ایک واقعہ کا ذکر بے موقع نہیں کہ ایک مرتبہ امیر معاویہؓ کے پاس ایک شخص عطاء اور بخشش کی طلب میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اے امیر المؤمنین! صلہ رحمی کا حق ادا کیجیے۔ یہ شخص ایک غیر معروف بدوی تھا اور کسی بھی قبائلی رشتہ سے امیر معاویہ کے سلسلہ نسب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی درخواست کے جواب میں امیر معاویہؓ نے ازراہ ظرافت فرمایا کہ تیرا برا ہو، میرے اور تیرے درمیان کون سا رحم مشترک ہے۔ بدوی نے کہا کہ کیا ہم آدم کی اولاد نہیں اور حوا کا رحم ہمارے درمیان وہ مشترک رحم نہیں جس کے حق کا میں مطالبہ کر رہا ہوں۔ بدوی کی بات سن کر امیر معاویہؓ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بخشش عطا کے لیے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ شاید میں دنیا کا پہلا شخص ہوں گا جو اس مشترک رحم کا حق ادا کرے گا اور صلہ رحمی کے متعلق اسلام کی ہدایات پر اس وسیع مفہوم کی حد تک عمل کرے گا۔

اس واقعہ سے صلہ رحمی کے تصور کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی شخص اس حق کا تصور رکھتے ہوئے کسی دوسرے فرد کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے تو وہ یقیناً اسی اجر کا مستحق ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے صلہ رحمی کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اس حق کے جن دنیاوی فوائد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں رزق کی وسعت، مال اور اولاد میں خیر و برکت اور درازی عمر کی بشارت شامل ہے۔ اس کے تجربات اگر ہم اپنے گردوپیش کے حالات میں نظر ڈالیں تو مشاہدہ میں آتی ہیں۔

انہی حقوق اور حسن معاملہ کے ایک وسیلہ کے طور پر یہ نسلی علاقائی یا قبائلی تنظیموں کا جواز ہے۔ یہ تعصّبات کو بیدار کرنے کا ذریعہ یقیناً نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے۔

اخوان السادات کے دائرہ کار کی حد بندی اور وسعت میں اس اصول کو ایک بنیادی مقصد کے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اپنے دائرہ کار کی حدود میں یا اس کے باہر کسی عصبیت کو اپنے حسن معاملات کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس وسعت کی طرف ہمیں قرآن کریم کی اس آیت سے بھی رہنمائی میسر آتی ہے۔

وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا ۝ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی

الْـقُرْبَىٰ وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ oاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا

ترجمہ: ''اورتم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے'' (سورہ النساء آیت نمبر 36)

☆☆☆

سید احمد

ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی ''کراچی''
تاریخ کے آئینے میں

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس ادارہ کا قیام ۱۹۵۰ء کی دہائی میں عمل میں آیا اور اس کا باقاعدہ رجسٹریشن بحیثیت فلاحی ادارہ ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ ادارہ کی تخصیص اور پہچان کے لیے اسے ''گلاؤٹھی'' سے منسوب کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قیام پاکستان سے قبل ہماری برادری کی ایک کثیر تعداد گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (یوپی) میں سکونت پذیر تھی اور رہائشی اعتبار سے گلاؤٹھی کو مرکزیت حاصل تھی۔ دوئم دینی مدرسہ منبع العلوم اور جامع مسجد یوپی ہی نہیں بلکہ پورے خطہ میں مشہور تھے۔ مزید ہماری سادات برادری کے متعدد اکابر علماء، اطباء، ادیب اور شعراء تھے جس کی وجہ سے گلاؤٹھی کو پورے صوبے میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ تقسیم ہند سے قبل نوابزادہ لیاقت علی خان نے بھی گلاؤٹھی میں مسلم لیگ کے جلسہ سے خطاب فرما کر اس قصبہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

رئیس گلاؤٹھی منشی مہربان علی مرحوم نے گلاؤٹھی میں ایک شاندار جامع مسجد ۱۲۷۳ء ہجری بمطابق ۱۸۶۶ء میں تعمیر کروائی جو کہ کافی حد تک جامع مسجد دہلی کی طرز پر تعمیر کی گئی۔ مسجد کا سنگ بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) نے رکھا انہی کی ہدایت پر ۱۲۸۷ء بمطابق ۱۸۷۰ء میں منشی مہربان علی صاحب نے ایک مدرسہ اسلامی قائم کیا۔ ابتداءً اس مدرسہ کا اجراء ان کے محل میں ہوا۔ بعد میں مدرسہ کی عمارت کی تکمیل پر یہ مدرسہ وہاں منتقل ہوا۔ حضرت مولانا عبداللہ انصاریؒ اس مدرسہ کے سب سے پہلے مدرس تھے۔ منبع العلوم کے اس اُفق پر علم وفضل کے متعدد درخشاں ستارے طلوع ہوئے۔ حضرت مولانا محمد احمد (مہتمم دارالعلوم دیوبند)، حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ایک اہم رکن حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری اور حضرت مولانا بشیر احمد خانصاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) جیسے حضرات نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اسی مدرسے سے کیا نیز اندرون ہندوپاک کے کئی شہروں سے اور بیرون ہند کئی ممالک سے بے شمار طلباء نے اس مدرسہ سے فیض حاصل کیا۔

اس برادری کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس میں نامور شعراء پیدا ہوئے جنہوں نے پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کی جن میں سے حضرت ناطقؔ، حضرت مضطرؔ، علامہ قابلؔ اور حضرت امیر حسن امیرؔ کو دنیائے شعر وادب میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اس طرح طب کے شعبہ میں بھی ہماری برادری نے نامور اطباء پیدا کئے جن میں حکیم سید مقصود علی صاحب، حکیم سید انوار الحق صاحب، حکیم سید عظمت اللہ صاحب، حکیم سید محمد صالح، حکیم سید حامد علی صاحب اور حکیم تہور علی زیدی صاحب کے نام ضلع بھر میں مشہور تھے۔ مزید برآں یہ بات بھی ہمارے لیے باعث افتخار ہے کہ پاکستان آکر بھی ہمارے متعدد احباب اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے اور متعدد

محکموں کی سربراہی کا شرف حاصل کیا۔ ان حضرات میں سید ناصر الدین ایڈوکیٹ ہیں جو ساٹھ کی دہائی میں ایک عرصہ تک مغربی پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل رہے۔ جناب محمد احمد واسطی صاحب ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے سربراہ رہے۔ اس طرح جناب عثمان غنی راشد صاحب طویل عرصہ تک صوبۂ سندھ کے ایڈوکیٹ جنرل رہے۔ جناب سید منصور عاقل صاحب قومی بجٹ کے محکمہ کے سربراہ رہے ۔ جناب مظفر ضیاء صاحب محکمہ کسٹم کے کلکٹر کے فرائض انجام دیے۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری برادری کے بیشتر افراد نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ گلاؤٹھی کی طرح کراچی ایک قصبہ نہ تھا۔ اس وقت بھی ایک بڑا شہر تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک دوسرے سے ملاقات کے لئے وقت نکالنا پڑتا تھا، اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہنا اتنا آسان نہ تھا۔ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ ہماری برادری کے ایک عزیز سخت بیمار ہو گئے اور انہیں مالی اور اخلاقی اعانت کی ضرورت پیش آئی جو کہ وقت پر انہیں حاصل نہ ہو سکی۔ اس وقت برادری کے چند بزرگوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسی انجمن یا ادارہ ہونا چاہئے جو کہ کم از کم اعزہ واقرباء کے درمیان رابطہ کا سبب بن سکے اور اعزہ ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہیں۔ لہٰذا ایک ادارہ کی تشکیل کی گئی اور اسے مذکورہ بالا وجود ادارہ اخوان السادات کا نام دیا گیا۔

ادارہ کے پہلے صدر جناب سید امیر حسن امیر تھے، ان کے بعد بالترتیب سید محمد حسن (مرحوم) سید ناصر الدین (مرحوم) سید محمود حسن واسطی (مرحوم) اور حافظ سید شفیع الدین (مرحوم) ادارہ کے صدر رہے۔ جناب سید ظفر الدین، جناب ڈاکٹر سید سعید اختر زیدی، جناب سید مسعود علی رضوی، جناب عثمان غنی راشد اور سید سعید احمد (راقم) نے ادارے کے لئے بحیثیت معتمد و خازن خدمات انجام دیں۔ اس وقت ادارے کی رکنیت حاصل کرنے کی فیس دو روپیہ ماہانہ یا دس روپیہ سالانہ اور تاحیات رکنیت کی رقم یکصد روپیہ تھی۔

ادارہ کے قیام کے ابتدائی دور میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں محترم سید ظفر الدین احمد، سید بدر الحسن واسطی اور سید عبدالسلام کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں حضرات نے ادارہ کے استحکام کے لیے حتی المقدور کوشش کی۔ محترم ظفر الدین نے اس وقت جس محنت اور لگن سے ادارے کی رکنیت سازی کے لیے کام کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ جناب بدر الحسن واسطی اور عبدالسلام صاحب طویل عرصہ تک ادارہ کے ماہانہ اور دیگر تقریبات کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ محترم سید بدر الحسن واسطی صاحب آج تک خاصی پیرانہ سالی اور ناسازیٔ طبیعت کے باوجود ادارے سے جس لگن اور تعلق کا ثبوت دیتے ہیں، وہ ہم سب کے لئے قابل تقلید ہے۔ ایک عرصے تک ادارہ کے اجلاس بھی ہوتے رہے اور عید ملن کی تقاریب بھی منعقد ہوتی رہیں لیکن اپنے مقاصد میں ادارہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا اور تعطل کا شکار ہو گیا تاہم کچھ عرصہ بعد ۱۹۸۴ء میں برادری کے چند نوجوانوں نے پھر ایسے ہی پلیٹ فارم کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا اور ان کا ایک اجلاس برادرم سید راشد علی سابق پبلیسٹی و جوائنٹ سکریٹری ادارہ ہٰذا کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا، جس میں دیگر احباب کے علاوہ جناب محمد احمد واسطی صاحب نے بھی شرکت کی اور انہی کے مشورہ پر پہلے سے قائم شدہ ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کو از سرِ نو منظّم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں پہلا باقاعدہ اجلاس راقم کی رہائش گاہ واقع نارتھ ناظم آباد میں منعقد ہوا اور ایک ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی صدارت کے فرائض راقم ہی کو سونپے گئے اور معتمد کے لیے جناب مبشر حسن واسطی کا نام منظور کیا گیا جبکہ خازن نسیم الدین ہاشمی صاحب کو مقرر کیا گیا۔ مبشر واسطی صاحب اور نسیم الدین صاحب کی محنت اور جدوجہد نے ادارہ

کی رکنیت سازی کو مضبوط بنیاد فراہم کی اور ایک سال کے قلیل عرصے میں ادارے کے ارکان کی تعداد ۲۵ سے بڑھ کر ۱۵۰ تک پہنچ گئی۔اس طرح وہ تکلیف دہ تعطل ختم ہوگیا اور ادارہ کو ایک نئی زندگی مل گئی۔

ادارہ کو مستحکم اور موثر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔آئینی ترامیم کی گئیں۔ذیلی اور علاقائی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، ادارے کو مالی طور پر مستحکم کرنے کے لیے کئی اقدامات کئے گئے۔اس سلسلے میں جناب عثمان غنی راشد،سید مقصود علی واسطی،سید ظفر زیدی ،نسیم الدین ہاشمی اور راقم کی مساعی قابل ذکر ہیں۔

تنظیم نو کے بعد ادارے کی مجلس منتظمہ کے لیے انتخابات ہوئے اور ۱۹۸۵ء میں جناب محمد احمد واسطی پہلے صدر منتخب ہوئے ۔مبشر حسن واسطی صاحب ونسیم الدین ہاشمی بالترتیب معتمد وخازن منتخب ہوئے۔۱۹۸۸ء کے انتخابات میں راقم کو صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور احسن واسطی صاحب اور نسیم الدین ہاشمی صاحب کو بالترتیب معتمد وخازن منتخب کیا گیا۔۱۹۹۲ء کے انتخابات کے نتیجے میں محمد احمد واسطی صاحب صدر،مبشر حسن واسطی صاحب معتمد اور احسن واسطی صاحب خازن منتخب ہوئے۔۱۹۹۵ء کے انتخابات میں عثمان غنی راشد صاحب صدر ادارہ،احسن واسطی صاحب معتمد اور وسیم الدین ہاشمی صاحب خازن منتخب ہوئے۔

۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۵ء کے گیارہ سال کے دورانیہ میں ادارے نے اپنے مقاصد میں یقیناً کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔۱۹۸۴ء میں ادارے کے فنڈز تقریباً ۱۴۰۰/ چودہ سو روپئے تھے۔اس وقت یہ تقریباً ۱۴/ لاکھ سے زائد ہیں۔ارکان کی تعداد ۴۰۰ سے تجاوز کر گئی ہے۔کافی تعداد میں تعلیمی وظائف دیئے گئے۔ضرورت مند اعزہ کی کسی حد تک مالی معاونت بھی کی گئی۔عید ملن کی سالانہ تقریبات کے باقاعدہ انعقاد نے برادری کے تمام ذہنوں میں ایک مثبت انداز فکر پیدا کیا ہے۔یقیناً اب یہ ادارہ بفضلہٖ تعالیٰ ایسی شکل اختیار کر گیا ہے کہ اس کے دائم وقائم رہنے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔بہر صورت ابھی بہت سے کام کرنا باقی ہیں جو کہ ادارہ اور ارکان ادارہ کے لیے اہم اور ضروری ہیں مثلاً ادارے کے لیے مستقل جگہ بہ شکل زمین جہاں عمارت تعمیر ہو سکے۔ادارہ کے بچوں کے لیے درسگاہ کا قیام،خواتین اور بچوں کے لیے ووکیشنل سینٹرز کا قیام وغیرہ وغیرہ۔ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے ادارہ کو آپ کا تعاون درکار ہے۔آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اب اپنے اعزہ اور اہل وعیال کو ادارے کی رکنیت سے نوازیں اور جس حد تک ادارے کی خدمت کر سکیں اس میں تساہل نہ برتیں۔اللہ تعالیٰ کے حضور دست بد دعا ہو کہ ہمیں اپنے اعزہ واقارب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

☆☆☆

حسب نسب ۔ اسلام کی روشنی میں

سید ظفر الدین احمد

تمام انسان آدمؑ وحواؑ کی ہی اولاد ہیں۔ سب کا خالق بھی ایک ہی ہے اور سب کی تخلیق بھی مٹی کے ایک جیسے اجزاء سے ہوئی ہے اور سب ایک طرح ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جب انسانی آبادی بڑھتی گئی اور بے شمار خاندان وجود میں آ گئے جو سب ایک ہی علاقہ میں نہ رہ سکتے تھے تو وہ مختلف مما لک اور مختلف موسمی و جغرافیائی ماحول میں جا بسے جس بنا پر نہ ان کی زبان ایک رہ سکی اور نہ معاشرت اور تہذیب۔ موسمی تفاوت سے ان کے رنگوں میں بھی فرق پیدا ہو گیا اور اس طرح سے وہ موجودہ قوموں اور لسانی گروہوں اور رنگوں میں منقسم ہو گئے۔ اس جغرافیائی تبدیلی سے ان میں کسی قسم کی اونچ نیچ یا شرافت اور رذالت پیدا نہیں ہوئی، ان میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے اور نہ چاند کی۔ سب آدم کی اولاد ہونے کے سبب ایک ہی نسل سے ہیں۔

ہمارا مذہب اسلام اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فوقیت نہیں۔ کوئی عرب کسی عجمی (غیر عرب) پر اور کوئی عجمی کسی عرب پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ نہ امیر کو غریب پر کوئی فوقیت ہے نہ حاکم کو محکوم پر۔ نہ طاقت ور کو کمزور پر نہ بوڑھے کو جوان پر۔ انسانیت کے رشتہ سے سب کے برابر حقوق ہیں۔ فضیلت صرف اس کو ہے جو اللہ سے ڈرنے والا برائیوں سے بچنے والا اور نیک عمل کرنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ لِکُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُونَ (الانعام نمبر ٦ آیت نمبر ١٣٢)

ترجمہ: ''ہر شخص کا درجہ اُس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے''

یَـا اَیُّهَـا النَّـاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنَاکُمْ شُعُوبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ اِنَّ اَکْـرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

ترجمہ: ''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے'' (سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

اس بنا پر اسلام انسانیت کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مسلم متقی اور فاسق و فاجر و کافر۔ مکہ میں قریش کے بارہ اسماعیلی قبیلے تھے جو حسب نسب میں سب برابر تھے۔ ہر قبیلہ کے پاس ایک انتظامی شعبہ تھا اور ان میں شہری حکومت کا ایک جمہوری طریقہ رائج تھا۔ بعثت کے وقت ان میں دو قبیلے زیادہ مشہور تھے۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم۔ یہ دونوں قبیلے دو سگے جڑواں بھائیوں ہاشم اور

مغیرہ کی اولاد تھے۔ مغیرہ کے بیٹے امیہ کی شہرت کی وجہ سے یہ قبیلہ بنوامیہ مشہور ہوگیا۔ اس قبیلہ کے پاس قریش کا پرچم تھا۔ جنگ کے موقعہ پر یہ اسی پرچم کو لے کر فوج کی سرداری کرتے تھے۔ تعداد اور دولت کے لحاظ سے بھی یہ دوسرے قبیلوں سے زیادہ بہتر تھے۔ قریش نے امیہ کو اپنا سردار مان لیا تھا۔ بنوہاشم کے سربراہ عبدالمطلب تھے۔ ان کے پاس کعبہ کی تولیت تھی۔ حجاج کو آسانیاں بہم پہنچانا اور ان کے لیے پانی کا انتظام کرنا ان کا انتظامی شعبہ تھا۔ اسی وجہ سے یہ دوسرے قبیلوں کے مقابلہ میں زیادہ محترم تھے۔ ہمارے پیارے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی ہاشم کے پرپوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں سے اولاد ہوئی۔ حضرت زینبؓ کی شادی ابوالعاصؓ اموی سے ہوئی۔ ان سے علیؓ اور امامہؓ پیدا ہوئے جونسب کے لحاظ سے اموی ہیں لیکن ان سے نسل نہ چلی۔ حضرت رقیہؓ حضرت عثمانؓ سے بیاہی گئیں اور ان سے عبداللہ بن عثمان پیدا ہوئے جونسب کے لحاظ سے اموی تھے لیکن شیر خوارگی میں ہی فوت ہو گئے۔ حضرت فاطمہؓ سے حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ حضرت زینبؓ اور ام کلثوم پیدا ہوئے جو سب نسب کے لحاظ سے علوی اور ہاشمی تھے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے ان کی نسل آگے چلی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت (اولاد) میں قاسمؓ عبداللہ اور ابراہیم بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ چار بیٹیوں میں سے تین کے اولاد ہوئی جو اموی اور علوی ہے، محمدی نہیں ہے۔ کلام اللہ میں ''آل'' کا لفظ جگہ جگہ آیا ہے یہ لفظ صلبی اولاد کے لیے کہیں بھی استعمال نہیں ہوا بطور قوم یا امت کے استعمال ہوتا ہے۔ آل فرعون کا مطلب صرف فرعون کی صلبی اولاد ہی نہیں بلکہ وہ تمام مصری رعایا ہے جو فرعون کو خدا کا درجہ دیتی تھی۔ آل یعقوب سے مطلب صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کی صلبی اولاد نہیں بلکہ وہ تمام لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے تھے۔ اسی طرح آل محمد سے مراد صرف آپ کی ذریت (اولاد) ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ مراد ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی اولاد مسلم ہونے کے سبب خود بخود آل محمد میں آجاتی ہے جن کا حضورؐ سے خونی رشتہ بھی ہے۔

نعت میں سید شیر کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں سید سردار کو کہا جاتا ہے۔ عراق میں شیر کی پوجا ہوتی تھی۔ آریائی قوم شیر کو اوتار کا درجہ دیتی تھی۔ انگلینڈ کے جھنڈے پر آج بھی شیر کی شکل موجود ہے۔ ایران میں جب یہ تحریک چلی کہ بنوامیہ کی جگہ حکومت آل حسین کے سپرد کی جائے تو انہوں نے سب سے پہلے حسینی سادات کے لیے سید کا لفظ استعمال کیا۔ عربی بولنے والے ممالک میں سید کا لفظ مسٹر یا جناب کی جگہ ہر کسی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ برصغیر پر مغلوں کے دور حکومت میں یہاں فارسی زبان اور ایران کی ثقافت رائج ہوگئی تو یہاں بھی حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے اولاد کو سید کہا جانے لگا اور ان کی دوسری بیویوں کی اولاد کو علیحدہ کر دیا گیا۔

ایران میں ''مانی'' اور مزدوک کی تعلیم کے زیر اثر یہ اصول مان لیا گیا تھا کہ نسل باپ سے نہیں ماں سے چلتی ہے کیونکہ مانی نے اپنے فلسفہ میں عورت کو ملکی دولت مان لیا تھا کہ ملک کے دوسرے ذرائع کی طرح عورت بھی ملک کے تمام لوگوں کے تصرف کے لیے ہے اور عورت کسی ایک شخص کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ ہر مرد جس عورت سے چاہے تمتع حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لیے ایران میں اولاد کا نسب عورت سے چلنے لگا کیونکہ یہ معلوم نہ ہوسکا تھا کہ بچہ کس مرد سے ہے۔ اسی نظریے کے تحت حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو اولاد

رسول مان لیا گیا۔ متعہ اسی فلسفہ کا نتیجہ ہے جو ایران میں رائج تھا اور عرب میں بھی رائج ہو گیا تھا لیکن عرب میں نسب کو باپ ہی سے مانا جاتا رہا۔ بچہ کی شکل وشبہات سے طے کیا جاتا تھا کہ یہ فلاں کا نہیں فلاں مرد کا بچہ ہے۔ اسی بنا پر ہندو پاک میں یہ خیال عام ہے کہ اگر ایک سید لڑکی کسی غیر سید خاندان میں بیاہ دی جائے تو اس سے جو اولاد ہو گی ماں کی نسبت سے سید ہو گی حالانکہ نسب باپ سے چلتا ہے۔

اگر باپ سید ہے اور ماں غیر سید تو اولاد سید ہی ہو گی۔ ماں کی وجہ سے بچہ کی نسب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم مصری قبطی کنیز حضرت ماریہؓ سے تھے، اس سے ان کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حسینی نسل امام زین العابدینؒ سے چلی جن کی والدہ ایک ایرانی نژاد کنیز تھیں جن کا نام تو کچھ اور تھا۔ بانو کے نام سے مشہور تھیں جو جنگ کے دوران قید ہوئیں اور بطور قیدی مدینہ لائی گئیں۔ حضرت عمر نے انہیں حضرت حسینؓ کو بطور کنیز کے دیدیا تھا۔ ایرانی اسی وجہ سے حسینی سادات کو عرب نہیں بلکہ ایرانی کہتے ہیں کیونکہ وہ بانو کی اولاد ہیں۔

آج پاک ہند میں سادات کو ذریت رسول مان کر ان کا احترام کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بہت سے خاندان جھوٹ موٹ خود کو سید بتلانے لگے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں خونی رشتہ دینی رشتہ کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جنگ بدر میں حضرت علیؓ اپنے سگے بھائی عقیل اور حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے خلاف صف آراء تھے۔ ابولہب حضورؐ کے سگے چچا کی سید بلالؓ کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

☆☆☆

تذکرہ شجرات

سید ظفر الدین احمد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تعلّموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم

(ترجمہ) اپنے نسب سیکھو کہ تم تقاضائے رشتہ داری سے عہدہ برآ ہوسکو (الحدیث)۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے ''**یَاایُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُواo اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْo اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ**

ترجمہ: ''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے'' (سورہ الحجرات آیت نمبر 13)

پس قبیلوں اور ذاتوں کی تقسیم کوئی حتمی چیز نہیں جس میں پنڈت اور شودر کی طرح اونچ نیچ ہو بلکہ یہ تقسیم آپس کی شناخت اور تعارف کے لئے ہے، اسی لئے قبیلے اور خاندان اپنے تشخص کے لئے اپنا اپنا نسب نامہ یاد رکھتے ہیں۔

عرب قبائل اپنے خاندانی نسب ناموں کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے تھے اور خاندانوں کے بزرگوں کے کارنامے فخریہ بیان کرتے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نسب نامہ اکیس پشتوں تک بتایا ہے، جو انکو یاد تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے زمانے کے سب سے بڑے شجرات کے عالم تھے۔ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں جب بیت المال میں شام، عراق اور ایران سے اموال آنے لگے تو انہوں نے آل ہاشم کے وظائف مقرر کردیئے تھے کیونکہ وہ زکوۃ وصدقات نہ لے سکتے تھے، بنوامیہ اور بنوعباس کے دورِ حکومت میں بھی یہ تقسیمِ وظائف کا سلسلہ جاری رہا۔ تقسیم وظائف کا طریقہ یہ تھا کہ ہر خاندان کا بزرگ اپنے خاندان کا نسب نامہ مع عورتوں اور مردوں اور بچوں کے رکھا کرتا تھا جس کے مطابق ان کو مالی امداد دی جاتی تھی اور پھر وہ بزرگ اس مال کو اُن میں تقسیم کردیتا تھا، اس طرح آل ہاشم کے شجرات ریکارڈ پر موجود تھے، بعد میں لوگ خود اپنے خاندانی شجرے اپنے پاس محفوظ کرنے لگے اور یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔

شجر عربی میں درخت کو کہتے ہیں۔ جب کسی خاندان کے افراد کا نسب نامہ ڈائی گرام (Diagram) کی شکل میں تیار کیا جاتا ہے تو وہ ایک شخص سے شروع ہوتا ہے اور پھر اولاد در اولاد پھیلتا چلا جاتا ہے جس طرح درخت شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اسکی شکل درخت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس لئے ایسے ڈائی گرام یعنی نسب نامہ کو ''شجرہ'' کہتے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد گلاؤٹھی کے خاندانوں میں سے کچھ خاندان گلاؤٹھی ہی میں رہ گئے اور ایک بڑی اکثریت مغربی پاکستان ہجرت کرگئی لیکن یہ سب کسی ایک مقام پر یکجا آباد نہ ہوسکے۔ کراچی، حیدرآباد، بہاولپور، لاہور اور راولپنڈی میں بکھر گئے۔ ایک عرصہ کے بعد ان کی اولادیں ایک دوسرے سے ناواقف ہوگئیں، اور اکثر تو اپنے بزرگوں کے ناموں سے بھی ناواقف ہوگئیں۔

میں جب کراچی میں آیا تو ایک عیدملن پارٹی میں محسوس کیا کہ سوائے چند ہم عمر اصحاب کے اکثر سے صورت آشنا نہ تھا، اور وہ بھی مجھ سے واقف نہ تھے۔ اُسی زمانہ میں مجھے مولانا اصلح الحسینی سے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جو گلاؤٹھی کے زیدی واسطی خاندان سے متعلق تھی، لیکن اس میں سادات گردیزی اور دوسرے خاندانوں کا بھی مجمل حال درج تھا۔ اس کے مطالعہ سے مجھے خیال ہوا کہ اگر میں گلاؤٹھی کے سب خاندانوں سے متعلق معلومات جمع کر کے انکے شجرات تیار کرسکوں تو آنے والی نسلیں اپنے خاندانی افراد کی پہچان قائم رکھ سکیں گی۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے امروہہ کے زیدی خاندان کے شجرات کی کتاب بھی ایک دوست سے مل گئی جس سے گلاؤٹھی کے زیدی خاندان کے ابتدائی ناموں کے تقابل سے تصحیح بھی ہوگئی۔

گڈھ مکتیشور کے صدیقی خاندان کا چھپا ہوا شجرہ عبدالمغنی صاحب سے مل گیا جو مسلم اسکول بلندشہر کے منیجر تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ کراچی آ گئے تھے۔ حافظ والوں کے بارے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ گٹھاؤلی کے شاہ محمود مالا مال کی اولاد سے ہیں۔ بھائی قطب الدین سے امام علی رضا کا شاہ محمود مالا مال کا شجرہ مل گیا۔ امام علی الرضا کی اولاد میں شہاب الدین کرمان سے ہندوستان آئے تھے۔ شاہ محمود مالا مال کے بھائی شاہ طیفور کی اولاد میں عبداللہ لقب شاہ ابّن امروہہ منتقل ہوگئے ان کی اولاد امروہہ میں رہی جس کا ذکر سادات زیدی امروہہ کی کتاب میں مذکور ہے لیکن شاہ ابّن سے حافظ حسیب الدین کا شجرہ معلوم نہ تھا جو گلاؤٹھی میں آباد ہوگئے تھے، یہ شجرہ لاہور کے ایک کاتب سے مجھے مل گیا جو شاہ ابّن کی اولاد میں ہیں۔ یہ چھپا ہوا شجرہ بہت خوبصورت مور کی شکل میں تھا۔

مجھے جو بھی معلومات ان شجروں سے ہوئیں وہ ہماری پچھلی تین پشتوں تک تھیں، ان کو موجودہ دور تک مکمل کرنا آسان کام نہ تھا، اور سب خاندان کراچی میں موجود نہ تھے تاہم میں نے گھر گھر جا کر انکے والدین اور اولادوں کے نام جمع کرنے شروع کر دیئے اور اکثر یہ دیکھا کہ دادا سے آگے بہت کم لوگ ناموں سے واقف تھے اور ایک بھائی کو تو اپنے بھائی کے بچوں کے صحیح نام بھی نہ آتے تھے۔ مجھے مکمل کوائف جمع کرنے کے لئے تقریباً چار سال کا عرصہ لگا اور لوگ میرا مذاق اڑانے لگے کہ تمہیں یہ کیا لت لگ گئی ہے اور میرا نام مسٹر شجرہ رکھ دیا اور بالآخر ۱۹۷۴ء میں یہ کام مکمل ہوگیا۔ ان شجروں میں میں نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے نام شامل کر دیئے ہیں۔ اس لئے کہ لڑکوں کی اولاد اپنے والد کے شجرہ میں اور شوہر کے شجرہ میں دونوں جگہ آ گئی ہے، یہ اس لئے کیا ہے کہ اس طرح سے آپس کے رشتہ ظاہر ہوجاتے ہیں حالانکہ شجروں میں لڑکیوں کے نام نہیں دکھائے جاتے جو دوسرے خاندانوں میں چلی جاتی ہیں۔

یہ شجرات چالیس بڑے (A3) صفحات پر مشتمل ہیں انکی کتابت اور طباعت میرے بس کی بات نہیں تھی، بالآخر گرمیوں کی چھٹیوں میں کتابت کا کام خود شروع کر دیا جس میں صفائی اور خوبصورتی اور اچھی لکھائی تو ہو نہ سکی لیکن انکے پروف تیار ہوگئے،

میرے ایک دوست جن کا اپنا پریس ہے انہوں نے رائے دی کہ بجائے چھپوانے کے اس کی جو چند کاپیاں درکار ہوں بلو پرنٹ تیار کرالو، چنانچہ ایک پریس میں جن کے پاس بڑی مشین ہے انہی کی وساطت سے چالیس شجروں کا ایک سیٹ بنا کر سو (۱۰۰) روپیہ میں دینے کے لئے تیار ہوگئے پھر میں نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ کون کون ان کو خریدنا چاہتا ہے۔صرف دس اصحاب نے خریدنے کا وعدہ کیا اور میں نے ایک کاپی اپنے لئے ملا کر کل گیارہ کاپیاں تیار کرائیں اور بعد میں ادارۂ اخوان السادات نے مزید کاپیاں تیار کرائیں اور اپنے ممبران کو اُسی قیمت میں تقسیم کرائیں۔

ان شجرات میں جن خاندانوں کو دکھایا گیا ہے ان میں سے کچھ خاندانوں کی تفصیل یہ ہے:

زیدی واسطی خاندان

حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے پوتے زیدالشہید کی اولاد میں سید ابوالفرح واسطی عراق کے شہر واسط میں آباد ہوگئے تھے انکے پانچ بیٹے تھے جو سرہند اور گڑھ مکتیشور میں آباد ہوئے پھر ابوالفرح کے پوتے ابوالفرح ثانی کے بیٹے سید حسن بلگرام (صوبہ بہار) اور سید عوض کی اولاد بہلول لودھی کے زمانہ میں سرہند کے مختلف شہروں میں آباد ہوگئی۔سید عوض کی اولاد میں سید تبارک یا سید مبارک بابری دور میں گلاؤٹھی آباد ہوئے۔گلاؤٹھی کا زیدی خاندان ان ہی کی اولاد سے ہے۔بعد وہ میں سنّی ہوگئے۔اس خاندان میں مشہور طبیب گذرے ہیں۔

حافظ والا خاندان

امام علی رضا کے بیٹے ابراہیم کی اولاد میں شہاب الدین، کرمان سے آئے تھے اور گلاؤٹھی کے نزدیک گٹھاؤلی میں مقیم ہوگئے، ان کے ایک بیٹے شاہ محمود مالا مال بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں جن کا مزار گٹھاؤلی میں ہے اور مرجع خلائق ہے، ان سے آگے نسل نہ چل سکی۔انکے بھائی طیفور کے پرپوتے عبداللہ لقب شیخ ابّن امروہہ میں آباد ہوئے۔یہ بھی بڑے بزرگ تھے،ان کا مزار بھی مرجع خلائق ہے، ان ہی کی اولاد میں حسیب الدین، گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔انکے بیٹے سراج الدین کے چھ بیٹے تھے جو سب کے سب حافظ تھے۔اسی لئے پورا محلّہ حافظ والا مشہور ہوگیا۔منشی مہربان علی کی تحریک پر جامع مسجد میں دیوبند کے اس دور کے جید علماء جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی مدد سے دینی مدرسہ قائم کیا گیا جو حافظ والوں کے زیر اہتمام اب تک چل رہا ہے۔تقسیم سے قبل حافظ سید شفیع الدین نے گلاؤٹھی میں پہلا اسلامیہ اسکول مفید عام اسکول کے نام سے قائم کیا۔

سادات گردیزی سالاری خاندان

اس خاندان کا تعلق امام موسی کاظم سے ہے انکے مورثِ اعلیٰ موسیٰ رضا گردیز (افغانستان) سے دہلی کے نزدیک بدر پور میں آباد ہوئے۔انکی اولاد میں سے نعیم اللہ گلاؤٹھی میں آباد ہوئے اور انہوں نے اپنے لئے گلاؤٹھی میں سب سے پہلا محل تعمیر کرایا۔انکے

بیٹے رحمت اللہ نے محل کے مقابل سڑک پر مسجد رحمتِ خدا تعمیر کرائی جو محل والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔سیٹھ کا سالاری خاندان اسی کی ایک شاخ ہے۔

ڈاسنہ کا پیرزادگان کا خاندان

یہ خاندان امام تقی کے بیٹے ابوعبداللہ سے ہے جنکی اولاد میں امیر نثارا ڈاسنہ ضلع میرٹھ میں آباد ہوئے،انکے ایک پوتے شاہ محمود مودود ڈاسنہ کے بہت مشہور بزرگ گزرے ہیں۔انکی اولاد میں پیر فضل رضا گلاؤٹھی میں آباد ہوئے جن کا مزار محلّہ پیرزادگان میں ہے۔ امیر نثارا کے دوسرے بیٹے کی اولاد میں جمال الدین (جمال شاہ) بھی بڑے بزرگ گزرے ہیں،انکی اولاد میں سے عماد الدین، گلاؤٹھی میں آباد ہوئے جنکے بیٹے حاجی ریاض الدین تھے۔

تحصیل دار ضامن علی کا خاندان

یہ خاندان امام تقی کے بیٹے علی ثانی کی اولاد سے ہے۔اس خاندان کے غلام علی بلندشہر سے گلاؤٹھی میں آباد ہوئے،محمد کفیل اور محمد عقیل ایڈوکیٹ اسی خاندان سے ہیں۔

بلندشہر کا عباسی خاندان

یہ خاندان محمود غزنوی کے بلندشہر کو فتح کر لینے کے بعد یہیں آباد ہو گیا تھا،اِس کے مورثِ اعلی قاضی غیاث الدین ہیں جو بلندشہر کے پہلے قاضی تھے،انکی اولاد میں سے صاحب علی،گلاؤٹھی میں آباد ہوئے،وہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے جسکی وجہ سے محلّہ کا نام گھوڑے والا پڑ گیا۔اسی خاندان کی دوسری شاخ کے نظیر حسن،گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔امیر حسن اور علی حسن اِسی خاندان سے تھے۔

گڈھ مکتیشور کا صدیقی خاندان

یہ شیخ حسام الدین یمنی کی اولاد سے ہیں،گڈھ مکتیشور میں آباد تھے،ان میں سے تاج الدین،گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔عنایت عظیم، فرحت عظیم،کرم عظیم،حکیم شہاب الدین اور رفیع الدین ان ہی کی اولاد سے ہیں۔

اُلدن کا صدیقی خاندان

ان کے مورثِ اعلی سکندر علی،اُلدن،ضلع میرٹھ میں آباد تھے،انکے بیٹے جعفر علی کپورتھلہ کے مہاراجہ کے طبیب خاص تھے۔لہذا یہ خاندان کپورتھلہ والوں کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔جعفر علی کے ایک بھائی حکیم وجیہہ الدین کے دو بیٹے عزیز الدین اور امتیاز الدین کی شادی منشی مہربان کی دو دختران فاطمہ اور محفوظ سے ہوئیں جنکی اولاد صدیقی ہے۔

رٹول کا شیخوں کا خاندان

ان کے مورثِ اعلی قاضی محمد یوسف تھے جو رٹول ضلع میرٹھ میں آباد تھے۔اس خاندان سے دو بھائی عبدالحکیم اور عبدالقیوم گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔مصباح الاسلام، شمس الاسلام اور یوسف کلّو اُن ہی کی اولاد سے تھے۔

سکندرآباد کا شیخوں کا خاندان

انکے مورثِ اعلی عبدالشکور ہیں جو سکندرآباد میں آباد تھے۔انکے بیٹے عبدالمجید گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔صوفی عبدالوحید، منشی نورالحسن ان ہی کی اولاد سے تھے۔

☆☆☆

زیدی و واسطی خاندانوں کے مورث اعلی سید زید شہیدؒ و سید ابوالفرح واسطیؒ

تحریر و تحقیق: سید محبوب حسن واسطی

گلاؤٹھی وسینٹھ ،الدن، ہاپوڑ و بلندشہر وغیرہ کے واسطی و زیدی سادات کا سلسلہ نسب ان کے مورث اعلی سید ابوالفرح واسطی اور سید زید شہید سے ہوتا ہوا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملتا ہے۔عموماً سلسلہ نسب بیٹے سے چلتا ہے مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ کا نسب بیٹیوں سے چلا۔سید ابوالفرح واسطی تک یہ نسب اس طرح ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ← حضرت فاطمہؓ و حضرت علی کرم اللہ وجہہ ← حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ← حضرت علی بن الحسینؓ (امام زین العابدین)

↓

حضرت زید شہیدؒ ← حضرت عیسی موتم الاشبال ← سید محمد اشرف ← سید علی بزرگ

↓

سید حسین ← سید علی عراقی ← سید حسین ← سید علی

↓

سید زید ← سید عمر محیط ← زید سوم ← سید یحیی

↓

سید حسین ← سید داؤد ← سید ابوالفرح واسطی

سید محمد حسین واسطی (انتقال ۱۲۸۸ھ تقریبا) کے فارسی رسالہ ”تذکرۃ الاقرباء وشجرۃ الاولیاء“ (جو ۱۲۷۴ھ میں اختتام پذیر ہوا) میں تفصیل نمبر ۱۹ تک اسی طرح سے جب کہ محترم ماسٹر سید ظفر الدین احمد صاحب نے اپنے شجرہ نمبر (۹) میں تین مختلف شجرے بیان کیے ہیں۔ایک میں ان واسطوں کا عدد (۱۵)، اور دوسرے میں (۱۷) اور تیسرے شجرے میں (۱۶) ہے اور انہوں نے اپنا ماخذ بھی نہیں بیان کیا ہے۔

سید زید شہیدؒ ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے (سید محمد حسنی واسطی نے سن ولادت ۷۱ھ لکھا ہے مگر محققین کے نزدیک وہ صحیح نہیں) ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی امام محمد باقر سے حاصل کی۔مدینہ منورہ کے دیگر محدثین وفقہاء سے بھی مستفید ہوئے۔قرآن کریم سے بے حد عشق تھا۔مسلسل تیرہ سال تک تنہائی میں تلاوت کی اور قرآنی مضامین میں غور کیا، اسی لئے ”حلیف القرآن“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔اپنے دادا سیدنا امام حسینؓ کی طرح بڑے بلند ہمت، حق گو اور عظیم خطیب

تھے۔لوگ آپ کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہوکر آپ کے خطبے زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔مؤرخین نے آپ کا سراپا اس طرح بیان کیا''گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ملی ہوئی بھنویں، دراز قد وقامت، گھنی داڑھی، کشادہ سینہ، درمیانی ناک اور سیاہ بال۔

آپ کی حق گوئی اموی حکمرانوں کے لئے باعث تشویش بن گئی۔عراق کا گورنر خالد بن عبداللہ آپ کے لئے نرم گوشہ رکھتا تھا۔اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اسے ہٹا کر سخت مزاج یوسف بن عمر وثقفی کو عراق کا گورنر مقرر کر دیا۔یوسف نے حضرت زید کو ستانا شروع کر دیا اور ان پر بعض الزامات عائد کئے جو بعد میں ثابت نہ ہوسکے۔اس نے آپ کو کوفہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔آپ قادسیہ چلے گئے۔کوفہ والوں نے اصرار کے ساتھ آپ کو بلایا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا کہ آپ خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، کوفہ آ کر خلافت کا کام سنبھالیں۔ہم آپ کے لئے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں گے۔بعض مخلص دوستوں داؤد بن علی، مسلمہ بن کہسل اور عبداللہ بن حسن وغیرہ نے آپ کو سمجھایا کہ کوفہ والوں کا اعتبار نہ کریں۔یہ آپ کے دادا حضرت امام حسینؓ کو بھی دھوکہ دے چکے ہیں اور کسی بھی طرح قابل بھروسہ نہیں مگر کوفہ والوں کا اصرار اور یقین دہانیاں بڑھتی رہیں اور تقریباً ۸۰ ہزار افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔گورنر کوفہ نے کوتوال وچوبداروں کی ایک جماعت کو آپ کے اور آپ کے معتقدین کے پیچھے لگا دیا۔محرم ۱۲۲ھ ہجری میں ایک مشعل بردار جلوس کی شکل میں آپ نے جب اعلان انقلاب کیا تو حکومتی فوج سے آپ کے معتقدین کا باقاعدہ مقابلہ شروع ہوگیا۔آپ کے ساتھی نصر بن خزیمہ، محاربہ بن زید، زیاد بن عبدالرحمٰن وغیرہ ۶۷ دیگر افراد کے ساتھ شہید ہوئے اور ان کے سر یوسف بن عمر وثقفی کے سامنے پیش کئے گئے مگر حضرت زید نے ہمت نہ ہاری۔یہاں تک کہ بعد کے ایک معرکہ میں تیروں کی بارش شروع ہوگئی اور ایک تیر حضرت زید کی پیشانی پر لگا اور آپ گھوڑے سے نیچے گر پڑے۔ساتھیوں نے بذریعہ جراحی پیشانی سے تیر نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور ۴۲ سال کی عمر میں آپ نے جام شہادت نوش کیا۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

سید ابوالفرح واسطی پانچویں صدی ہجری کے بہت بڑے بزرگ تھے۔آپ کے والد بزرگوار سید داؤد ظاہری و باطنی کمالات سے متصف ایک باکمال خطیب تھے جن کی تربیت سے سید ابوالفرح واسطی میں شوق جہاد پیدا ہوا۔چنانچہ وہ واسط سے نکلے اور کچھ عرصہ ضلع خراسان میں رہے پھر غزنی تشریف لائے جہاں سلطان محمود غزنوی نے آپ کا استقبال کیا اور اپنی ایک بیٹی آپ کے فرزند سید داؤد کی زوجیت میں دے دی۔غزنی میں آپ سے متعدد کرامات و برکات کا ظہور ہوا اور لوگ آپ کے بے حد معتقد ہوگئے۔سید محمد واسطی کے بیان کے مطابق پھر آپ جہاد کی غرض سے سندھ و پنجاب تشریف لائے اور جہاد میں کامیابی کے بعد کچھ عرصہ موضع دھامری میں مقیم رہے اور پھر اپنے ایک یا دو بیٹوں کے ہمراہ واپس واسط چلے گئے۔(حجاج بن یوسف کے دور میں فوجی

ضرورت کے تحت قائم ہوئے ، یہ شہر کوفہ اور بصرہ کے عین وسط میں ہے،اس لئے یہ شہر واسط کہلایا) واسط ہی میں سید ابوالفرح واسطی کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

سید ابوالفرح واسطی کے باقی صاحبزادگان سید داؤد،سید فصل،سید فضائل وغیرہ اوران کے اولاد تھین پور، خجیر، چھاترود اور گوندنی وغیرہ مختلف مقامات میں پھیل گئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں سادات کرام کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔

ہمارے خاندان کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید سے پانچویں پیڑھی میں اور ابوالفرح واسطی سے ۱۹ویں پیڑھی میں ملتا ہے۔اس لئے ہم میں سے کچھ زیدی اور کچھ واسطی کہلانا پسند کرتے ہیں۔اس طرح اس خاندان میں زیدی، زیدی الواسطی اور واسطی نام کے ساتھ لکھتے ہیں اور سب صحیح ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

جغرافیائی حیثیت اور تاریخ

تاریخ کے چند اوراق

مولانا سید اصلح الحسینی

قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں دینی علوم کی ایک مشہور درس گاہ ''مدرسہ عربیہ منبع العلوم'' کے نام سے قائم ہے۔ اس مدرسہ کی مختصر تاریخ اور اس کے قیام کے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے ہمیں اختصار کے ساتھ اس قصبہ کے بسنے والے سادات اور دوسری برادریوں کے معاشرتی، دینی اور سیاسی حالات کا ایک اجمالی تصور قائم کر لینا چاہیے۔ جیسا کہ عام طور پر بیان کیا جاتا رہا ہے کہ یہ قصبہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں کسی پٹھان جاگیردار گلاب خان نے آباد کیا تھا۔ خود گلاب خان اس قصبہ میں آباد نہیں ہوا بلکہ اپنی برادری کے آٹھ دس خاندان اس نے یہاں آباد کیے تھے اور اس آبادی کا نام ''گلاب ٹھیا'' رکھا۔ ٹھیا، ٹھکانہ، نگر، پورہ یہ وہ الفاظ تھے جو اس زمانے میں کسی بستی کے ناموں کے لئے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی ایک قریبی مثال میرٹھ ہے۔ میرٹھ بھی میر قوم کے کسی ٹھاکر نے آباد کیا تھا جو ''میرٹھیا'' سے میرٹھ بن گیا۔ اسی قوم کی بستیوں کا سلسلہ سینٹرل انڈیا میں آباد تھا جس کا صدر مقام میرواڑ کے نام سے آج بھی دہلی سے احمد آباد جانے والی لائن کا ایک مشہور جنکشن ہے۔

گلاب کا یہ ٹھیا جو شاہی سڑک (Grand Trunk Road) کی مشہور شاہراہ کی ایک شاخ کی گزرگاہ پر واقع تھا جو میرٹھ کو بلند شہر اور خورجہ سے اور غازی آباد کو سکندر آباد اور بلند شہر سے ملاتی ہے۔ کثرتِ استعمال سے یہ گلاوٹھی بن گیا۔ اس بستی کے بارے میں جزءاً تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن زیادہ قوی قرینہ یہ ہے کہ اس کو سادات ہی نے آباد کیا تھا اور ہمایوں کے دور سے پہلے ہی یہ کسی بیوا سیدانی کو مدد معاش کے طور پر جاگیر میں دیا گیا تھا اور اسی زمانہ میں ایک روحانی بزرگ کا نہ صرف یہ کہ قیام رہا تھا بلکہ ان کا مزار آج بھی ''پیر'' کے نام سے مشہور ہے جس کے جنوب میں ان کی اولاد کے مکانات کے آثار آج بھی موجود ہیں اور شاید اس خاندان کے لوگوں میں سے کچھ افراد اب بھی باقی ہوں۔ اسی پیر کے مقبرے سے متصل مشرقی سمت میں پلولیہ خاندان آباد تھا جس میں حاجی فدا علی اور محمد حسین یقین کے ورثاء میں سے کچھ حضرات باقی ہیں جو گلاوٹھی کے بجائے علی گڑھ اور رام پور میں جا بسے ہیں۔ شمال میں سید محمد رفیع بدھن کے بیٹوں، سید کلن اور تمن کی اولاد آباد تھی۔ سید کلن کی اولاد میں شمس الحسن اور تمن کی اولاد میں امیر حسن امیر اور علی حسن کے مکانات تھے۔ شمال مغرب میں سادات کے وہ خاندان آباد تھے جو حافظ والوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ گلاوٹھی کی سب سے قدیم آبادی تھی اور یہیں سے آبادی کی ابتداء ہوئی تھی۔ پٹھان خاندان جو گلاب خان کے آباد کیے ہوئے تھے، اس آبادی کے انتہائی شمال اور پیر کے مقبرے سے جنوب مشرق میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی نہ اس وقت کوئی زمینداری تھی اور نہ ان کی زمینداری آج موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سادات کی ان جاگیروں پر کام کرنے والے کارکن تھے۔ مغلوں کے دور سے کچھ ہی پہلے پٹھانوں کے مختصر دور اقتدار میں گلاب خان نے کچھ پٹھان خاندان آباد کئے اور ان کے

لئے مقبرہ پیر سے جنوب مشرق میں اپنے والد صید یا سیدا خان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد تعمیر کی جو سیدا والی مسجد کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ یہ مسجد سادات کی قدیم مسجد سے جواب جامع مسجد کے نام سے مشہور ہے جنوب میں واقع تھی۔ مغل دورِ حکومت میں سادات پور (گلاؤٹھی) کی یہ بستی اہل علم و روحانیت کا مسکن رہی جس کے آثار آبادی کے مشرق شمال اور جنوب میں شکستہ مقبروں اور کھنڈروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں بھی اس قصبہ کے سادات کو ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ اس بستی سے جنوب کی جانب تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر مالا گڑھ کا قلعہ تھا جو آخری مغل بادشاہوں کے خاندانی سرداروں کا مستقر تھا۔ اور ۱۸۵۷ء میں اس کی سرگرمیوں نے غازی آباد/ سکندر آباد، بلند شہر اور غازی آباد ہاپوڑ بلند شہر کی شاہراہوں کو مشرقی علاقہ سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ گلاؤٹھی کے سادات میں سے فوجی خدمات انجام دینے والے اور دوسرے سربرآوردہ اشخاص نے عملی طور پر حصہ لیا جس کی پاداش میں کچھ لوگوں کو پھانسی کی سزا دی گئی، سادات کے خاندانوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد ان کو نیلام کر دیا گیا تھا۔ اسی ضبطی اور نیلامی کے نتیجہ میں قصبہ میں دو بڑی زمینداریاں وجود میں آئیں جن میں سے ایک بڑے زمیندار گلاؤٹھی کے مشہور رئیس سید منشی مہربان علی صاحب مرحوم تھے اور دوسرے ایک میواتی مقدم فیضیاب خان کے والد جن کا نام غالباً فتح یاب خان تھا۔

۱۸۵۷ء کی اس جدوجہد آزادی میں سادات میں سے ایک شہید سید سرفراز علی پلولیہ خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ دوسرے شہید رحمت اللہ صاحب تھے جن کو تسلط کے بعد پھانسی دے دی گئی تھی۔ آپ کی بنائی ہوئی ایک مسجد آج بھی محل والی مسجد کے نام سے قصبہ کے مغرب میں واقع ہے۔ آپ کا خاندان سالاری خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرے بزرگ جن کو پھانسی دیے جانے کا حکم ہوا تھا، سید عنایت ابن غلام چشتی مرحوم تھے لیکن شہادتیں نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھانسی سے بچ گئے۔ ان کا خاندان کھرنجہ والوں کے نام سے متعارف ہے۔

گلاؤٹھی کے یہ سادات علم اور روحانیت سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے، جو اس دور کے معززین اور اہل علم کا عام مذاق تھا اور جیسا کہ بزرگوں کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سادات زیدیہ کے یہ گھرانے شیعیت کی طرف مائل تھے تاہم دہلی کے مشہور روحانی سلسلوں کے بزرگ اور مستند علماء نواب قطب الدین خان اور مجددیہ سلسلہ کے شاہ غلام علی کے روحانی خلفاء اور وعلماء کے ساتھ ان کے نہایت قریبی روابط تھے اور انہی بزرگوں کے اثرات سے ان کے عقائد میں اعتدال پیدا ہوا۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کے جہادِ آزادی میں بھی اس قصبہ کے بعض سادات نے حصہ لیا ہے۔ قصبہ کے جنوب میں تقریباً تین میل ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد کے آثار جو دھڑلہ شاہ کی مسجد کے نام سے مشہور تھی اور جس میں سید احمد شہیدؒ نے قیام فرمایا تھا۔ اس جہاد کی یادگار باقی تھے۔

۱۸۳۰۔۱۸۳۲ء کے بعد ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں تھانہ بھون کے مشہور روحانی بزرگ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے عملی طور پر حصہ لیا تھا اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے تھے۔ ان کے خلفاء میں سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد

قاسم نانوتویؒ جیسے علماء اور روحانی بزرگوں کے اس قصبہ کے سادات سے قریبی روابط تھے۔ان بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد کی ناکامی کے بعد اس روح کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے تعلیم وتبلیغ کا ایک پروگرام بنایا۔دارالعلوم دیوبند کا قیام اسی روح جہاد کو قائم رکھنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔اسی پروگرام کے مطابق میرٹھ اور بلندشہر کے قصبات میں عربی مدارس کا ایک جال بچھا دیا گیا۔قیام دارالعلوم کے دوسال بعد گلاؤٹھی میں یہاں کے لوگوں کے تعاون سے مدرسہ عربیہ منبع العلوم کا قیام عمل میں آیا۔اس سلسلہ میں پلولیہ سادات کے ایک بزرگ سید ولایت علی اور سادات کھرنجہ کے بزرگ سید عنایت اوران کے صاحبزادے صوفی محمد حسن نقشبندی کے علاوہ قصبہ کے رئیسوں میں سے جناب منشی سید مہربان علی صاحب مرحوم نے ان کوششوں میں غیر معمولی تعاون کیا۔سادات پلولیہ کے محلّہ سے متصل ایک قدیم قبرستان کی چھوٹی سی مسجد کو منشی جی مرحوم نے ازسرِنو تعمیر کیا اوراسی سے متصل ایک وسیع رقبہ پر مدرسہ منبع العلوم کی تعمیرات قائم کیں۔اس پرانی مسجد سے متصل بعض شہداء کے مزارات تھے جن کے متعلق قصبہ کے قدیم بزرگوں سے متواتر روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ شہداء سید سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے جو اس راہ سے جہاد کرتے ہوئے یوپی کے مشرقی اضلاع میں بہرائچ تک پہنچے تھے اور وہاں معرکۂ جہاد میں شہید ہوگئے۔شہداء کے یہ مزارات آج بھی مدرسہ اور جامع مسجد کے احاطہ میں واقع ہیں۔اس مدرسہ کے اولین مہتمم حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مشہور خلیفہ حضرت شاہ غلام علی کے نقش بندی خاندان کے ایک مشہور صاحب طریقت بزرگ صوفی محمد حسن تھے جنہوں نے مدرسہ میں تدریسی خدمات بھی بلا معاوضہ انجام دیں۔ مدرسہ عربیہ منبع العلوم کے قیام کے بعد اس کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد پیر جی عبداللہ تھے اور مولانا قاسم کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحب نے اسی مدرسہ سے اپنی تعلیم کی ابتدا کی تھی اور صوفی محمد حسن صاحب سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

پیر جی عبداللہ صاحب ان کے صاحبزادے محمد میاں منصور جو بعد میں ریشمی رومال کی سازش کے انکشاف کے نتیجہ میں کابل ہجرت کر گئے تھے اور مولانا محمد قاسم کے صاحبزادے حافظ محمد احمد، منشی مہربان علی کے مکان پر جو محل کہلاتا تھا قیام پذیر رہے۔ مدرسہ منبع العلوم کے قیام کے سلسلہ میں جن بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا ان میں خاندان پلولیہ کے جدِاعلی، حاجی فدا علی، ان کے صاحبزادے محمد حسین یقینؔ، خاندان متولیان کے بزرگ حیات اللہ اور قاضی فیض اللہ وغیرہ شامل تھے۔

قیام پاکستان کی تحریک کے سلسلہ میں بھی اس قصبہ کے سادات میں سے بہت سے بزرگوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ،جن میں حافظ سید شفیع الدین مرحوم مقامی مسلم لیگ کے صدر اور منشی مہربان علی کے نواسہ سید ممتاز الدین مولوی فضل الرحمٰن ایڈوکیٹ اور مولوی کفیل احمد ایڈوکیٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غرض سادات پور (گلاؤٹھی) کے سادات میں سے برصغیر پاک وہند کی علمی ،ادبی وروحانی تحریکات میں بہت سے بزرگ پچھلی صدیوں سے نمایاں خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور ہر دور میں امتیاز واعتراف حاصل کرتے رہے ہیں۔پاکستان میں ان کے متوسلین اور منتسبین کا اچھا خاصا حلقہ ہے۔امید اور آرزو ہے کہ ان حلقوں میں یہ ذوق علم وادب قائم رہے۔

☆☆☆

قصبہ گلاؤٹھی

سید ظفر الدین احمد

دہلی کے مشرق میں تقریبا ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہاپوڑ خورجہ ریلوے لائن پر یہ ایک قصبہ ہے۔ تقسیم کے وقت اس کی آبادی ۱۶/ ہزار کے قریب تھی جس میں ہنود اور مسلمان کی تعداد برابر برابر تھی لیکن اثر کے لحاظ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا۔

اس قصبہ میں پٹھان آباد تھے۔اس میں نیچ ذات کے ہندوؤں کو بھی خدمت کے لئے بسا لیا تھا اور کچھ بنیوں کو بھی تا کہ ضرورت کی اشیاء مل سکیں، رفتہ رفتہ یہاں سید آباد ہوتے رہے حتیٰ کہ یہ قصبہ پٹھانوں کے بجائے سیدوں کی آبادی بن گیا اور انہوں نے اس کا نام ''سادات پور'' رکھ دیا لیکن یہ نام نہ چل سکا۔

سادات زیادہ تر زمیندار تھے یا ملازم پیشہ اگر چہ ملازمت پر سب لوگ باہر رہتے تھے لیکن ان کے قصبہ کے ساکنین سے تعلقات کبھی منقطع نہیں ہوئے۔سب خاندان رشتہ داریوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ تھے اور خاندانوں کی کوئی منفرد ہستی نہ تھی، اس قصبہ کو شیر شاہ سوری کے زمانہ میں اس کی فوج کے ایک سردار گلاب خان افغان نے بادشاہ کی شکارگاہ کے کیمپ کے طور پر آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر ''گلاب بستی'' رکھا جو بعد میں بگڑ کر ''گلاؤٹھی'' بن گیا۔

گلاب خان نے یہ بستی فتح کی یادگار کے طور اسی جگہ آباد کی تھی جہاں سید سالار مسعود غازی کو راجہ برن (بلند شہر) کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی تھی۔انہوں نے اس مقام پر راجہ برن سنگھ سے جہاد کیا تھا، جہاں اب جامع مسجد ہے اس کے قرب وجوار میں گنج شہیداں ہے۔اس کی یاد میں پندرہ صدی کے ابتدائی عشروں تک جامع مسجد کے مشرق میں ایک میلہ لگتا تھا جو چھڑیوں کا میلہ کہلاتا تھا اور اس میلے میں اسی مقام پر ایک جھنڈا نصب کیا جاتا تھا، جہاں روایتی طور پر سید سالار مسعود غازی نے اپنا جھنڈا فتح کے بعد نصب کیا تھا۔

پھر جاگیرداری کی شاہی بخششوں کے نتیجہ میں سادات کے گھر آباد ہوئے۔ہمایوں کے دور میں یہ علاقہ سید محمد رفیع (سید بدھن) کو جاگیر کے طور پر ملا اور اسی وجہ سے سادات کی زیادہ تر آبادی ان ہی پر مشتمل تھی اور دوسرے سادات خاندان بعد میں آباد ہوئے۔اس عہد کے قاضی شمس الدین نے اس علاقہ کو پرگنہ ڈاسنہ اور مضافات سہارنپور لکھا ہے، جو دوآبہ کی آبادی کا ایک ضلع تھا۔

قصبہ کی سب سے قدیم مسجد قصبہ کے شمال میں ایک تالاب (لال ڈگی) کے کنارے واقع ہے جو اسی علاقہ میں ہے جہاں پہلی پٹھان آبادی تھی۔اس مسجد کی کئی مرتبہ مرمت ہوئی ہے۔آخری مرتبہ ۱۲۷۰ھ میں سید محمد بدھن کی اولاد سید عنایت علی نے اس کو پختہ کرایا۔یہ مسجد پلکھن والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

دوسری مسجد محل والی مسجد کے نام سے مشہور ہے جو چھوٹی سی مسجد ہے اور قصبہ کے مغرب میں بڑے محل کے مقابل واقع ہے۔اس مسجد کو قطب الدین ایبک کے زمانہ میں سالاری خاندان کے مرشد اعلی حافظ رحمت اللہ نے پختہ کرایا جس پر سن تعمیر کا کتبہ ۱۲۵۳ھ کا لگا ہوا ہے۔نعیم اللہ پہلے شخص ہیں جو گلاؤٹھی میں آباد ہوئے۔

قصبہ کی سب سے بڑی مسجد جامع مسجد ہے جو اسی جگہ واقع ہے جہاں قدیم روایات کے مطابق سید سالار مسعود غازی کی راجہ برن کی فوجوں سے جنگ ہوئی تھی (محمود غزنوی کے زمانے میں) پرانی قبریں مسجد کے احاطہ میں ہیں اور مسجد کے دروازے پر سڑک کے مقابل جہاں گنج شہیداں ہے، اب مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔اس مسجد کی ترمیم اور مرمت محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں ۱۲۶۷ھ میں ہوئی اس کے بعد ۱۲۹۰ھ میں منشی مہربان علی نے ازسرنو اس کو پختہ کرایا جس کی تاریخ ''قبلہ ثانی لا ثانی'' ہے یعنی ۱۲۹۰ھ۔

اب تقسیم کے بعد سادات خاندان عموماً پاکستان منتقل ہو گئے ہیں اور ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہو گئی ہے۔گلاؤٹھی گندم اور گڑ کی منڈی کے لئے مشہور ہے۔اس میں دو اسکول ہیں، ایک ہندوؤں کا اور ایک مسلمانوں کا۔مسلمانوں کا ہائی اسکول مفید عام ہائی اسکول کہلاتا ہے، یہ اسکول حافظ سید شفیع الدین صاحب نے قائم کیا تھا اور ہندوؤں کا ہائی اسکول کالج ہو چکا ہے۔مسلمانوں کی سب جائیدادیں اور جاگیریں غدر کے بعد انگریزوں نے ضبط کرلیں۔سوائے منشی مہربان علی کے جو جودھ پور میں منشی تھے۔انہوں نے اپنا محل بنوایا۔جامع مسجد کی ازسرنو تعمیر کی اور کالی ندی کا پُل بنوایا، وہ رئیس گلاؤٹھی کہلاتے تھے۔

آیجنٹی انگریزی کا لفظ ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں انگریز ایجنٹ رہتا تھا، اب وہاں بسوں کا اڈا ہے۔

جامع مسجد گلاؤٹھی

اب سے ۱۵۰ سال پیشتر یعنی ۱۲۶۷ھ میں جب سادات گلاؤٹھی نے جامع مسجد کی تعمیر نو، اسکی توسیع وتزئین وآرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح اپنے ایمانی جذبہ کا ثبوت دیا تو سید محمد حسینی واسطی نے متاثر ہو کر کہا یہ قطعہ تاریخ کہا۔فارسی اشعار اور ان کا اردو ترجمہ دونوں پیش خدمت ہیں۔

چہ سرائیم وصف ایں مسجد کہ دگر مسجد قبا آمد

وجہ مسجد بود کہ ہر خشتش بمحک زر اتقا آمد

کعبۂ حاجتِ خلائق ہست قبلۂ مقصد و دعا آمد

مسجد و صحن و چاہ شیرینش بطہور و بصد صفا آمد

نیست معلوم حال ایں مسجد کر بہ عصر کہ پادشا آمد

لیک پیش سکونت سادات ایں رفیع البنا بپا آمد

کہنہ گردید گنبد و سقفش شق بدیوار جابجا آمد

دل سادات را بہ ترمیمش حسن توفیق رہنما آمد
صرف کردند ابیض و احمر ہمہ را پیش حق جزا آمد
شکر للہ کہ بہتر از سابق طرح ایں خانہ خدا آمد
بہر تاریخ اوز عالم قدس
یافت تعمیر نو ندا آمد (۱۲۶۷ھ)

ترجمہ:

(میں اس مسجد کے کیا وصف بیان کروں۔ یہ گویا دوسری ''مسجد قبا'' ثابت ہوئی ہے۔ یہ کیا عجیب پاکیزہ مسجد ہے جس کی ہر اینٹ تقویٰ کے سونے کی کسوٹی پر رکھی ہوئی ہے۔ یہ مسجد مخلوق کے لئے کعبہ حاجت اور مقصد ودعا کا قبلہ ہے۔ کہ یہاں مخلوق حاجت روائی کے لئے بھی آتی ہے اور دعا ومقاصد کی کامیابی کے لئے بھی یہ ''مسجد'' اس کا صحن اور میٹھا کنواں بصد صفاو پاکیزگی قلب تعمیر ہوئے ہیں۔ اس مسجد کے بارے میں پوری طرح تو معلوم نہیں کہ کس بادشاہ کے دور میں پہلی بار تعمیر ہوئی لیکن اتنی بات ضرور معلوم ہے کہ یہاں سادات کی آمد سے قبل تعمیر کردی گئی تھی۔ اس مسجد کا گنبد اور اس کی چھت پرانی ہوگئی تھی اور اس کی دیواروں میں جا بجا دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اس مسجد کی تعمیر میں ترمیم وتبدیلی کے لئے سادات کرام کے دل میں خیال پیدا ہوا اور انہیں اس کی حسن توفیق نصیب ہوئی۔ انہوں نے اس کام کے لئے اس میں سفید (چاندی) وسرخ (سونا) صرف کیا اور سب کو اللہ کے یہاں اس کی جزاء ملی ۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ مسجد پہلے کے مقابلے میں اب بہتر طور پر تعمیر ہوگئی ہے۔ عالم قدس کی جانب سے اس کی تاریخ تعمیر کے لئے ندا آئی) ''یافت تعمیر نو'' (۱۲۶۷ھ) کہ اس مسجد نے نئی تعمیر پائی۔

فارسی اشعار: سید محمد حسینی واسطی

ترجمہ: سید محبوب حسن واسطی

☆☆☆

گلاؤٹھی کا موجودہ منظر نامہ

ندیم ماہر

یوں تو پچھلے صفحات میں گلاؤٹھی کی تاریخ اور وہاں کے ماضی کے بارے بہت کچھ آپ نے ملاحظہ فرمایا لیکن ایک بہت بڑی تعداد اہل قصبہ کی وہ ہے جو یہاں سے باہر بلکہ ہندوستان سے باہر آباد ہے۔ لہذا ان لوگوں کی دلچسپی اور معلومات کے لئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ قصبہ کی موجودہ صورتحال پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ ہوسکتا ہے اس مضمون کی زبان کہیں کہیں تلخ محسوس ہو لیکن شیرینی بھی کم نہیں، الغرض یہ مضمون نہیں بلکہ احساسات ہیں، جن کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

اِس وقت گلاؤٹھی کی آبادی تقریباً اسّی ہزار افراد پر مشتمل ہے جس میں ہندو اور مسلمان تقریباً برابر تعداد میں ہیں۔ یہاں کی آب وہوا دسمبر، جنوری، فروری، نصف مارچ سردی اور اپریل، مئی، جون، جولائی گرم جبکہ اگست، ستمبر میں برسات ہوتی ہے نیز اکتوبر اور نومبر میں خوب صورت موسم ہوتا ہے۔

یہاں کی بیشتر آبادی یا تو زراعت کرتی ہے، یا پھر یومیہ مزدوری اور اب نئی نسل تقریباً نوکری پیشہ ہے حالانکہ ایک بڑی تعداد چھوٹے پیمانے پر تجارت بھی کرتی ہے لیکن تاجرین میں بیشتر غیر مسلم حضرات ہیں۔ قصبہ میں اس وقت بیس مسجدیں ہیں۔ تین مدرسے ہیں۔ بیس چھوٹے اور بڑے مندر ہیں ایک عدد گرجا گھر ہے۔ یوں تو وقت کے ساتھ ساتھ آپسی بھائی چارہ متاثر ہوا ہے لیکن آج بھی اس قصبہ میں ہندو مسلم اتحاد بڑی حد تک برقرار ہے۔ یہاں پر آبادی تیزی کے ساتھ بڑھی ہے جس کی وجہ آس پاس کے دیہات سے لوگوں کی آمد ہے۔ چنانچہ پچھلے بیس سالوں میں یہاں آٹھ نئے محلے بنے ہیں جو کہ پرانی آبادی سے باہر کی جانب چاروں سمتوں میں بنے ہیں۔

ہفتہ واری منگل بازار لگتا ہے، جہاں ضروریات زندگی کی ہر شے دستیاب ہوتی ہے اور اسی دن یہاں کا مقامی بازار بند رہتا ہے۔ یہ بازار جو دھولانہ بس اسٹینڈ کے موڑ سے شفاخانہ تک اور اکبر پور روڈ اور آگے قبرستان تک چلا جاتا ہے۔ اس ہفتہ واری بازار میں دور دراز سے عوام آتے ہیں اور خرید وفروخت کرتے ہیں۔ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہاں اشیاء عام بازاروں کے مقابلے سستی ملتی ہیں۔

زراعت کی بات کریں تو تمام سبزیاں جن میں آلو، ہری مرچ، ٹماٹر، بند گوبھی، لوکی، کدّو کے علاوہ پھلوں میں آم بے انتہا پیدا ہوتا ہے۔ گندم اور چاول کی فصلیں یہاں آنکھوں کو خیرہ کئے رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں سفیدا (یوکلپٹس) کے کیم شحیم پیڑ اور پاپولر کے درخت (جس سے ماچس بنتی ہے) کے پیڑ یہاں کے مناظر کو ایک دلکش اور قدرتی حسن عطا کرتے ہیں۔

یہاں آج بھی دیوالی کے موقع پر مسلم گھروں میں ہندو حضرات کی طرف سے مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں اور عید کے موقع

پر مسلمان حضرات کے گھروں پر ہندو بھائی آتے ہیں اوران کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔عید کے موقع پر عید گاہ کے باہر ہر سیاسی پارٹی اور پولیس انتظامیہ کی جانب سے کیمپ لگائے جاتے ہیں، جہاں عید کی نماز سے فراغت کے بعد مبارکباد کا سلسلہ چلتا ہے اور بلا لحاظ مذہب وملت سب شیر وشکر ہوجاتے ہیں۔

ناقوس کی صداؤں میں شامل اذان ہے
کتنا حسین ملک یہ ہندوستان ہے

یہاں مدرسہ منبع العلوم (جامع مسجد) میں جب بھی کوئی پروگرام ہوتا ہے تو اس میں پولیس انتظامیہ کے عہدیداران، سیاسی حضرات کی آمد ہوتی ہے، نیز قصبہ کی معزز ہندو شخصیات اس موقع پر اپنی آمد درج کراتی ہیں۔ یہاں ایک بڑا شیومندر بھی ہے جہاں سالانہ میلہ لگتا ہے، جس میں دور ودراز سے معتقدین آتے ہیں اور اپنی مرادیں پاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ بلندشہر روڈ پر واقع ڈی این اسکول کے مقابل یہ مندر کئی سوسال پرانا ہے۔

رہن سہن کی بات کریں تو ٹیکنالوجی کا اثر یہاں کی آب وہوا پر بھی پڑا ہے۔اب یہاں لکڑی کی جگہ گیس سلنڈر نے لے لی ہے، مٹی اور چینی کے برتنوں کا وجود اسٹیل، نان اسٹک اور المنیوم کے برتنوں میں تحلیل ہوگیا ہے۔کبھی دودھ اور اشیائے خوردونوش کو محفوظ کرنے کے لئے استعمال ہونے والا چھیکا اب ہمہ وقت فریج کو تکتا رہتا ہے۔شام کے وقت ہونے والی نکڑ بحثیں (جو کہ گھروں کے آگے لینٹر پر گفتگو ہوتی تھی) دن بھر کے تجربات ومشاہدات، پورے قصبہ کی خبر گیری اور تبصرہ کا وہ ماحول اب ندارد ہے، اب ہر شخص فاضل وقت میں ٹیلی ویژن اور موبائل پر اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اور باخبر محسوس کرتا ہے۔

حالانکہ ابھی بھی یہاں کوئی بہت زیادہ ترقی نہیں ہوئی لیکن دہلی سے قرب کا فائدہ آنے والے چند سالوں میں یقینی طور پر ہوگا کیونکہ دہلی سے ملحقہ نوے کلومیٹر کا علاقہ (NCR) کہلاتا ہے اور گلاؤٹھی اس میں شامل ہے۔لوڈ شیڈنگ یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مقامی طور پر بے روزگاری بھی یہاں ایک ناسور کی طرح ہے۔صنعت کی جانب لوگوں کی توجہ کم ہے، تجارت کے لئے مال نہیں ہے، اور نوکریوں کا حصول ہندوستان جیسے ملک میں جوئے شیر سے کم نہیں۔

یہاں دو پرانے اسکول ہیں، نمبر ایک مفید عام اسکول ہے جو کہ ایک پرانا اسکول ہے اور حافظ شفیع الدین صاحب نے اپنے خلوص سے جس انداز میں سینچا وہ شاذ ونادر دیکھنے میں آتا ہے حالانکہ اس کا بھی حال کچھ بہت اچھا نہیں یا یوں کہئے کہ ہمارے دیگر اداروں کی طرح یہ بھی ہماری سردمہری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے اکابرین کی قربانیوں کا یہ ثمرہ جس کی ہم قدر نہ کرسکے، اور اغیار کے ہاتھ میں دے کر ایسی مست نیند میں مگن ہیں کہ گویا کہ ہم نے کوئی بہت بڑا ملی فریضہ ادا کردیا۔ایک عدد ڈین این انٹر کالج جو کہ اب ڈگری کالج بھی ہے اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے اس کا الحاق ہے اس کالج میں کافی مسلم طلبہ قصبہ اور اردگرد کے زیر تعلیم ہیں لیکن تناسب کے اعتبار سے بہت کم ہیں۔غیر مسلم نوجوانوں کے مقابلے مسلم نوجوانوں میں تعلیم کا ماحول (شاید مالی وسائل کی کمی کی وجہ) بہت کم ہے۔

اگر کمپیوٹر کی بات کی جائے تو دودرجن سے زیادہ کمپیوٹر کورسس کے لئے چھوٹے بڑے انسٹی ٹیوٹ، ٹیوشن سنٹر، انٹرنٹ

کیفے کھل گئے ہیں اور نوجوانوں میں اس جانب تیزی سے رجحان بڑھ رہا ہے۔اب بنک کے آگے لائن بھی کم لگتی ہیں کیونکہ تین عدد ATM مشینوں نے لوگوں کی پریشانیوں کو کم کرنے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔

ایک خاص چیز جو پچھلے چند سالوں میں محسوس کی گئی وہ کاروں (ٹیکسی) کی کثرت ہے،ایک زمانہ تھا جب قصبہ میں دو یا تین ذاتی گاڑیاں (کاریں) ہوتی تھیں مگر اب شخصی کاروں کی تعداد سات سو سے آٹھ سو تک پہنچتی ہے اور بیشتر ٹیکسیوں میں کام آتی ہیں (حیرت اس بات کی ہے کہ کبھی کوئی ٹیکسی خالی نہیں ملتی) سائیکل کی جگہ موٹر سائیکل نے لے لی ہے۔سڑک پر گلّی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلتے بچے نظر نہیں آتے بلکہ ایک کونے میں موبائل کے اردگرد جمگھٹا لگائے فلمی نغمے یا گیمس کھیلتے معاشرے کا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں۔

تہذیب کی بات کی جائے تو وہ اب مفقود ہو چلی ہے،ہمیں یاد ہے کوئی بہت زیادہ پرانی بات نہیں،اگر ہمیں کوئی بڑا بزرگ کسی بھی برادری یا قوم کا ہو نظر آتا تو ہم سلام کرتے اور اپنی مصروفیت روک دیا کرتے تھے،لیکن صد افسوس کہ اب سادات کے بچے بھی اگر آپ کو مل جائیں تو وہ نظر چرا کر نکل جاتے ہیں،سلام تو کجا وہ مذاق اڑانے سے بھی نہیں ہچکچاتے (تنزلی کا یہ بھیانک منظر آپ کو ہر گلی اور ہر چوراہے پر نظر آجائے گا)۔

ادب اور شاعری میں بھی یہ قصبہ اپنی ایک شان رکھتا تھا لیکن اب یہ نشان دھندلاتے جارہے ہیں۔یہاں قاضی نجم الاسلام ابن قاضی محمد اسلام صاحب (مرحوم) جو کہ دہلی میں مقیم ہیں (جو کہ خود بھی شاعر ہیں،اور اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں) ہفتہ میں ایک مرتبہ بروز اتوار گلاؤٹھی آتے ہیں اور مقامی شعراء یہاں جمع ہوتے ہیں جن میں سید غفران راشدؔ ابن مولانا سید احمد میاں، دلکشؔ (گڑھ مکتیشور) ڈاکٹر سراج قریشی (گلاؤٹھی) کے علاوہ اور بھی کئی نام شامل ہوتے ہیں۔ویسے تو ہفتہ میں ایک مرتبہ سید مظہر غیاث ہاشمی ابن سید اطہر ہاشمی جو کہ دہلی میں مقیم ہیں اتوار کے دن آتے ہیں۔یہ حضرات کچھ ادبی گفتگو اور ماحول سازی میں اپنا حصہ پیش کر سہ شنبہ رخت سفر باندھ کر چلے جاتے ہیں۔یوں نشستیں بھی ہوتی ہیں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔پچھلے کئی سالوں میں بڑے مشاعرے بھی ہوئے ہیں،لیکن تعمیری ادب اور تشہیری ادب میں یہاں کوئی حدِ فاصل نظر نہیں آتی۔

گلیاں تو ہمیشہ ہی تنگ رہی تھیں،لیکن اب لوگوں کے دلوں کی طرح یہاں کی سڑکیں بھی تنگ ہوگئیں ہیں،بازار میں ہمارے دیکھتے دیکھتے سڑکیں گلیوں میں اور گلیاں پگڈنڈیوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔غیر قانونی قبضہ اور اپنی دکان اور مکان کی زمین کو ہر شخص نے چند انچ بڑھا کر یہ سوچ لیا ہے کہ اس نے دنیا کی سب سے بڑی دولت پر اپنا حق ثابت کر دیا ہے۔بازار میں رش بہت رہتا ہے کبھی کبھی تو پیدل چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ گردونواح میں دیہات کی کثرت ہے اس بنا پر یہاں دودھ کا کام بے انتہا ہوتا ہے، یوں پچھلے بیس سال سے یہ کام مختلف ڈیریوں پر ہوتا تھا لیکن ان دو عشروں میں آنجہانی چودھری بیدرام کی ایک چھوٹی سی ڈیری تھی جو کہ عیدگاہ کے برابر میں تھی،اب وہ ڈیری ایک بڑے پلانٹ کی شکل اختیار کر چکی ہے،انہی چودھری بیدرام کے بیٹے سریندناگر (ممبر آف پارلیمنٹ) ہیں جو اس پلانٹ کو چلاتے ہیں۔جہاں ملک پاؤڈر،گھی،مکھن الغرض تمام ڈیری پروڈکٹس یہاں تیار کئے جاتے

ہیں، غازی آباد، فرید آباد اور دہلی میں ان کی فیکٹریاں ہیں، اور اب تین سال سے یہ پروڈکٹس (پارس کے نام سے) ایکسپورٹ بھی ہورہے ہیں جو کہ مڈل ایسٹ میں خاص طور پر پسند کئے جارہے ہیں۔ عیدگاہ کے گردونواح کی تمام زمینیں اس پلانٹ میں شامل کی جاچکی ہیں اور پورے یوپی، ہریانہ اور پنجاب سے یہاں دودھ آتا ہے اور یہاں پروڈکٹس تیار کئے جاتے ہیں۔ اس پلانٹ سے اہل قصبہ کو نوکریوں کا فائدہ ضرور ہوا ہے۔

علاوہ ازیں بلند شہر روڈ موضع چڑاوک کے قرب میں بیس سال قبل جندل پائپ اینڈ پولی فلم فیکٹری کھلی تھی مگر شاید اب چند سال سے کچھ مسائل ہیں جو بند ہے لیکن جب تک وہ آپریشن میں تھی گلاؤٹھی اور مضافات کے سینکڑوں عوام کے لئے دو وقت کی روزی روٹی کا ذریعہ تھی۔ اسی کے سامنے بوسی اینڈ ہاکس (غالباً جرمن کمپنی ہے) جو میوزیکل انسٹرومنٹس بناتی ہے۔ اس کے مالک میرٹھ کے مشہور تاجر آلہ جات موسیقی (بینڈ باجہ) کے حوالہ سے جانی پہچانی شخصیت جناب نادر علی کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی صنعتوں کا بڑا بول بالا ہے جس میں کپڑوں پر زری کا کام ہے جس کا مرکز سکندر آباد ہے۔ یہاں سے روزانہ ایجنٹ حضرات کچا مال لاتے ہیں اور خواتین گھروں میں کڑھائی کرتی ہیں اور اگلے دن وہ ایجنٹ تیار مال لے جاتے اور نیا مال دے جاتے ہیں، اس پر ملنے والی اجرت یومیہ فی شخص دوسو روپے سے شروع ہوکر چار سو روپے تک ملتی ہے۔

دوآبہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی زمین زرخیز ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں لکڑی بے انتہا ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لکڑی ایندھن کے کام آتی تھی لیکن اب متبادل ہونے کی وجہ سے ایندھن تو نہیں بلکہ اب بلڈنگ میٹریل اور تزئین و آرائش کے سامان میں اس کا شمار ہونے لگا ہے، اور خاصا مہنگا لکڑی کا سامان ملتا ہے، سید پور اور سیانہ روڈ پر بے شمار لکڑی کی ٹال ہیں جہاں پر لکڑی بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ اس میں اچھے خاصے مسلمان تاجر ہیں اور تجارت بھی خوب چلتی ہے۔

گلاؤٹھی کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ یہ ایک مرکز تجارت (Business hub) بن گیا ہے، آس پاس کے دیہات جغرافیائی اعتبار سے کچھ ایسے ملے ہوئے ہیں کہ انہیں ہر کام کے لئے گلاؤٹھی آنا زیادہ آسان رہتا ہے حالانکہ ہاپوڑ، بلند شہر، سیانہ جیسے قصبات اور شہر موجود ہیں۔ چنانچہ یہاں اناج منڈی جو تین عشرے بیشتر قلب قصبہ میں واقع تھی جہاں علاقہ میں گیہوں کا سب سے بڑا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اب وہ اسٹیشن کے قریب سرکاری زمین پر بنائی گئی ہے جہاں بڑے بڑے اسٹورز اور مخازن بنائے گئے ہیں جہاں گیہوں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ کسان گیہوں لے کر آتے ہیں اور گورنمنٹ کی جانب سے یہاں اسٹال قائم کئے جاتے ہیں اور گیہوں خرید کر ذخیرہ کیا جاتا ہے اور راشن کی صورت میں عوام کو بازار کی قیمت سے کم پر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی منڈی ہے جس نے گلاؤٹھی کی ترقی میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہے۔

یہاں چونکہ سادات کی آبادی تھی جو کہ زمیندار تھے یا دین دار (علماء) تھے، لہذا یہاں دینی اور دنیاوی دبدبہ قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کچھ آثار باقی ہیں۔ اگر ہم یہاں کے مکانات کی بات کریں تو اس چھوٹے سے قصبہ میں بہت سارے ایسے مکانات (محل) مل جائیں گے جو اپنے ماضی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

آثار کہہ رہے ہیں ، عمارت قدیم ہے

اگر ہم آبادی میں دھولا نہ اڈے سے داخل ہوتے ہیں تو شفاخانہ کے راستے آبادی میں داخل ہوتے ہیں (گو کہ اب آبادی تو دھولا نہ اڈے سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے) تو سب سے پہلے شفاخانہ کو دیکھ کر پہلا تاثر ذہن میں آتا ہے، یہ وہ جگہ ہے جس کو منشی سید مہربان علی صاحبؒ نے رفاہِ عام کے لئے قائم کیا تھا، یہ ایک پولی کلینک تھی جس میں اطباء بیٹھا کرتے تھے اور غرباء کا علاج مفت میں کیا جاتا تھا۔ شفاخانہ کا دروازہ اُس دور کے پرشکوہ ہونے کا احساس کراتا ہے، نہ معلوم کتنے نشیب وفراز دیکھے ہوں گے، اس نے یہاں بیماروں کو دیکھا ہوگا، مسیحاؤں کو دیکھا ہوگا، اس نے نہ معلوم سسکتے مریضوں کی آخری ہچکی اور اکھڑتی سانسیں سنی ہونگی، نہ معلوم کتنے ڈبڈبائی آنکھیں، کتنی پُر امید نگاہوں کو اس نے خاموش تکا ہوگا۔ آج اپنے بانیوں کے اخلاص اور للّٰہیت کا اعلان کرتا ہوا اپنی ڈوبتی آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔

چند قدموں کی دوری پر سید حکیم اللہ صاحب کا محل آتا ہے (جو کہ تقسیم ہند کے بعد پنجابی محل کے نام سے موسوم ہوا اور ابھی دو سال قبل منہدم کر دیا گیا) اس کے مقابل مسجد ہے جو محل والی مسجد کے نام سے موسوم ہے جس کی امامت ہمارے ہوش میں حافظ ابراہیم صاحب (جو کہ نابینا تھے) فرمایا کرتے تھے۔ اللہ نے بلا کا حافظہ دیا تھا۔ احادیث اور مسائل ان کو صفحہ نمبر اور سطر نمبر سے یاد تھے۔ روزانہ صبح بعد نماز فجر ہمارے گھر دادا محترم مولانا سید حمید الدین صاحب کے پاس آتے اور دوباری (گھر میں داخل ہونے سے پہلے جو ایک کمرہ نما یا مجلس بنائی جاتی تھی) میں آکر بیٹھ جاتے اور فقہ اور حدیث کی کتابیں پڑھتے اور علمی تشنگی بجھاتے تھے۔

اسی کے برابر میں سید بشارت اللہ صاحب اور اس سے آگے بڑھ جائیں تو حافظ سید شفیع الدین کا مکان ہوا کرتا تھا۔ آج بھی ان در ودیواروں کو لگتا ہے کہ کہیں بیت کی کھٹ کھٹ کی آواز آئے گی اور نفیس و نستعلیق حافظ شفیع الدین ان گلیوں کو اپنے خلوص سے معطر کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔ اس کے بعد بالترتیب داروغہ سید حکیم اللہ کا اور سید صدیق علی کے مکان تھے۔

انہی گلیوں سے گزرتے ہوئے قاضی سید حبیب اللہ صاحب کے مکان سے گزر ہوتا ہے۔ یہاں سے چلیں تو قاضی سید سمیع اللہ صاحب کا گھر آتا ہے۔ یہاں قاضی عبد القدوس صاحب کا گھر بھی ہے، اپنے زمانے کے بڑے زمیندار (سنا ہے ان کے پاس اُس زمانہ میں فیئٹ کار ہوا کرتی تھی جبکہ قصبہ میں چند گاڑیاں تھیں) تھے، وضعداری اور دبدبہ ان لوگوں کو وراثت میں ملا تھا، ان کے وسیع وعریض گھر ان کے توسع قلبی کا پتہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہیں ڈپٹی احمد علی صاحب کا محل ہے، اسی کے مقابل مردانہ ہے، یہ دونوں عمارتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس لئے اہم ہیں کہ اس کے مکین اپنے دور میں قصبہ کی اہم شخصیات میں شامل تھے۔ تعمیری فن کی بات کی جائے تو اس کا دروازہ عہد رفتہ کی یاد دلاتا ہے، داخلی دروازوں پر بنے کنگورے اس محل میں بسنے والوں کی طبیعت کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کی فضا میں ایک عجیب سی خاموشی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں کا ہر منظر اپنے مکینوں کے احترام میں (جو کہ یہاں سے کب کے جا چکے ہیں) ابھی تک ان کی آہٹوں کا منتظر ہے کہ نہ معلوم کب کہاں سے اچھے میاں آجائیں، نہ معلوم کب محمد علی خسرو صاحب (جج صاحب) آجائیں اور شام کی چائے کا مطالبہ کردیں۔ اچھے میاں کی صدائیں گلی میں گونجتی محسوس ہوتی ہیں، لگتا ہے کہ پلکھن والی مسجد سے نماز پڑھ کر واپس آرہے ہیں اور گلی میں کھیلتے بچوں کو ڈانٹ رہے ہیں۔

جب اس گلی سے باہر آتے ہیں تو محلّہ حافظان شروع ہوجاتا ہے، یہ وہ محلّہ ہے جو اپنے دور کی نابغہ رُوزگار شخصیات، ورع وتقوی کے پیکر، خلوص وللّٰہیت کے محاسن سے آراستہ لوگوں کا مسکن رہا ہے۔ یہاں مولانا سید حمیدالدین صاحب کا وہ گھر ہے جہاں ایک ہی وقت میں ایک ہی چھت کے نیچے ایک درجن سے زائد علماء، حفاظ اور اللہ والے سکونت پذیر تھے۔ یہ وہ درودیوار تھے جہاں مدرسہ منبع العلوم کو اپنے خون سے سینچنے والی عبقری ہستیاں رہائش پذیر رہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب مدرسہ میں طعام خانہ اور تندور نہیں تھا تو گھر میں صبح فجر کے بعد سے روٹیاں بنتی شروع ہوتی تھیں اور ساڑھے دس بجے جو مدرسہ کی چھٹی کا ٹائم ہوتا تھا اس سے پہلے طلبہ کا کھانا تیار ہوکر چلا جاتا تھا۔ اس گھر کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ قصبہ میں جتنے بزرگوں کی آمد مدرسہ میں ہوئی، ان کے ضیافت کا شرف اس خانوادے کو حاصل رہا۔ ہماری پھوپی جو کہ اوپر کی منزل میں مقیم تھیں، قصبہ کی بیشتر سادات اور غیر سادات کی لڑکیاں ان کی شاگرد تھیں ان کے پاس آنے والی بچیوں کا تانتا صبح سے جو شروع ہوتا، وہ شام تک جاری رہتا، ہمارے چچا تایا سب جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے، ہم سبھی چچا تایا کے بچے پھوپی کے پاس پڑھنے پہنچ جاتے، یہاں قرآن کی تعلیم کے علاوہ بہشتی زیور، تعلیم الاسلام، تختی پر مشق کتابت کرائی جاتی، یوں ہم لوگوں کا پہلا مدرسہ ہمارا گھر تھا۔ ہم نے اپنی دادی کو دیکھا وہ ایک بارعب اور دیندار، شب بیدار خاتون تھیں۔ گھر میں ہم لوگوں کی تعلیم وتربیت سے لے کر شادی بیاہ نیز تمام امور میں پہلی اور آخری رائے انہی کی ہوا کرتی تھی۔ ایک ایک بچے کا انفرادی طور پر خیال اور توجہ انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اللہ نے آپ کو پانچ بیٹوں سے نوازا، جن میں سب عالم تھے اور اخیر عمر تک اپنی والدہ کے تابع اور فرمانبردار رہے۔

اسی کے برابر میں سید ظفرالدین احمد صاحب کا مکان ہے۔ پاکستان ہجرت کے بعد ادارہ اخوان السادات نے بحثیت ادارہ اور سید ظفرالدین احمد صاحب نے انفرادی طور پر جو بڑا کام کیا، وہ ایک تاریخ ہے، یا یوں کہئے کہ مٹی کا ایسا حق ادا کیا ہے جو ان پر واجب تھا۔ خاص طور پر آپ نے شجرات پر جو کام کیا وہ قابل قدر اور قابل صد رشک ہے۔ یہیں سید کرامت اللہ صاحب، سید ناصرالدین، سید عبدالحئی صاحب کے مکانات ہیں۔ آگے چوک میں جناب سید ظہیرالدین صاحب اور سید عبدالرحیم صاحب کے مکانات ہیں۔

اسی گلی کے دوسری جانب قاضی عبدالسلام صاحب کا مکان ہے، یہ محلّہ بجریا کہلاتا ہے (بزریا، غالبا بازار کا مخفف ہے) ڈھلان سے گزرتے ہوئے جب ہم لال ڈگی کی جانب رخ کرتے ہیں تو داروغہ عبدالعلیم صاحب اور شاہ نور صاحب ابن صوفی عبدالوحید کے مکانوں سے گزر ہوتا ہے۔

جب ہم پلکھن والی مسجد سے گزرتے ہیں تو ایک تالاب آتا ہے، جس کو لال ڈگی کہتے تھے۔ اس کی ابتداء تو نہیں معلوم لیکن ہاں اس کو دم توڑتے ہوئے ہم نے اپنی برہنہ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس جگہ ایک پلکھن کا درخت ہوا کرتا تھا جس سے بے شمار بہادری اور توہمات کے روایتی قصے وابستہ ہیں لیکن ہم نے یہاں صرف خلیفہ سید محمد شاہد صاحب کو دیکھا جو اسی احاطہ میں دوسری جانب رہتے تھے اور سارے دن اپنے پالے ہوئے مرغے، مرغیوں، بلیوں اور بکریوں میں اپنا سارا وقت گزارتے تھے۔ ہمہ وقت ان کے پاس لوگ موجود رہتے اور قصبہ کی ہر چھوٹی بڑی خبر ان کے ہاں سننے کو مل جاتی۔ شطرنج، تاش اور دیگر روایتی مجالس کے کھیل

ان کی ضیافت میں شامل رہتے۔لال ڈگی کا کنارہ ان سے آباد تھا، ان کے انتقال کے بعد لال ڈگی ویران ہوتی چلی گئی اور نگر پالیکا کے ساتھ مل کر کچھ لوگوں نے اس کا ہلکے ہلکے بھراؤ کیا اور دیکھتے دیکھتے یہ تاریخی تالاب ایک بستی (کالونی) میں تبدیل ہو گیا جس کو اب مہربان پورہ کہا جاتا ہے۔

سامنے ہی گلی کے نکّڑ پر سید نصر اللہ صاحب کا مکان اور آگے مولوی سید محی الدین صاحب کا مکان اور اس سے ملحق سید محسن علی صاحب کا مکان ہے۔اس سے آگے اگر بڑھیں تو کھرنجہ کے نام سے معروف وہ مکان ہے جو حکیم سید مقصود علی صاحب کا تھا۔اس کے دو دروازے تھے (جس میں ایک اب بند ہے) ایک لال ڈگی کی جانب اور دوسرا قاضی فیاض صاحب کے مکان کے برابر گلی میں کھلتا تھا۔ایک جانب سے تقریباً پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوا جاتا تھا لیکن دوسری جانب کا داخلہ عام گھروں کی طرح تھا۔سید حنیف صاحب کی شخصیت یہاں کی آب وہوا میں آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

لال ڈگی پر سید آل حسن صاحب اور سید صدیق علی صاحب کے مکانات تھے۔(یہیں پہلوان نل کا ذکر سننے میں آتا ہے) جن کے بارے میں معروف ہے کہ وہ بھینس کو کاندھے پر بٹھا کر کھیت میں چرانے لے جاتے تھے اور ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں سے پلکھن کے درخت کو چیر کر اس میں اینٹ پھنسا دی تھی، جو بہت بعد تک اس میں نظر آتی رہی۔

اگر ہم لال ڈگی کی دوسری جانب چلتے ہیں تو دیوان جی سید احمد، دیوان جی افضال اور سید آفتاب صاحب کے گھر ہیں۔یہیں سید عبدالرحیم صاحب کا بھی مکان ہے (جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فارسی زبان کے جید عالم تھے اور وہ لال ڈگی میں سیدھے ہو کر تیرتے تھے (اس انداز میں کہ لیٹے رہتے) اور بلند آواز میں مثنوی مولوی رومی پڑھا کرتے تھے) یہیں مفید عام اسکول کے پرنسپل جناب ماسٹر شوکت صاحب کا بھی مکان ہے۔

آگے جب مڑتے ہیں تو داروغہ جمیل محمد صاحب کا محل آتا ہے (جو اب سید قمر احمد عطار صاحب کے پاس ہے)۔یہیں سید ابرار احمد کا مکان ہوا کرتا تھا جو کہ فوج میں ملازم تھے اور ہر سال محرم کے مہینے میں سبیل لگاتے تھے، زمّن میاں کے نام سے مشہور تھے۔اس سے آگے سید کفایت علی صاحب کا گھر ہے اور یہیں وہ چوک ہے جس کو حکیم سید حامد صاحب کا چوک کہتے تھے۔منشی عبدالرزاق صاحب اور حاجی سید ریاض الدین صاحب کا بھی محل ہے (جو کہ میرے والد نے ۱۹۹۲ء میں خرید لیا تھا) ان گھروں کے دروازے اور اُن پر نقش ونگار اتنے دیدہ زیب ہیں کہ دیکھنے والے آج بھی اس پر رشک کرتے ہیں۔اِن مکانوں سے اِن کے مکینوں کا اندازہ آج بھی لگایا جا سکتا ہے۔

اگر ڈھلان سے اوپر جامع مسجد کا رخ کریں تو سید عبدالرحیم عطار صاحب کا مکان ہے۔یہیں قاضی سید فیاض احمد کا مکان (مردانہ) تھا۔سید فخر الحسن صاحب اور حکیم سید محمد صالح صاحبان کے مکانات اپنی تمام تر قدامت کے باوجود، وضعداری، رعب ودبدبہ کے آج بھی نقیب ہیں۔نواب سید یوسف صاحب اور قاضی فیاض کا مکان بھی اس ترتیب میں آتا ہے۔

آگے سید ظفر احمد صاحب کا محل ہے۔یہیں دوسری جانب نواب عبدالرشید صاحب کا محل ہے۔سید سبحان اللہ صاحب کا مکان ہے۔(پرانا تھانہ) ڈپٹی عبدالواسع صاحب کا مکان ہے۔ڈھلان سے نیچے اتر کر دائیں طرف چلیں تو حکیم سید حامد علی صاحب

کا مکان آتا ہے۔اپنے زمانہ کے مشہور شاعر فصیح اللسان جناب مضطرؔ صاحب کا مکان بھی یہیں ہے۔منشی کلو،اورقاری سید احمد (جو کہ بمبئی منتقل ہوگئے تھے) کا گھر یہیں ہے۔آگے گلی میں محل داروغہ سید عابد علی ہے جو کہ اب منہدم ہو چکا ہے۔منشی مہر الٰہی کا مکان ہے۔سید محمد اطہر ہاشمی صاحب کا گھر ہے۔اخوند جی کا مکان ہے۔آگے محمد یوسف صاحب کا مکان ہے۔دیوان جی سعید احمد اور سید عبدالرحیم صاحبان کے گھر بھی یہیں ہیں۔یہیں سے آگے ہوتے ہوئے ہم منشی مہربان علی صاحب کے محل کی جانب رخ کرتے ہیں۔یہ اپنی نوعیت اور تاریخ کے لحاظ سے منفرد ہے،محلِ وقوع اور تعمیری فن کے لحاظ سے بھی۔اس سے ملحق ایک مسجد ہے اور پائیں باغ ہے۔

یہیں مشہور چوپال ہے جس پر مولانا سید ابوالحسن علی ناطقؔ گلاؤٹھی صاحب کا گھر ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے ناطقؔ صاحب کی شخصیت اور وجاہت ودبدبہ ابھی بھی یہاں کہیں موجود ہے۔یہیں سید ماجد علی اور سید ساجد علی کا گھر ہے۔مضمون میں ان گھروں کا احاطہ موضوع نہیں بلکہ یہ وہ شخصیات ہیں جن کی بدولت قصبہ گلاؤٹھی ایک تاریخ بنا اور دنیا کے نقشہ پر اس بستی کو جانا پہچانا گیا۔

یہاں ایک مکان کا ذکر کرنا ضروری ہوگا جو گلاؤٹھی کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور وہ ہے ''کوٹھی''،فن پارے کے طور پر دیکھیں یا تاریخی پس منظر یا قدامت کے اعتبار سے،یہ عمارت آج بھی اُس تہذیب کے انمٹ نقوش کی غماز ہے جو سادات نے اس بستی اور گردونواح پر ڈالے ہیں۔شارع عام (جی ٹی روڈ) پر واقع جب ہم بلند شہر کی جانب رخ کرتے ہیں تو ہمیں بستی سے باہر (اب تو آبادی یہاں سے بھی آگے تک پھیل گئی ہے) ایک وسیع وعریض دروازہ مخدوش حالت میں نظر آتا ہے،جو زبان حال سے اپنی خستہ حالی پر نوحہ کناں ہے، اس دروازے سے منشی مہربان علی صاحب گزرے،اپنے دور کے جید علماء،صلحاء،صوفیاء،شعراء غرضیکہ عبقری شخصیات کی رہ گزر اور مدخل آج دیکھنے والے پر ایک عجیب سی کسک چھوڑ جاتا ہے۔گوکہ یہ کوٹھی اب تک آباد ہے اور کافی حد تک داخلی اعتبار سے تو جدید طرز میں تبدیل ہوگئی ہے لیکن دروازہ اور راستہ ابھی تک مخدوش حالت میں ہے۔یہ گلیاں آج بھی سادات کی اُس شانِ گم گشتہ پر نوحہ خواں نظر آتی ہیں جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔اِن درودیوار وفرش نے اُن شخصیات کے قدموں کے لمس کو محسوس کیا ان کے وجود کو اس زمین نے چلتے پھرتے دیکھا،ان کی محفلیں دیکھیں،اُن کے قہقہے اُن کا اخلاق،اُن کے معاشرتی اور گھریلو امور دیکھے،ان کی خوشیاں،ان کے غم غرضیکہ زندگی کے ہر نشیب وفراز کے گواہ یہ درودیوار ابھی تک اپنے آپ کو اُس ہجر سے نہیں نکال سکے جس نے ان کو ویران کر دیا۔شاید منورؔ رانا نے ایسی ہی بستیوں کے لئے کہا تھا

حویلیوں کی چھتیں گرگئیں مگر اب تک
مرے بزرگوں کا نقشہ نہیں اُترتا ہے

سادات کے اِن گھروں سے اب مدرسہ جانے والوں کے بجائے رنگ برنگی یونیفارم میں بچے اسکولوں کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔یہاں تہذیب دھندلی ہوتی جا رہی ہے،یہاں اب یہ ماحول زنگ آلود ہو چلا ہے۔

یہ تو سادات کے محلے تھے۔اگر قصبہ میں بسنے والی دیگر برادریوں کی بات کریں تو قصاب (قریشیوں) یہاں تجارت کے اعتبار سے مسلمانوں میں سرفہرست ہیں۔یہ لوگ گوشت کی تجارت کرتے ہیں جو دہلی اور غازی آباد جاتا ہے،جہاں بڑے بڑے

پلانٹ لگے ہیں اور یہی گوشت ایکسپورٹ ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب گوشت مہنگا ہوگیا ہے۔اس کے علاوہ ان لوگوں کا عمل دخل کپڑے کی تجارت میں بھی ہے۔ بازار میں بے شمار دکانیں ہیں جن کے یہ مالک ہیں۔ تیلی برادری (مَلِک) لوگ بھی آسودہ حال ہیں۔ یہ لوگ دہلی، میرٹھ، غازی آباد وغیرہ میں تجارت کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں کا رہن سہن گلاؤٹھی میں ہی ہے۔میواتی برادری کی بات کی جائے تو ان میں نمایاں طور پر مقدم فتحیاب کا خاندان ہے جن کے آثار آج بھی باقی ہیں، ان کے خاندان کے لوگوں کے پاس اب بھی زمینیں ہیں اور یہ لوگ زراعت کا کام اب بھی کرتے ہیں حالانکہ ان لوگوں کی اکثریت آم کی فصلوں پر زیادہ منحصر رہتی ہے، یہ لوگ فصلیں لیتے ہیں اور دہلی سپلائی کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کی اکثریت ٹیکسی کاروں کا کاروبار زیادہ کرتی ہے۔

جھوجہ برادری کی اگر بات کریں تو یہ لوگ بیرون ہند خاص طور مڈل ایسٹ میں رہائش پذیر ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ ہندوستان میں بھی احمد آباد، دہلی اور بمبئی میں مقیم ہیں اور تجارت میں پیش پیش ہیں۔اور بھی برادری ہیں جن میں سیفی (لوہار/ بڑھئی) ہیں یہ لوگ بھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ تجارت میں بھی کافی آگے ہیں۔

مولانا عبدالعزیز صاحب جو کہ ایک صوفی منش آدمی تھے، تقوی اور للّٰہیت میں آپ کا ثانی نہیں تھا، یوں تو آپ نو مسلم تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے اسلام کی روح کو اس انداز میں پیوست کیا کہ آج ایک صدی گزرنے کے بعد بھی آپ کی قبر مرجع خلائق ہے۔آپ کی قبر جی ٹی روڈ پر واقع ہے جو کہ منشی مہربان علی کے مقبرے کے سامنے والے قبرستان میں ہے، اس کو پنج پیراں بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں آپ کی قبر پر سینکڑوں لوگ جن میں غیر مسلم حضرات کی کثرت ہوتی ہے آتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق یہاں سے فیضیاب ہوکر جاتے ہیں۔مولانا عبدالعزیز کی کپڑے کی دکان تھی جو کہ مدرسہ منبع العلوم جامع مسجد کے نیچے صدر دروازے سے متصل تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رات میں چور آئے اور کپڑے کی گٹھریاں باندھ کر جب دوکان سے نکلنے لگے تو اچانک ان چوروں نے محسوس کیا کہ ان کے پیر زمین سے اٹھ نہیں پا رہے، وہ ساری رات اس دوکان میں قید رہے، جب صبح مولانا تشریف لائے تو تب ان چوروں نے آپ سے معافی مانگی اور آئندہ نہ کرنے کی توبہ کی، پھر جا کر وہاں سے ہٹ سکے۔

اگر غیر مسلم برادران کی بات کی جائے تو لالہ سرنامل، لالہ چنّی لال، بشن سنگھ گپتا (چیئرمین نگر پالیکا پریشد) کے نام ہمیں نظر آتے ہیں۔موجودہ نسل میں دیویندرا گروال، جیسے لوگوں کے نام قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں چودھری ہرسروپ مل کے بیٹے جناب ڈی پی گپتا ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گلاؤٹھی ہی میں سکونت اختیار کی حالانکہ وہ کسی بھی بڑے شہر میں رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے قصبہ میں رہائش کو ترجیح دی۔

غرضیکہ یہ بستی آج اپنے ماضی پر نازاں، اپنے حال پر نوحہ خواں اور مستقبل کے لئے جبیں پر تفکرات کی لکیریں لئے ایک خاموش برگد کی مانند ٹھہری ہوئی ہے کہ نہ جانے کب کون آئے اور سب کچھ پہلے جیسا ہی ہوجائے۔

☆☆☆

موضع سینٹہ

سید مسعود علی رضوی

قریب بیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نماز ظہر ادا کرنے کے بعد مسجد و مدرسہ یعقوبیہ متصل سٹی ڈاکخانہ کراچی میں محترم قاری محمد ایوب صاحب مہتمم مدرسہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور انہوں نے مدرسہ کے نائب مدرس مولوی نذیر احمد انصاری صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ قاری محمد ایوب صاحب نے انہیں بالائی منزل پر جانے کی ہدایت فرمائی، جہاں مولوی نذیر احمد انصاری صاحب طالبات کی تعلیم کے ذمہ دار تھے۔ نو وارد اوپر تشریف لے گئے اور میں قاری ایوب صاحب سے مدرسہ کے طلباء اور انکی تعلیمی مصروفیت پر گفتگو کرتا رہا، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مولوی نذیر احمد صاحب، ان صاحب کو لے کر نیچے تشریف لے آئے اور قاری محمد ایوب صاحب سے اُن نو وارد کا تعارف کراتے ہوئے یوں گویا ہوئے کہ ''یہ ہیں جناب لیفٹیننٹ ریٹائرڈ اقبال برنی صاحب، جن کا میں آپ سے غائبانہ تعارف کرا چکا ہوں'' میں مولوی نذیر کے تعارفی الفاظ میں ''برنی'' کا لفظ سن کر ذرا سنبھلا اور ان سے پوچھا کہ آپ کا تعلق بلند شہر سے ہے؟ تو جواب ملا کہ ''ہاں'' میں نے مکرر دریافت کیا کہ کیا خاص بلند شہر سے؟ تو انہوں نے ذرا جھجکتے ہوئے جواب دیا کہ نہیں۔ خاص بلند شہر سے تو نہیں بلکہ ضلع بلند شہر میں ایک گاؤں سے ہے جس کا نام ''سینٹہ'' ہے، ان کا یہ جواب سن کر میں پھر سنبھلا اور مزید دریافت کیا سینٹہ میں آپ کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ تو جواب ملا کہ وہ جناب سید عتیق اللہ مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ یوں بھائی اقبال صاحب سے میرا تعلق قائم ہوا جو آگے چل کر ہمارے اور انکے درمیان ایک نئی رشتہ داری کے سلسلہ کا آغاز بھی ہوا۔

اسی طرح غالباً ۵۶-۱۹۵۵ء اور کی ایک گرمی کے دن کی دوپہر کا ذکر ہے میرے والد مرحوم سوسائٹی میں تقی ہاؤس والی رہائش گاہ کے نیچے گیراج کی طرف سے اوپر ہماری رہائش گاہ پر پانی کی صراحی اور گلاس لینے تشریف لائے اور ایک خاندان کے بزرگ صورت شخص کو دیکھ کر پانی پلانے کے بعد ان سے پوچھ بیٹھے کہ جناب کا سابقہ وطنی تعلق کہاں سے ہے؟ تو جواب ملا کہ یوپی کے ضلع بلند شہر میں سادات کا ایک گاؤں ہے جس کا نام ''سینٹہ'' ہے۔ میرے والد کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی اور مزید معلومات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ صاحب جناب سید حبیب احمد رضوی ہیں، جو ایک عرصہ گزرا کہ سینٹہ کو الوداع کہہ کر جبل پور چلے گئے تھے اور وہیں سے پاکستان کے لئے ہجرت کی۔

اس مختصر دو یادوں کو ضبط تحریر میں لانے کا مقصد تو دراصل موضع سینٹہ کے متعلق یہ بتانا تھا کہ ہم لوگ جو اتفاقاً سرِ راہ مل جاتے ہیں ایک ہی سرزمین کے رہنے والے، ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے سے کوئی تعارف نہیں ہوتا اور پاکستان میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے ہیں مگر اب جب کہ ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے

فعال ہونے کے سبب بہت سے خاندان ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور نوجوان نسل متعارف ہو رہی ہے۔

میں نے سینٹھہ میں ہی شعور کی آنکھ کھولی، یہ زمانہ ۳۰-۱۹۲۹ء کا تھا اور یہ بستی، اس وقت بھی اپنی علمی حیثیت کے آخری دور سے گزر رہی تھی۔ قصبہ گلاؤٹھی سے مشرق کی سمت، تین میل کے فاصلے پر کالی ندی کے کنارے پر یہ بستی آج بھی آباد ہے مگر اسکی وہ علمی حیثیت جو ایک دینی مدرسہ اور ایک پرائمری اسکول کے قائم رہنے کی وجہ سے اس دور میں قائم تھی، اب بالکل ختم ہو چکی ہے اور سادات کے بچے اب متصل ہندوؤں کے گاؤں میں قائم سرکاری اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں۔ اس بستی کی تاریخی حیثیت پر تو کوئی شخص بھی گفتگو نہیں کر سکتا کیونکہ

جو بادہ کش تھے پرانے، وہ سب ہی اٹھ گئے

بھائی حبیب احمد رضوی صاحب جن کا میں نے اوپر ذکر کیا، حیات ہیں۔ انکی عمر ۹۰ سال سے اوپر ہی ہے اور مستقل طور پر صاحبِ فراش ہیں، اب وہ نہ بول سکتے ہیں اور نہ پہنچانتے ہیں، کراچی میں یہ ایسی شخصیت تھے کہ جن سے سینٹھہ کے کچھ تاریخی کوائف معلوم ہو سکتے تھے مگر بوجہ صحت یہ بھی اب چراغِ سحری ہیں کہ بجھا چاہتے ہیں۔

یہ ایک اونچے درجے کے بہترین وکلاء میں سے ہیں اور فاروقی اینڈ کو میں انکم ٹیکس ایڈوائزری سے منسلک رہے۔ شکل وصورت اور قد وقامت کے لحاظ سے بالکل قائداعظم محمد علی جناح کے مثنیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو موضع سینٹھہ اپنی تعلیمی شمع کی لو جلائے ہوئے تھا۔ مسجد جامع میں ایک دینی مدرسہ قائم تھا جس کے استاد مولانا عبداللہ صاحب مرحوم دو وقت بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، مسجد کے خطیب اور امام بھی تھے اور بہترین طبیب بھی تھے۔ علی الصبح مطب کرتے تھے، بستی کے مریضوں کو دیکھنے کے علاوہ گردونواح کے دیہات کے مریضوں کو دیکھنے کے لئے جاتے تھے، نہایت خوش پوش اور خوش خوراک انسان تھے۔ سردیوں کے موسم میں مختلف قسم کے حلوے جات بنا کر رکھتے تھے اور ہر آنے والے کی ضیافت کشادہ دلی سے کرتے تھے، انکے شاگردوں میں سادات برادری کے علاوہ دیگر تمام برادریوں کے افراد بھی حافظ قرآن بن کر نکلے۔ آج بھی ان کے شاگرد سینٹھہ کے گردونواح میں مسلم راجپوتوں کے دیہات میں مسجدوں کی امامت سنبھالے ہوئے ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب کے سینٹھہ سے چلے جانے کے بعد کچھ ہی سالوں تک یہ مدرسہ چلتا رہا اور پھر بند ہو گیا۔

دوسرا تعلیمی ادارہ سرکاری پرائمری اسکول تھا جو چوتھی جماعت تک تعلیمی شمع جلا رہا تھا۔ اس اسکول میں دو مدرس ہوتے تھے، ہیڈ مدرس ہمیشہ مسلمان ہوتے تھے اور دوسرے مدرس ہندو۔ مگر بحیثیت معلم دونوں ہی مدرس بغیر کسی استثناء کے اپنے پیشہ سے متعلق ذمہ داریاں بھرپور ادا کرتے تھے۔ میں نے قرآن پڑھنے کے بعد اسی مدرسہ میں پہلی جماعت سے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۳۴ء میں دہلی منتقل ہوا۔

ان دو تعلیمی درسگاہوں کے علاوہ بھی کئی ایسی خواتین تھیں جو لڑکیوں کو اپنے گھروں میں قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں اور گھریلو کاموں کی تربیت بھی بغیر کسی معاوضے کے بغیر کسی استثناء کے ہر برادری کی بچیوں کو دیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ایک تایا تھے، سید عبدالحمید رضوی جو پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر آئے تو ہم جیسے نالائقوں کو خوشخطی، املاء اور خطوط لکھنے کی تربیت

اپنے گھر پر دیا کرتے تھے، انکی خوش خطی کے کتبے ان کے گھر پر لگے ہوئے دیکھ کر ہی ہمیں خوش خطی کا شوق پیدا ہوا۔

اس کے علاوہ میرے ایک قریبی پھوپی زاد بھائی قاضی عبدالرحمٰن ولد مولوی شرافت اللہ صاحب کے پاس اپنے گھر میں کتابوں کی ایک بہت بڑی الماری تھی جس میں نادر کتب کے قلمی نسخے، فارسی، عربی اور اردو میں لکھے ہوئے محفوظ تھے۔ میں جب گزشتہ سال ایک ماہ کے لئے گیا تھا تو معلوم ہوا کہ یہ کتابوں کی الماری دارالعلوم دیوبند میں پہنچا دی گئی ہے۔

موضع سینٹھ میں تین مسجدیں علی حالہ موجود ہیں مگر اب امام ان مسجدوں میں دوسرے دیہات سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ اس گاؤں کی اکثریت آبادی کے لحاظ سے سادات کی تھی۔ دوسری بڑی برادری مسلم راجپوت تھے، اسی برادری میں مکانوں کی تعمیر کرنے والے اپنے زمانہ کے معروف معمار بھی تھے اور کسان بھی، آج بھی یہ برادری اس موضع میں آباد ہے اور شاید اب یہ سادات کے برابر ہی آبادی ہوگئی ہوگی۔

موضع سینٹھ میں یوں تو تین قبرستان ہیں مگر سب سے بڑا قبرستان سادات کا ہے، جس میں پختہ مقبرے اور قبریں اپنے تاریخی پس منظر کو اپنی زبانِ بے زبانی سے بیان کر رہی ہیں۔ اسی بڑے قبرستان میں بستی سے نزدیک ترین جگہ پر ایک بہت بڑا احاطہ ہے جس میں دادے پیر پنج شہداء کا مزار ہے، یہ کون بزرگ تھے؟ اسکی نشاندہی شاید ان کتابوں کے اوراق میں مل جائے جو اب دارالعلوم دیوبند میں موجود ہیں۔ نام ہم نے یہی سنا اور ہر سال قوالوں کی کئی پارٹیاں ان کے سالانہ عرس پر آیا کرتی تھیں، انکے عرس میں ہندو اور مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے اور ہر جمعرات کو سینٹھ کی شیخ برادری کے لوگ نقارہ بجا کر فاتحہ خوانی کرتے تھے۔

ہمارے اس گاؤں میں تعزیہ داری بھی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ ہر سال محرم مہینہ کا پہلا عشرہ یہاں کی معاشرتی زندگی کے لئے بے حد اہم ہوتا تھا، ایک تعزیہ سادات کی طرف سے اور دوسرا مسلم راجپوت برادری کی طرف نکالا جاتا تھا۔ اکھاڑہ بھی دونوں میں کھیلا جاتا تھا، اکھاڑہ کا زیادہ سامان یعنی تلواریں، لگ کے، بلّم، لاٹھیاں یہ سب ہمارے بھائی قاضی سید عبدالرحمٰن صاحب کی تحویل ہی میں رہتا تھا۔

اور وہ اس فن کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ محرم کے دسویں دن تعزیوں کا جلوس اکھاڑے کے فن سے واقف افراد کے ساتھ پورے گاؤں کا چکر لگاتا تھا اور اس کے ماہرین اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

شعبۂ طب

میں اوپر ذکر کر آیا ہوں کہ مولوی عبداللہ صاحب ایک بزرگ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے طبیب بھی تھے، جس چبوترے پر بیٹھ کر وہ اپنا مطب کیا کرتے تھے، اسکے سامنے ہی ہماری برادری کے ایک طبیب مولوی محمد سعید صاحب بھی اپنا مطب اپنی اونچی پختہ رہائش گاہ کے اوپر متصل بیٹھک پر کرتے تھے۔ مولوی حکیم عبداللہ صاحب صرف نسخہ لکھ کر مریض کو دیتے جو سامنے مدرسہ کی دکانوں میں قائم شدہ دواخانہ میں جا کر ادویات حاصل کرتے تھے۔ یہ دواخانہ برادری کے معروف بزرگ حکیم نجیب الدین صاحب چلا رہے تھے جبکہ مولوی حکیم سعید صاحب کے لئے دواخانہ کا کام ان کے فرزند جناب مولوی محمد صدیق صاحب

انجام دیتے تھے۔

حکیم محمد سعید صاحب کے بھی ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھے۔ مولوی محمد صدیق کی شادی بلند شہر میں نو بیٹے والے خاندان میں ہوئی اور ان کا ایک لڑکا جس نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے، اب ضلع بلند شہر ہی کے کسی تعلیمی ادارے میں پڑھا رہا ہے۔ ان کی لڑکی کی پہلی شادی تو مولانا اصلح الحسینی صاحب سے ہوئی تھی، جنھوں نے انہیں تقسیم ہند سے پہلے ہی طلاق دے دی تھی اور دوسری شادی غالباً پھلت کے کسی حکیم صاحب سے ہوئی تھی۔

مولوی عبداللہ اور حکیم سعید صاحب کے علاوہ تیسرے حکیم محترم جناب محمد موسیٰ تھے، یہ بھی بہت اچھے طبیب تھے۔ صوفی منش، خوش اخلاق وخوش گفتار، سرِ راہ جو بیٹھک تھی اس کا ہال کتبوں اور طغروں سے سجا رہتا تھا، گراموفون کا بہت شوق تھا اور مطلب صبح سے شام تک چلتا تھا، مریض بھی قرب وجوار کے دیہات سے خوب آتے تھے اور ہاتھ میں خداداد شفا تھی۔ ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، ایک بڑے لڑکے صادق علی تو دہلی ہی میں رہے، دوسرے لڑکے ملاجی اشتیاق علی لاہور آ گئے اور تیسرے و چوتھے لڑکے اشفاق علی ومبارک علی نے پشاور میں سکونت حاصل کی۔ اب تو ان کے چاروں لڑکے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

ان کی ایک لڑکی کی شادی تو برادری کے ایک معروف بزرگ سید مظفر علی صاحب کے بڑے لڑکے سے ہوئی تھی جن کا نام سید باقر علی تھا اور دوسری لڑکی کی شادی ہاپوڑ میں ہوئی جن کے لڑکے نصیر علی لاہور ہی میں آ کر رہے اور ابھی پچھلے سال انتقال ہوا۔ دوسرے لڑکے وکیل نام کے ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔

علم طب کے علاوہ علم جراحی بھی اس بستی کی حجام برادری میں اپنا کرشمہ دکھا رہا تھا۔ دو تین گھر اس برادری میں مشہور تھے اور یہی لوگ شادی بیاہ کی تقریبات پر کھانے پکانے کا کام بھی کیا کرتے تھے۔

سادات برادری کے کئی افراد پولیس کے محکمہ میں اور فوج کے محکمہ میں جا کر عزت وشہرت حاصل کرنے میں معروف ہیں۔ ان میں سرفہرست نام داروغہ حبیب اللہ صاحب کا ہے پھر دوسرا نام داروغہ سلّم کا تھا، پھر سید مظفر علی، میاں جی عبدالحمید رضوی، داروغہ حبیب اللہ مرحوم کا تیار کردہ محل تو ابھی تک باقی ہے۔

فوج کے شعبہ میں محترم جناب حافظ محمد عتیق اللہ صاحب کے تین فرزندوں کے نام یاد آتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے فرزند کرنل صدیق اللہ مرحوم ہیں جو تقسیم ہند کے وقت پشاور میں تھے اور انہوں نے سیٹھ، گلاؤٹھی، الدن وغیرہ مضافات سے جانے والے ہر خاندان کی آبادکاری میں بھرپور مدد کی۔

دوسرا نام بھائی اقبال برنی صاحب کا ہے جن کا ذکر میں پہلے ہی مرحلہ میں کر چکا ہوں۔ بھائی اقبال صاحب کے بڑے لڑکے پاکستان ایئرفورس میں اونچے درجہ کے آفیسر ہیں اور آج کل سعودی عرب کی حکومت نے انہیں سعودی ایئرفورس کی تربیت کے لئے بلایا ہوا ہے۔ ان کے بڑے داماد بھی پاکستان ایئرفورس میں بڑے عہدے پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انکے تیسرے بھائی میجر انصار صاحب، ریٹائر ہو کر اطمینان سے ڈیفنس سوسائٹی کے اپنے بنگلہ میں رہتے ہیں۔ حافظ محمد عتیق اللہ کے چوتھے صاحبزادے سید نصیر الدین ہنوز بلند شہر میں بھوڑ پر کوٹھی میں سکونت پذیر ہیں۔

سینٹھہ کی میرے بچپن کے دور کی معروف شخصیات میں دوسرے لوگوں میں جناب انتظام علی صاحب کا نام یاد آتا ہے۔ ان کا مکان اور میرا مکان ایک دوسرے سے متصل تھا اور ابھی سید انتظام علی صاحب کے پوتے سید خورشید علی ہیں جو کے ڈی اے سے ریٹائر ہو کر النور سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر نمبردار مست اللہ اور نمبردار محمد اسحاق یاد آتے ہیں، یا پھر ایک اور بزرگ نمبردار سید وارث علی تھے جن کی شب بیداری میں رب کائنات کے حضور آہ وگریہ کی آواز اب بھی میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ سید وراث علی ہی کے خاندان سے جناب سید عبدالعلی، سید عبدالغنی، سید عبدالمغنی اور ہاں حافظ سید عبدالولی صاحبان کے نام یاد آرہے ہیں۔ سید عبدالغنی کے معروف صاحبزادے جناب عثمان غنی راشد کراچی کے معروف ایڈوکیٹ اور ادارۃ اخوان السادات کے پہلے جنرل سکریٹری اور حال میں اخوان السادات گلاؤٹھی کے سب سے فعال کارکن ہیں۔ جناب سید عبدالمغنی صاحب کے صاحبزادے راشد صاحب ہمارے اس ادارے کے موجودہ سکریٹری جناب سید مبشر واسطی صاحب کے داماد ہیں اور ادارے کے کارکن ہیں۔

فنِ طب سے منسلک معروف شخصیات میں مجھے ایک اور نام یاد آرہا ہے، وہ ہیں جناب حکیم سید رشید صاحب، جنہوں نے بلند شہر میں جا کر اپنے فن کا لوہا منوایا اور انہی کے پوتے ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ ہیں، میرا مطلب جناب ڈاکٹر ظفر علی زیدی سے ہے۔ یہ بھائی سید تہور علی کے صاحبزادے ہیں اور ہمارے ادارہ کے معروف اور مضبوط کارکن ہیں۔

تو جناب یہ وہ کوائف ہیں جو موضع سینٹھہ کے حوالہ سے میرے ذہن میں تازہ ہیں، یوں تو بہت سے نام ابھی ایسے ہیں جو کراچی شہر میں مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہیں۔ کبھی ادارہ نے دوسرا سوو یز نکالا تو پھر۔۔۔ یار زندہ صحبت باقی......

۲۷/ اکتوبر ۱۹۸۸ء

☆☆☆

اُلدن ۔ایک صدی قبل

(کتاب ''یادگارِ'' علوی شائع شدہ ۱۹۰۴ سے ماخوذ)

حاجی تہور علی

میرٹھ کے ضلع میں حضرات سادات اور شیخ صدیقی کی چند بستیاں قرب وجوار میں آباد ہیں، ان کا طرزِ معاشرت جس طرح مساوی ہے اُسی طرح ان کے باہمی تعلقات ایسے مسلسل ہیں کہ دیکھنے سے ایک ہی حلقۂ زنجیر معلوم ہوتے ہیں۔الدن ضلع میرٹھ کا ایک موضع ہے جو قصبہ کے نام سے ممتاز ہے، اسکی آبادی پندرہ سونفر سے زیادہ نہیں ہے، اس میں اہلِ اسلام حنفی مذہب، صدیقی نسب زیادہ آباد ہیں اور قرینہ اس کا متقاضی ہے کہ اس سے زیادہ اگر کبھی مردم شماری ہوگئی ہو تو وہ ایسا وقت تھا جو ہمارے قیاس اور عام معلومات سے بعید ہے لیکن ظنِ غالب یہی ہے کہ کم وبیش اس کا یہی اندازہ قائم کرنا چاہئے۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے کسی گھر میں کوئی ایسی تاریخ یا مختصر نوشتہ دستیاب نہیں ہوا جو پرانے واقعات ظاہر کرنے کے لئے خود ایک شہادت ہو جاتا۔ نہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس موضع میں مسلمان کب آ کر آباد ہوئے مگر چند اوراق کرم خوردہ مولوی تبارک اللہ صاحب مرحوم کے عزیزوں کے پاس میں نے دیکھے، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو کس نے لکھا ہے مگر ان کی حالت اور اس یادداشت کا مضمون یقین دلاتا ہے کہ کسی دوسری کتاب سے ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں اس کو بطور تاریخ مرتب کیا گیا تھا انہی اوراق میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''شیخ احمد بن شیخ قطب الدین در قصبہ سراوہ تشریف آوردہ بخانہ قاضی سکندر قریشی ساکن قصبہ مذکورہ کتخدا شدند از دے دوفرزند پیدا شدند، شیخ صدرالدین و شیخ شمس الدین نواسہ ہائے قاضی سکندر اولادِ شیخ صدرالدین ساکنان موضع اولدن اند و اولاد شیخ شمس الدین سکن سراوہ اند''۔

شیخ صدرالدین مورثِ اعلیٰ ساکنانِ اُلدن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیسواں واسطہ ہے۔ میں نے ان بیس حضرات کی عمر کا اسّی اسّی سال کا اندازہ کر کے ہر شخص کی ولادت آب کی بیس برس کی عمر میں فرض کر لی اور ہر بیس برس کی تفریق کے بعد ۸۰۰ھ ہوئے، اس سے ظاہر ہے کہ اس بستی میں مسلمانوں کی آمد کو کم وبیش اس مدت سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔اس بستی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسّی برس کے حالات بچشم خود دیکھ چکے ہیں اور سو برس گزشتہ کی کیفیت اپنے والدین کی چشمِ دید ظاہر کرتے ہیں اور پہلی دنیا کے آدمی اپنے اپنے نسب کی تحقیقات کرنے میں اس قدر مستعد تھے کہ ان لوگوں نے صد سالہ کیفیت خاندانی کو اپنے زمانۂ حیات میں سن رسیدہ عزیزوں سے اس کوشش سے معلوم کیا تھا کہ ''سماعی حال پردۂ چشم دید'' کی مثل پر بھروسہ رکھتے تھے۔اس صورت میں تین سو برس کے حالاتِ نسبی اور شرافتِ خاندانی ہر شخص کے سینہ میں موجود ہے۔درمیانی دو چار پشت کی غلطیوں کو معلوم

کرنے کے نئے قانونِ حفاظتِ خاندانی جو مسلمانوں کی اصل فطرت ہے بہت کافی تھا اور میرا اندازہ اس وجہ سے بھی غلط نہیں کہ بعض حضرات صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ کمی عمر کے حساب سے قریب قریب ۱۳۲۳ھ حاصل ہو سکتے ہیں۔

حضرت مخدوم زاہد میرٹھی سے حضرت شیخ صدرالدین کا پانچواں واسطہ ہے اسی حساب سے بھی جو اوپر لکھا گیا ہے (۱۸۰) برس گھٹانے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خاندان کی آمد ہندوستان میں سن ۶۰۰ھ یا ۵۰۰ھ میں ہوئی ہے کیونکہ حضرت مخدوم صاحب زاہد میرٹھی نے لکھا ہے اور انکے پدر بزرگوار کو امام کبیر ملکی تحریر کیا ہے۔

میرٹھ میں حضرت مخدوم کا مزار اس وقت تک مشہور ہے اور ایک حصہ ان کی اولاد کا میرٹھ شہر میں زاہدیوں کے نام سے نامزد اور آباد ہے۔ یہ حضرات مدت لامعلوم سے اہل الدن سے جدا ہیں اور تخالفِ مذہبی نے ہنوز ان کو جدا کر رکھا ہے اس لئے کہ وہ شیعہ ہیں اور یہاں اہلِ سنت والجماعت حنفی المذہب آباد ہیں، گو تھوڑی مدت سے چند حضرات نے اپنا نام بدل کر اہلِ حدیث رکھ لیا ہے لیکن ان کی بابت اس موقع پر ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا خیال کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

موضع اُلدن کے مکانات اور تمام قطع اس کے دیہات کے سے ہیں لیکن اب زمانہ کی رفتار کے لحاظ سے پختہ در و دیوار بھی نظر آتے ہیں اور روز بہ روز اسی خیال میں ترقی ہو رہی ہے، زیادہ تر اس وجہ سے کہ حرص اور حسد ہر شخص کو نمائش ظاہری پر مجبور کر رہا ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں دو مسجدیں تھیں اب چار ہیں اور نفسانیت نے یہاں تک ترقی پائی ہے کہ نمازِ جمعہ بھی دو جگہ ہوتی ہے حالانکہ مسئلہ شرعی سے ایک جگہ بھی مشکل سے اجازت ملتی ہے۔

حضرات زاہدیوں کے علاوہ بھی چند اور خاندان بھی آباد ہیں لیکن دستور نسبی نے ان کو اس موضع کے نام یا اس مقام سے جہاں سے وہ آ کر آباد ہوئے ہیں مشہور کر رکھا ہے جو کسی غیر جگہ کے نام سے منسوب نہیں ہیں، وہ سب زاہدے خیال کئے جاتے ہیں لیکن بعض تعلقات قدیم اور اکثر جدید واسطوں نے ایسا وابستہ کر دیا ہے کہ ان کے اعتبار سے اب چند خاندان کو ایک ہی گلدستہ قرار دینا چاہئے مگر قدرتی خودنمائی ابھی تک مدارج مقرر کر رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ بعض گھروں میں نامکمل شجرے موجود ہیں اور وہ اس کے ذریعہ سے مدعی ہیں کہ ہم زاہدی ہیں اور بعض گھر ایسے ہیں کہ جن کے پاس کوئی شجرہ یا نوشتہ نہیں لیکن باہمی تعلقات اور مسلسل رشتہ داریاں، جائدادِ غیر منقولہ کی مشارکت شہادت دے رہی ہے کہ یہ سب ایک ہی جماعت ہے۔ جو اوراق مجھ کو میسر آئے وہ کسی کے بھی لکھے ہوئے ہوں مگر اس گھر سے دستیاب ہوئے ہیں، جہاں علم و فضل کا دفتر رہتا تھا اور وعظ و پند کا طریقہ جاری تھا اس وجہ سے یقین ہوتا ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ لغویت سے پاک ہے۔

الدن حضرت شاہ مخدوم فخرالدین زاہد کی اولاد کی وہ جگہ ہے جہاں ایک بڑا حصہ ان کی یادگار کا آباد ہے۔ قصبہ سراوہ میں بھی چند گھر ہیں لیکن انکی علمی و عملی ترقی یہیں کے باشندوں سے وابستہ تھی اور اب بھی ہے کیونکہ بعض لوگ آج بھی الدن میں آ کر حدیث کے درس میں شریک ہوتے ہیں اور اس موضع کی اخلاقی کیفیت اور علمی معلومات ان کو عقائدِ باطلہ سے محفوظ رکھتی ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں بزرگوں کی خانقاہیں تھیں، یہاں بڑے بڑے عالم فاضل، اہل فتویٰ، رونق بستی، چشمۂ ہدایت،

حنفی المذہب آباد تھے۔ نہ شر تھا، نہ فساد، نہ وبالی تھے نہ خارجی، صرف اللہ والوں سے کٹرہ بسا ہوا تھا۔ یہی ایسی مقدس جگہ تھی کہ حضرت شاہ پیر رحمۃ اللہ علیہ جن کا مزارِ مبارک میرٹھ میں ہے یہاں تشریف لاکر چلّہ کشی کیا کرتے تھے۔ ان کے نام سے ایک کوٹھری زمانۂ حال تک بنی ہوئی تھی جو اس وقت شیخ حسام الدین کے مکان میں واقع ہے، اس کی صورت تبدیل ہوگئی ہے لیکن مجھ کو شیخ حسام الدین صاحب نے یقین دلایا کہ ہم نے اسکی بنیاد کو اسکی وسعت کو بدستور قائم رکھا ہے حالانکہ یہ ایک ایسی یادگار تھی کہ جس کو دوسری عمارت میں داخل کر لینا حقیقت میں مقدس نشانات کے مٹانے کے زمرے میں آتا ہے۔

اس بستی میں ہر قسم کے اہل کمال کی موجوگی ثابت ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ ایامِ غدر میں اہل علم کی تصنیفات و تالیفات بھی چاندی اور سونے کے ساتھ ہی غارت ہوگئیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہی علم کی برکتوں کو خداوند عالم نے اس بستی سے اٹھالیا اس وجہ سے اہل فضل کی ہم کو نہ کوئی تصنیف ملتی ہے نہ انکے کشف و کرامات کے حالات فراہم ہوتے ہیں بلکہ ان کے طرزِ عمل اور دستور صوفیانہ کا بھی پتہ نہیں چلتا، زیادہ افسوس تو یہ ہے کہ بہت قریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ کوئی شخص انکے افسانوں کا بیان کرنے والا بھی بستی میں نظر نہیں آئے گا۔

اس بستی میں محلّہ جات حویلی چوک مدرسہ محل میں بھی ایک ہی خاندان آباد ہے۔ پہلے یہ خاندان جامع مسجد کے پس و پیش آباد تھا لیکن خاص ضرورتوں کی وجہ سے ان کو دوسری جگہ لینی پڑی اور چونکہ بیرونی طلباء کے لئے قیام اور مدارس کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے وسیع جگہ میں مکانات بنائے اور سچ تو یہ ہے کہ زیادہ تر اہل کمال کا مجمع اس مقدس خاندان میں تھا۔ آخر زمانہ میں جس کو بہت تھوڑا عرصہ گزرا ہے، مولوی تبارک اللہ صاحب جو حضرت شیخ صدر الدین مرحوم سے بارہویں پشت میں پیدا ہوئے ، بڑے مشہور عالم اور نامور زاہد گزرے ہیں، یہاں تک کہ اس نواح میں جو الدن کے نام سے واقف ہے وہ مولوی صاحب کے نام کو بھی جانتا ہے اور ان کے تقدس کا بھی قائل ہے، وہ ایسے مفتی تھی کہ اہلِ عرب کے نزدیک بھی ان کا ہر ایک فتوی بڑی سند میں شمار ہوتا تھا، انکی اولاد میں مولوی عبدالکریم مرحوم کو میں نے بھی دیکھا ہے انکے زمانۂ حیات تک مجھ کو کافی شعور نہ تھا مگر ان کی ذہانت اور فراست کی چمک بچوں کی نگاہوں میں پڑتی تھی۔

ان کے علاوہ ہم نے اپنی آنکھوں سے علم فارسی اور طب کے ایسے ہمہ داں بھی دیکھے ہیں جن کا جواب میرٹھ اور دلّی تک نہ تھا، ان کا اس چھوٹے سے گاؤں میں ان راستوں پر پھرنا خدا کی شان نظر آتی تھی، ان طبیبوں سے میرٹھ کے امیر غریب سب فیضیاب تھے۔ انہی میں سے ایک منشی اہتمام علی کا ذکر کرتا ہوں، خدا ان کو غریق رحمت کرے، ان کا نام بستی میں ہی نہیں بلکہ دور دور تلک بخطاب منشی لیا جاتا تھا، قدرت نے ان کو ایسی مقبولیت کے ساتھ پیدا کیا تھا اور جس طرح وہ خود نماز، تہجد اور اشراق کے پابند تھے اسی طرح ان کے متوسل زہد و تقوی سے آراستہ تھے۔ انکی گھر کی خواتین جنھوں نے صحن کے مکان کے علاوہ دوسری جگہ کو نہیں دیکھا تھا، اپنے عقائد میں مضبوط تھیں۔ ان کے بیٹے حافظ ظہور عالم جو میرے استاد بھی تھے اچھی فارسی جانتے تھے، تہجد کی نماز، صبح کی تلاوتِ قرآن انکی کبھی قضا نہ ہوتی تھی، ان کی عادت میں سادگی اور سیدھا پن تھا، وہ راست باز تھے اور خدا ترس بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ نمونہ تھے۔

میں نے اسی زمانہ میں میاں جی اللہ بخش اور میاں خدا بخش کو بھی دیکھا، یہ بھی فارسی کے استاذ تھے، اخلاقِ حسنہ کے معلم تھے۔ انکی طبیعتوں میں خودنمائی دور دور تک نہ تھی، صلحِ کُل ان کا مشرب تھا، سنتِ نبوی کے خوگر تھے، سیدھی روش، سادہ لباس، میانہ رفتار مرغوب تھی ان کا اخلاص بستی کے تمام آدمیوں پر محیط تھا۔ میاں جی اللہ بخش مرحوم نے اپنی یادگار اپنے بیٹے حافظ محمد خلیل صاحب کو چھوڑا۔ ان میں اکثر خوبیاں میاں جی موصوف کی پائی جاتی تھیں۔ اسی طرح میاں خدا بخش مرحوم کے دو بیٹوں کو دیکھتا ہوں، ان میں شیخ حسام الدین کا ذکر کرنے کے لائق ہے، یہ علم فارسی کی تکمیل کر چکے ہیں، قانونی مصالح اور عملی حکمتوں کو خوب سمجھتے ہیں، خودغرضانہ اور ناگہانی حملوں کے مقابلوں کے لئے قدرت نے اس بستی میں ان کو بطور سپاہ پیدا کیا ہے، وہ ایسے مستقل مزاج ہیں کہ جن سے الفت ہے، اُن سے الفت ہے اور جس سے عداوت ہے، اُس سے کھلی عداوت ہے۔

سب سے زیادہ اہلِ بستی کو اس کا فخر ہے کہ شیخ برکت علی، حافظ اور علم فارسی کے ماہر، اسلامی مسائلِ ضروریہ سے واقف، جامع مسجد کے امام، بڑوں کے لئے نعمت اور بچوں کے لئے استاذ، اس خوش نصیب بستی میں اب تک تعلیم وتلقین میں مصروف ہیں، انکی عمر اس وقت ستّر برس سے زیادہ ہے لیکن روزمرہ کے کام وہ اسی طرح انجام دیتے ہیں جس طرح جوان العمر اپنے فرائض کو ادا کیا کرتے ہیں لیکن افسوس اور حسرت ہر شخص کو اس وجہ سے دامن گیر ہے کہ جس بستی میں تیس چالیس حافظ تھے، اس بستی میں اب کلام الٰہی کے حفظ کرنے کا شوق بھی معدوم ہوا جاتا ہے، جس جگہ گھر گھر اہلِ علم تھے وہاں جہل ترقی پر ہے۔ پانچ چھ برس سے میرے بھائی برکت علی صاحب نے جن کو پرانی خوبیوں کا نمونہ کہنا چاہئے بڑی ہمت کے ساتھ عربی مدرسہ کا اہتمام اپنے ذمہ لے رکھا ہے لیکن شامتِ اعمال کی وجہ سے عام خیالات انکی موافقت نہیں کرتے بلکہ اہلِ برادری کی پست ہمتی بہ زبان حال کہہ رہی ہے کہ مدرسہ کی کشتی اگر آج نہ ڈوبی تو کل ضرور ڈوبے گی۔

اب میں پھر حضرت زاہدی کا ذکر کرتا ہوں جن کو اہل عرب بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اب وہ بھی خاندان زوال کی حالت میں ہے، نہ ان میں پہلا سا علم رہا نہ ویسے عمل ہیں، نہ پہلی سی فارغ البالی ہے۔ محلّہ مدرسہ خالی ہو چکا، حویلی بھی خالی ہے، یہ دونوں جگمگاتی ہوئی منزلیں ویران نظر آ رہی ہیں، قدرت نے جس طرح ان سے علم کی برکت کو اٹھالیا اُسی طرح انکی جماعت میں بھی قلت واقع ہو رہی ہے۔ ذکر کے قابل صرف حاجی عبدالرحیم مثل چراغِ سحری باقی رہ گئے ہیں، ان کے در و دیوار پر حسرت برستی ہے انکی آنکھوں کے روبرو پرانے نقشے ہر وقت کھنچے ہوئے رہتے ہیں۔ کبھی وہ ازن میں مشغول ہوتے ہیں، کبھی وہ اپنا وقتِ آخر یاد آ جاتا ہے، اب ان کی یہی آرزو باقی رہ گئی کہ مکہ معظّمہ پھر جائیں اور زمین کا پیوند بن کر رہ جائیں۔

ان کے علاوہ ایک حکیم سکندر علی صاحب کا خاندان کسی قدر عروج پر ہے، انکی مالی قوت اور علمی سرمایہ بھی محفوظ ہے۔ زمانہ موافق ہے مگر چونکہ عرصہ سے ان کا قیام ریاست پٹیالہ میں ہے، اس وجہ سے الدن انکے قدیمی وطن میں شمار ہوتا ہے، یہاں کے باشندے فخر یہ کہتے ہیں کہ حکیم صاحب ہماری اہل برادری الدن کے ہی رہنے والے ہیں۔

الدن میں عرصہ سے ایک خاندان سادات کا بلاسپور سے آ کر آباد ہوا۔ ان کے تعلقات اسی وقت سے حضرات شیوخ میں ہوتے رہے ہیں، اس وقت صرف محمد یحییٰ موجود ہیں انکی تفصیل معلوم نہیں مگر انکی جرأت اور یک رنگی قابل یادگار ہے، انکے پدر

بزرگوار سید حیدر علی صاحب کی بابت ہم نے اپنے والد بزرگوار سے سنا ہے کہ وہ روپیہ کو چٹکی سے موڑنے اور پانی کا بھرا ہوا چرس تنہا کھینچ لیتے تھے۔ان کی عادت کا فوٹو میں تحریر میں نہیں کھینچ سکتا سوائے اس کے کہ یہ لکھ دوں کہ قوتِ حیدری مجموعۂ خیر کا نام حیدر علی رکھا گیا تھا۔

اسی بستی میں بہت سے آدمی ایسے گزرے ہیں جن میں سے ایک کا نام منشی کے لفظ کے ساتھ لیا جاتا ہے مگر اِس وقت میرے بڑے بھائی یوسف علی صاحب اس قومی خطاب سے ممتاز ہیں بلکہ ہم نے اکثر حکام انگریزی کو بھی ان کا نام اسی اعزاز کے ساتھ لیتے ہوئے دیکھا ہے،خدا انکی عمر میں اور نیک ارادوں میں برکت عطا فرمائے۔

حضرات سادات میں صوفی امتیاز علی صاحب اور حافظ امداد علی کا زمانہ بھی میں نے دیکھا ہے، یہ میاں راج شاہ صاحب قادری کے مرید تھے، انکی صورت سے، لباس سے، انکے افعال سے، انکے انداز سے، جنید اور بایزید کے حالات پیش نظر ہوتے ہیں اور صحابیوں کے جن تذکروں کو ہم فسانوں کی طرح پڑھتے ہیں وہ مثال انکی صورت میں نمایاں تھی اب انکی جگہ انکے خام مزاروں کا نشان ہی نشان نظر آرہا ہے۔غرضیکہ یہ وہ بستی ہے جس میں عالم، فاضل، حکیم، منشی، درویش، حافظ، شیخ سخی، بہادر اور زور آور سپاہی آباد تھے۔

اس بستی میں سب سے پہلے جو مسجد بنائی گئی وہ اب جامع مسجد کے نام سے موسوم ہے، اس مسجد کو وسط آبادی میں رکھا گیا تھا، اس مسجد کے شمال میں ہمارے مورثِ اعلیٰ آباد ہوئے اور غرب جنوب میں دیگر حضرات آباد ہوئے۔غور اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسجد کے ساتھ آباد تھے یہ مسجد انہوں نے ہی بنائی تھی اور یہی لوگ سب سے پہلے اس بستی میں داخل ہوئے اور انہی میں ہم ہیں، ایک اور وجہِ شہادت اس خاندان کے نسب کی تعلقات دے رہے ہیں انکی رشتہ داریاں علاوہ حضرات زاہدی کے موضع سینٹہ اور قصبہ گلاؤٹھی کے سادات میں بھی پائی جاتی ہیں۔

☆☆☆

بلندشہر (برن) تاریخ کی روشنی میں

بشکریہ میجر رفیع الدین یاور

ضلع بلندشہر ہندوستان کے صوبہ اُتر پردیش (یو پی) میں کمشنری میرٹھ میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً ۱۹۰۰ مربع میل ہے۔ یہ ضلع دریائے گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں اس طرح واقع ہے کہ دریائے گنگا اس کی مشرقی حدود اور دریائے جمنا اس کی مغربی حدود قائم کرتے ہیں۔ دریائے گنگا اس کو مرادآباد اور بدایوں سے اور دریائے جمنا دہلی اور گڑگاؤں سے الگ کرتے ہیں۔ شمال میں ضلع میرٹھ اور نیا ضلع غازی آباد اور جنوب میں ضلع علی گڑھ واقع ہے۔

بلندشہر کا قدیم نام ''برن'' تھا جس کو بعد میں بلندشہر یا اونچا شہر کہا جانے لگا۔ اس شہر کی اپنی ایک قدیم تاریخ ہے۔ کورو پانڈو کے دور میں ضلع میرٹھ بھی ریاست برن میں شامل تھا۔ اس دور میں اس ریاست کی راجدھانی ہستناپور تھی۔ کچھ مدت بعد یہ علاقہ دریائے گنگا کی طغیانیوں کی وجہ سے باقی ریاست سے الگ ہوگیا۔ اس شہر کو کس نے آباد کیا تھا اس بارے میں کوئی حتمی بات سامنے نہیں آ سکی۔ ایک روایت ہے کہ اس کو راجہ پرمال نے جو ریاست آہار کا راجہ تھا نے آباد کیا اور ایک کہاوت کے مطابق اس شہر کو بسانے والے کا نام آہی برن تھا اور اسی کے نام پر اس جگہ کا نام برن پڑ گیا۔ ان کہانیوں کی جو بھی حقیقت ہو بہر حال اس شہر کے تاریخی ہونے کا ثبوت یہاں پائے جانے والے مختلف کتبوں سے ہوتا ہے جو بدھوں کے زمانے کے پانچویں سے ساتویں صدی کا حال بتاتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں یہاں گوڑ برہمن آباد تھے اور یہاں خاندان گپتا کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ کچھ قدیم سکے بھی یہاں سے ملے ہیں جو ان آثار سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ اس دور اور اس کے بعد کے کافی زمانہ تک تاریخ اس علاقہ کے متعلق خاموش ہے۔ ہندوستان کے دیگر شمالی علاقوں کی طرح اس ضلع کی واضح اور مستند تاریخ مسلمانوں کی آمد کے بعد شروع ہوتی ہے۔

۱۰۱۸ء میں جب محمود غزنوی برن کے علاقہ میں پہنچا تو اس وقت یہاں راجہ بردت حکمران تھا اور اس کی حکومت میں قصبہ ہاپوڑ اور میرٹھ کے ملحقہ علاقے بھی شامل تھے۔ برن اس حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ مسلمان مورخ لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کی رواداری اور اچھے سلوک سے متاثر ہوکر راجہ ہردت بمعہ اپنی دس ہزار رعایا کے مسلمان ہوگیا اور اس طرح یہ علاقہ پہلی مرتبہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا۔ محمود غزنوی کے چلے جانے کے بعد اس علاقہ کے ہندوؤں نے پھر حکومت پر قبضہ کرلیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۹۳ء میں جب شہاب الدین غوری کا سپہ سالار قطب الدین برن پر حملہ آور ہوا تو اس وقت یہاں راجپوت خاندان ڈور کا راجہ چندرسین حکمران تھا۔ راجہ بہت بہادری سے لڑا مگر قطب الدین کے لشکر عظیم کے مقابلے میں اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا اور آخر کار لڑتا ہوا مارا گیا تو اس کے ایک رشتہ دار جے پال نے قطب الدین سے صلح کرلی۔ جے پال خود اور اس کی رعایا کے بیشتر افراد مسلمان ہوگئے۔ صلح نامہ کے

تحت برن کی حکومت جے پال کے سپرد کردی گئی۔اس خاندان کے لوگ اب بھی اس ضلع میں آباد ہیں اوران میں سے اکثر و بیشتر زمینوں کے مالک ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی کی تاریخ میں بلندشہر کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔بلبن کے دور کا ذکر کرتے ہوئے سیفی نوگانوی تاریخ اقوام عالم میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ اس دور حکومت میں شمالی ہندوستان میں منڈ اور امروہہ سنبھل، بدایوں، ہرن، کوئل اور اودھ بڑی سرکار مانی جاتی تھیں جنہیں صوبے سمجھنا چاہیے اوران میں بااختیار صوبیدار مقرر ہوتے تھے۔۱۳۳۳ء میں محمد شاہ تغلق نے برن پر حملہ کیا جس کا ذکر قاضی ضیاءالدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں اس علاقہ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔اس علاقہ کی تاریخ میں یہ صدی خاص واقعات کی حامل ہے کیونکہ اس صدی میں مختلف فرقوں کے لوگ دوسرے علاقوں سے آ کر بلندشہر میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔خاص طور سے راجپوت، انہوں نے میواتیوں کوان کی زمینوں اور دیہاتوں سے بے دخل کر دیا۔یہ زمانہ اس علاقہ میں سخت بدامنی لڑائی جھگڑے اور قحط کے حالات سے دوچار رہا۔

مغلوں کے دور کے آغاز سے یہاں امن وسکون کی فضا پیدا ہوئی اور مستحکم حکومت کا آغاز ہوا۔راجپوت جو یہاں آ کر آباد ہوگئے تھے۔شہنشاہ اکبر کی حکومت کی تنظیمی اور فلاحی اسکیموں میں بھرپور حصہ لیا اور امن وسکون کی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد کی۔اکبر اوراس کے بعد بھی یہاں کافی عرصہ تک مکمل امن رہا اورنگزیب کے عہد حکومت میں دیگر اضلاع کی طرح اس ضلع میں بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔مغل دور کے زوال کے زمانہ میں جس کی ابتداء ۱۷۰۷ء میں بہادر شاہ اول کی تاج پوشی سے ہوئی۔ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح بلندشہر اوراس کے گردونواح کے علاقے بھی بدنظمی اور بدامنی کا شکار ہوئے۔ہندو جاٹ اور گوجر پھر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مغلیہ سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔انہوں نے اپنے گردونواح کے دیہات پر قبضہ کر کے چھوٹی چھوٹی جاگیریں قائم کرلیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ ضلع کوئل (علی گڑھ) کے زیر انتظام رہا۔اس لیے اس کی اس زمانے کی اپنی کوئی الگ تاریخ نہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب اس علاقہ پر مرہٹوں کی حکومت تھی اورانہوں نے کول کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔۱۸۰۲ء میں انگریزوں نے علی گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے گردونواح کے علاقہ کو ملا کر ضلع علی گڑھ قائم کرلیا اور برن اوراس کے گردونواح کا علاقہ کو بھی اس میں شامل کرلیا گیا۔موجودہ ضلع بلندشہر کا کچھ علاقہ انگریزوں نے ۱۸۰۱ء میں نواب وزیر والئ اودھ سے اپنے قبضہ میں لیا اور باقی ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں سے چھینا۔تقریباً بیس سال تک انگریزوں نے بھی ضلع بلندشہر کا علاقہ علی گڑھ کے زیر انتظام رکھا۔۱۸۱۹ء میں گوجروں کی بغاوت دبانے کے لیے بلندشہر میں ایک جوائنٹ مجسٹریٹ تعینات کیا گیا اور پھر ۱۸۲۳ء میں اس کو ایک الگ ضلع کی حیثیت دیدی گئی۔اس طرح موجودہ ضلع بلندشہر معرض وجود میں آیا۔

بلندشہر میں جنگ آزادی کی ابتداء ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس وقت ہوئی جب یہاں پر تعینات نویں دیسی انفینٹری رجمنٹ نے بغاوت کردی۔انگریز افسران جان بچا کر میرٹھ بھاگ گئے اور باغی گوجروں نے بلندشہر اور گردونواح کے علاقہ پر قبضہ کر کے

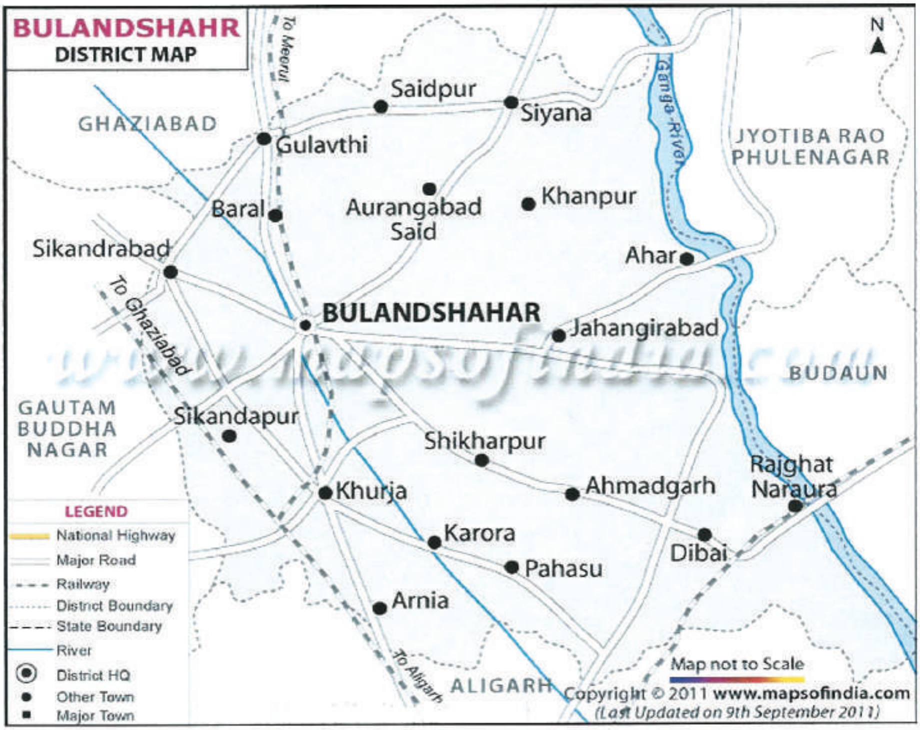

اسے بری طرح لوٹا۔ اس علاقہ کی بازیابی انگریزوں کے لیے نہایت ضروری تھی کیونکہ آگرہ اور علی گڑھ سے میرٹھ جانے والی سڑک اسی علاقہ سے گزرتی تھی۔ اس لیے ایک چھوٹی سی فوجی جماعت میرٹھ سے روانہ کی گئی جس نے دہرہ دون کے گورکھوں کی مدد سے بلندشہر پر پھر قبضہ کرلیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب گورکھے جنرل ولسن کے کالم میں شریک ہونے کے لیے چلے گئے تو مالا گڑھ کے نواب ولی داد خان نے گوجروں اور مسلمانوں کی مدد سے اس علاقہ پر قبضہ کرلیا اور انگریز فوج کو مار بھگایا۔ جولائی سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک نواب ولی داد خان اس علاقہ پر قابض رہے اور آگرہ جانے والی سڑک پر ان کا مکمل قبضہ رہا۔ اس دوران میں پرانے اور نئے زمینداروں میں زمین کے قبضہ پر آپس میں ٹکراؤ بھی ہوتا رہا۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کرنل گریتھڈ (Greethed) کے طوفانی کالم نے غازی آباد سے بلندشہر پر حملہ کیا۔ سخت جنگ کے بعد ولی داد کو شکست ہوئی اور وہ دریائے گنگا پار کر کے اودھ کی طرف چلے گئے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو کرنل فرقوہر (Farquhar) نے باقاعدہ اس علاقہ پر قبضہ کر کے امن وامان بحال کردیا اور تحریک آزادی کو کچل دیا۔ مجاہدین کو سزائیں دی گئیں۔ ہزاروں افراد کو گرفتار کرلیا گیا اور لاتعداد مجاہدین کو اس بے دردی سے مارا گیا کہ جس کی تاریخ میں کم مثال ملتی ہے۔ ضلع کچہری کے احاطہ میں کالے آم سے لٹکا کر سینکڑوں افراد کو پھانسی اس طرح دی گئی کہ کئی کئی روز تک مجاہدین کی لاشیں وہیں لٹکائی رکھی گئیں۔ صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ جنگ آزادی میں ساتھ دینے والے مسلمانوں کی زمینیں اور جائیدادیں ضبط کرلی گئیں۔ سرکاری نوکریوں کے دروازے ان کے اور ان کے خاندان کے لیے بند کردیے گئے۔

جنگ آزادی کے بعد اس ضلع میں بھی دیگر علاقوں کی طرح کافی عرصہ تک کوئی خاص تحریک یا واقعہ قابل ذکر پیش نہیں آیا البتہ علی گڑھ تحریک میں اس ضلع کے مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مسلم لیگ کو بلندشہر اور قرب و جوار کی بستیوں میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی بلندشہر آمد اور تاریخ ساز جلوس نے بلندشہر اور قرب و جوار کی بستیوں میں مسلمانوں میں تحریک پاکستان کے لیے جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ تحریک آزادی میں اس ضلع کو یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی کی نشست کے لیے مسلم لیگ نے ٹکٹ دیا اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب اسماعیل علی خان اور نواب عمار احمد خان (دان پور) کی قیادت میں یہاں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک کے سلسلہ میں بلندشہر کا نام ملک کے اخباروں میں کافی عرصہ تک آتا رہا۔ خاص طور سے اس واقعہ کی وجہ سے جس میں خاکساروں نے بلندشہر کی جیل پر حملہ کر دیا تھا اور کئی خاکسار شہید اور کافی تعداد میں زخمی ہو گئے تھے۔

☆☆☆

تاریخ مدرسہ عربیہ اسلامیہ منبع العلوم جامع مسجد

قائم فرمودہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

﴿سنِ قیام ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء﴾

ندیم ماہر

ہندوستان میں اسلام کا ڈنکا پہلی صدی ہجری میں بج چکا تھا لیکن اسلامی کلچر اور مذہبی تعلیم وتمدن سیکھنے سکھانے کیلئے باضابطہ مدارس، کلیات اور جامعات کا انعقاد نہیں ہوسکا تھا اور نہ ہی قرآن وحدیث کے باضابطہ اور منظّم مراکز تھے البتہ خانقاہوں اور مساجد میں برائے نام اس ضرورت کی تکمیل ہوپاتی تھی۔

محمودغزنویؒ کے دورِ خلافت اور عہدِ حکومت میں باقاعدگی سے مدرسہ کا قیام وجود پذیر ہوا اور مغلوں کے زمانے میں تو مدارس کی تعداد خود دلی اور مدراس میں کئی ہزار تک بتلائی جاتی ہے لیکن انحطاط دورِ مغل اور تسلطِ افرنگ سے یہ شادابی کافور ہوئی اور نشہ اسلامی اترتا چلا گیا۔ کفر والحاد کی گرم بازاری پھیل گئی رفتہ رفتہ یہ کشتی ڈوبنے لگی کہ اچانک پاک طینت قدسی النفوس حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ وغیرھما درد ملت اور سوزِ اصلاحِ امت لیکر اٹھے اور ایک الہامی مدرسہ کا قیام ۱۲۸۳ھ میں فرمایا جس کو عالمِ اسلام دارالعلوم دیوبند کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اس دور میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتا تھا جس نے انگریزوں کے ایوان میں تزلزل اور ارتعاش پیدا کردیا تھا۔ اس تحریک دارالعلوم کا جزل اور کمانڈر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو منتخب کیا گیا۔

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نیک توجہات قصبہ گلاؤٹھی کی طرف منعطف ہوئی اور حضرت نانوتویؒ قصبہ گلاؤٹھی کی ایک مخیّر اور فیاض شخصیت منشی سید مہربان علی کی دعوت پر گلاؤٹھی تشریف لائے۔ بلانے کا مقصد حضرتؒ کے بدست جامع مسجد کا سنگِ بنیاد رکھوانا تھا۔ ۱۲۸۷ھجری میں جامع مسجد کے سنگِ بنیاد کے ساتھ ساتھ حضرتؒ نے مدرسہ کا بھی مسجد سے متصل سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ مدرسہ تحریکِ دارالعلوم دیوبند کا پہلا رفیقِ سفر اور شریکِ جہاد ہوا اور حضرتؒ کے ستونِ خمسہ میں اس کا شمار ہوا۔ حضرت نانوتویؒ نے بحیثیت مدرس اپنے داماد مولانا عبداللہ انصاریؒ اور بحیثیت طالب علم اپنے صاحبزادے حافظ محمد احمد کا انتخاب فرمایا۔

مدرسہ کے مہتمین اور ناظم حضرات کی تفصیل حسب ذیل ہے

۔مولانا سید نجم الدین صاحبؒ (سفرِ حج کے دوران داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور حجازِ مقدس میں مدفون ہوئے)۔

۔مولانا سید محی الدین صاحبؒ (شاگرد رشید حضرت گنگوہیؒ اجدادی قبرستان میں مدفون ہوئے)۔
۔ مولانا سید حمید الدین صاحبؒ (اصلاحی تعلق حضرت گنگوہیؒ سے تھا اجدادی قبرستان میں مدفون ہوئے)۔
۔حافظ سید نسیم الدین صاحبؒ (اصلاحی تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا اجدادی قبرستان میں مدفون ہوئے)
۔مولانا قاری سید محمد میاں صاحبؒ (اصلاحی تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے رہا نیز حضرتؒ کے شاگرد رشید اور تقریباً ۱۸ سال تک حضرتؒ کے ساتھ اسفار میں رہے، اجدادی قبرستان میں مدفون ہوئے)۔
۔مولانا سید ندیم اختر ماہر قاسمی (۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۰ء تک کام کیا، بعدازاں دوحہ قطر منتقل ہو گئے، وزارۃ داخلیہ میں ملازمت اختیار کی)۔
۔مولانا سید فرید الدین مظاہری (۲۰۰۰ء سے اب تک یہ فرائض انجام دے رہے ہیں)۔

مدرسہ کے سرپرستان کی تفصیل حسب ذیل ہے

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، محدثِ کبیر حضرت مولانا سید فخر الدینؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب (صدر جمعیۃ علماء ہند)

مدرسہ کا معائنہ فرمانے والی کچھ اہم شخصیات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا مفتی شفیع احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ، حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حضرت مولانا ابوالوفاء شاہ جہانپوریؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ، مفتیٔ اعظم مفتی محمود الحسنؒ، عارف باللہ علامہ صدیق احمد باندویؒ، محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحقؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندویؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ، حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالعزیزؒ (ناظم مجلس علمیہ حیدرآباد)، حضرت مولانا حشیم الدین (مدرسہ صولتیہ مکۃ المکرّمۃ)، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب، حضرت مولانا سید ارشد مدنی (صدر جمعیۃ علمائے ہند)، حضرت مولانا سید محمد سلمان (ناظم مظاہر علوم جدید)، حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری، حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی، حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی

شعبۂ تدریس سے وابستہ کچھ اہم شخصیات

حضرت مولانا عبداللہ انصاریؒ (مدرسِ اول)، حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ، حضرت مولانا ماجد علی جونپوریؒ، حضرت مولانا

غلام نبی ہزارویؒ، حضرت مولانا محمد احمد کابلیؒ، حضرت مولانا محمد حسن مرادآبادیؒ (مجاز حضرت گنگوہی)، حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خانصاحبؒ، حضرت مولانا شیر علی قندھاریؒ، حضرت مولانا محمد عثمان فیض آبادی، حضرت مولانا محمد عثمان معروفی

مدرسہ سے فیض حاصل کرنے والی اہم شخصیات

حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ (طالب علم اول)، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خانصاحبؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ، حضرت مولانا شمس الدین افغانی قاضی القضاۃ افغانستان، حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، حضرت مولانا مفتی سید محمد اکمل الحسینیؒ (پاکستان)، حضرت مولانا محمد عیسی پالنپوری، حضرت مولانا نصیر احمد خانصاحبؒ، حضرت مولانا محمد اصلح الحسینیؒ (پاکستان)، حضرت مولانا سید محبوب رضوی (مصنف تاریخ دیوبند)

مدرسہ کے شعبہ جات

قرآن مجید حفظ وناظرہ وقاعدہ نورانی، شعبۂ عربی وفارسی تا جماعت ششم عربی (مشکوۃ شریف)، دارالافتاء ودارالقضاء، شعبۂ دعوت وتبلیغ، انجمن اصلاح البیان برائے مشق تقریر وتحریر، شعبۂ نشر واشاعت

مدرسہ کی جانب سے دی جانے والی سہولیات

طعام دو پہر وشام، فریج کا ٹھنڈا پانی نیز سردی کے موسم میں استعمال کیلئے گرم پانی، سردی اور گرمی کا لحاظ کرتے ہوئے لحاف اور کپڑوں کا انتظام، طلبہ کی ذاتی ضروریات مثلاً تیل، صابن وغیرہ کا انتظام، درسی کتابوں کی فراہمی، بیمار طلبہ کو علاج اور ادویہ کی فراہمی

کتب خانہ

مدرسہ میں ایک نایاب کتب خانہ ہے جو اس ادارہ کا ایک اثاثہ ہے۔ اس کتب خانے میں قدیم وجدید تقریباً بیس ہزار سے متجاوز کتابیں ہیں، جن میں عربی، فارسی اور اردو میں بے بہا کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ کتابوں کے اس ذخیرے میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث کے علاوہ ہیئت، فلسفہ، عربی سائنس، علم کلام، منطق کے علاوہ سینکڑوں موضوعات پر کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے اہم مخطوطات کا خزانہ ہے۔ عربی، فارسی میں علم ہیئت (سائنس) نیز ادعیہ، تصوف اور تاریخ پر مبنی کتب ہیں۔ ان میں تین سو سال سے لے کر سو سال تک کے مخطوطات موجود ہیں۔ مکتوبات کا بھی ایک اہم اور بیش بہا خزانہ اس کتب خانے کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔

ان نادر ونایاب کتابوں کے حفاظت کیلئے کتب خانے کو جدید سہولتوں سے آراستہ کیا گیا ہے، جس میں نئے سرے سے

جلد سازی لیمینیشن (پلاسٹک کے غلاف) اور کتابوں کی حفاظت کیلئے ادویہ کا استعمال اسٹیل کے ریک لگوائے گئے ہیں۔لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے بھرپور طور پر یہ کام ابھی بھی باقی ہے، جس میں خاص طور پر کیڈ لاک بنوانا اور کتابوں کی نئے سرے سے موضوعات کے اعتبار سے ترتیب ایک اہم کام ہے۔

جامع مسجد گلاؤٹھی

☆☆☆

مفید عام اسکول

نسیم الدین ہاشمی

گلاؤٹھی کی تاریخ نامکمل ہوگی اگر مفید عام اسکول کا تذکرہ نہ کیا جائے۔اس عظیم تعلیمی ادارہ کا قیام گلاؤٹھی کی ایک ایسی نامور شخصیت کے نام ہے جس نے فلاح و بہبود کے کاموں میں مثالی کردار ادا کیا۔قصبہ گلاؤٹھی اور قرب وجوار کی بستیوں میں آباد ہزاروں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔ یہ عظیم شخصیت حافظ سید شفیع الدین (مرحوم) کی تھی جنہوں نے ایسے مشکل وقت میں جب قصبہ اوراس کے اطراف کی مسلم بستیاں تعلیمی اعتبار سے انتہائی پسماندگی کا شکار تھیں،اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔

یہ بیسویں صدی کے وسط کا دور تھا۔قصبہ میں صرف دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قدیم مدرسہ جس کی بنیاد محترم منشی سید مہربان علی (مرحوم) نے رکھی تھی موجود تھا لیکن عام مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم کا حصول انتہائی مشکل اور دشوار کن تھا۔مسلم ہائی اسکول بلند شہر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے اداروں میں تعلیم ہر خاص و عام کے لئے ممکن نہ تھی۔ یہاں تعلیم کا حصول صرف صاحب حیثیت گھرانوں تک ہی محدود تھا۔

حافظ سید شفیع الدین (مرحوم) بہاولپور میں ملازم تھے۔اپنی ملازمت کے آخری دور میں اپنے وطن گلاؤٹھی میں تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی خواہش جو ایک عرصہ سے دل میں موجزن تھی شدید ہوگئی۔ بالآخر ۱۹۴۰ء میں آپ نے ''انجمن رفیق الطلباء'' کی بنیاد رکھی،جس کے بنیادی مقاصد میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے تعلیمی اداروں کا قیام اور جدید تعلیم کے حصول کے لئے ہر ممکن مدد بہم پہنچانا تھا۔ برادری کے تمام لوگوں نے آپ کا بھر پور ساتھ دیا۔حافظ صاحب خود جانتے تھے کہ کسی بھی بڑے کام کی کامیابی صرف اور صرف اجتماعیت میں ہی مضمر ہے۔قصبہ کے اہل خیر حضرات نے اس میں بھر پور تعاون کیا،ان میں خاص طور پر حافظ سید فخر الحسن، قاضی سید سمیع اللہ،حکیم سید حامد علی،مولوی سید حمید الدین،سید شفقت اللہ،حکیم سید سعید الدین،اختر عالم واسطی،قاضی عبد القدوس،قاضی سید فیاض اور مقدم فیضیاب جیسے اسمائے گرامی شامل تھے۔

آج سے ۷۲ سال قبل ۱۹۴۲ء میں سب سے پہلے آپ نے اپنی رہائش کے لئے بنائی گئی کوٹھی رین بسیرا جو تقریباً دو ایکڑ پر مشتمل تھی،لڑکوں کے پہلے اسکول مکتبہ اسلامیہ مفید عام اسکول کی بنیاد رکھی۔آپ کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی ،چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مفید عام انگلش گرلز اسکول کی بنیاد اپنے ایک اور ذاتی مکان میں رکھی جو بوجوہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

کوٹھی رین بسیرا قصبہ سے باہر جی ٹی روڈ پر واقع اپنے وقتوں کی چند خوبصورت عمارتوں میں سے ایک تھی ، جو حافظ صاحب مرحوم نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے ۱۹۴۰ء میں تعمیر کرائی تھی۔مختلف شہروں سے لائے گئے مولسری کے خوشبودار درختوں اور

مفید عام اسکول، گلاؤٹھی

پھولوں سے بھری ہوئی بیلیں، ایک طرف اس عمارت کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھیں تو دوسری طرف حافظ صاحب کے ذوق کی عکاسی بھی۔ شروع میں یہ عمارت صرف پانچ کمروں اور دو برآمدوں پر مشتمل تھی، اسکول کے قیام کے فوراً بعد مزید تین کمرے تعمیر کرائے گئے جو اس وقت کے طلباء کی ضرورت کے لئے کافی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں چند طلباء سے شروع کیا جانے والا یہ ادارہ تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتا چلا گیا۔ تین سال بعد طلباء کی تعداد ۳۰۰ سے تجاوز کرگئی۔ ۱۹۴۵ء میں اسکول کو محکمہ تعلیم سے رجسٹر کرایا گیا اور اسی سال یہ پرائمری اسکول سے جونیئر ہائی اسکول بن گیا۔ ۱۹۶۴ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۸۹ء میں انٹرمیڈیٹ کالج ہوگیا۔

آج یہ ادارہ نہ صرف گلاؤٹھی بلکہ قرب وجوار کے دیہاتوں جیسے اکبر پور، سینٹھ، حسین پور، سروندھن، مٹھے پور، چڑاوک، سوہن پور، موڑی، بھمرا اور بجھیڑا کے بلا لحاظ مذہب وملت تمام اہل علاقہ کے بچوں کے لئے اہم تعلیمی مرکز بن چکا ہے۔ اب تک ستر ہزار سے زائد طلباء کالج سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ کالج کی عمارت ۲۶ کمروں پر مشتمل ہے جس میں ۲۰ سے زائد کلاس روم، سائنسی لیبارٹیز اور ایڈمنسٹریٹیو بلاک کے کمرے شامل ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں آپ کے صاحبزادے رضی الدین ہاشمی نے اسکول کے صدر دروازے سے ملحق ''مسجد شفیع'' تعمیر کرائی۔ اللہ تعالی اس صدقہ جاریہ کو قبول فرمائے۔ آمین

یہاں اُن قابل اساتذہ کا ذکر ناگزیر ہوگا جو اس ادارہ سے منسلک رہے اور جنہوں نے قصبہ کے مسلمان طلباء کی نہ صرف تعلیمی ضروریات کو پورا کیا بلکہ ان کی ذہنی اور علمی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا جن میں نمایاں اسمائے گرامی جناب قاضی سید سمیع

اللہ، سید ریاض الدین احمد، پروفیسر سید عزیز عالم، سید اختر عالم واسطی، محمد ابراہیم، سید شوکت علی، سید صابر علی، سید شاہد علی، احمد میاں (اکبر پور) مولوی سید احمد میاں، سید اقبال حسن، سید شاکر علی اور سید نادر حسن شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل اساتذہ کرام **۱۹۴۲ء** سے **۲۰۱۴ء** تک ہیڈ ماسٹر/ پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے:

جناب سید صابر علی ہیڈ ماسٹر پرائمری سیکشن	۱۹۴۲ء-۱۹۴۵ء
جناب محمد ابراہیم ہیڈ ماسٹر جونیئر ہائی اسکول	۱۹۴۵ء-۱۹۵۸ء
جناب احمد میاں (اکبر پور) ہیڈ ماسٹر جونیئر ہائی اسکول	۱۹۵۸ء-۱۹۶۲ء
جناب سید شوکت علی ہیڈ ماسٹر/ پرنسپل	۱۹۶۲ء-۱۹۸۴ء
جناب سید ریاض اختر ہاشمی پرنسپل	۱۹۸۴ء
جناب جگ پال سنگھ پرنسپل	۱۹۸۴ء-۲۰۱۱ء
جناب محمد زاہد پرنسپل	۲۰۱۱ء-۲۰۱۴ء

اسکول کے کچھ ابنائے قدیم :

سید فصیح الدین احمد، سید منصور عاقل، اقبال حسن خورجوی، راغب حسن خورجوی، سید مسرور واسطی، سید آل حسن، قاضی سید اسلام، قاضی سید محمد احمد، سید مبین احمد، سید قمر احمد، رضی الدین ہاشمی، نسیم الدین ہاشمی، وسیم الدین ہاشمی، قاضی سید نواب، قاضی سید تسنیم، ڈاکٹر قاضی عرفان چمن، سید احمد علی، قاضی ذکی احمد، سید محمد اختر، سید فراز احمد، ڈاکٹر منصور احمد اور ڈاکٹر قاضی شکیب کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

☆☆☆

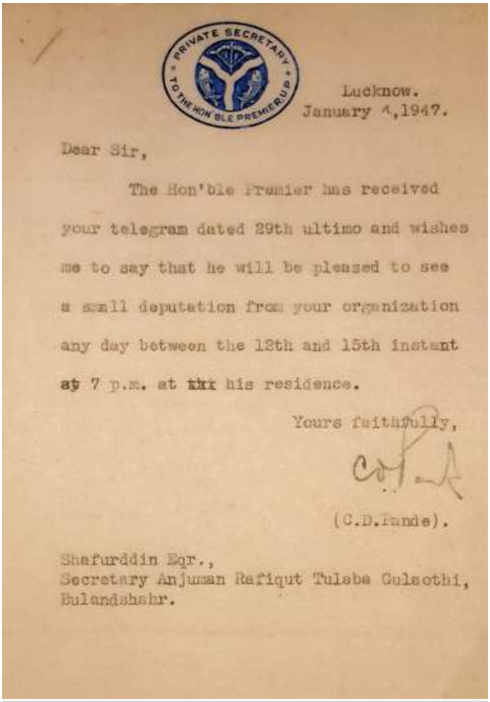
PRIVATE SECRETARY TO THE HON'BLE PREMIER U.P.

Lucknow.
January 4,1947.

Dear Sir,

The Hon'ble Premier has received your telegram dated 29th ultimo and wishes me to say that he will be pleased to see a small deputation from your organization any day between the 12th and 15th instant at 7 p.m. at his residence.

Yours faithfully,

(C.D.Pande).

Shafurddin Eqr.,
Secretary Anjuman Rafiqut Tulaba Gulaothi,
Bulandshahr.

وزیر اعلیٰ یوپی کا حافظ شفیع الدین کو لکھا ہوا خط

تیسرا باب

تذکرہ علمائے کرام واکابرین

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی

قاری طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ فراغت تحصیل کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مدرس رہے۔ فن حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد کئی بار حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں ترمذی اور بخاری کی سماعت فرمائی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم کے خاص ترجمان ہیں۔ فیض الباری، شرح صحیح بخاری آپ کی تالیفات کا شاہکار ہے۔ حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے خلیفہ مجاز حضرت قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا سلسلہ ارشاد ہدایت الحمدللہ وسیع ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کی اور ٹنڈ والہ یار کے مدرسہ میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا اور درس حدیث میں مشغول رہے۔ پھر پاکستان سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں انتقال ہوا۔ آپ کا سلسلہ بیعت وارشاد خصوصیت سے افریقہ میں بہت پھیلا۔ بکثرت افریقی آپ سے بیعت ہیں۔ زمانہ حج میں جو قافلے ایسٹ یا ساؤتھ افریقہ سے آتے وہ اکثر و بیشتر آپ کے سلسلہ بیعت میں داخل ہو کر واپس ہوتے۔ آپ کی تصنیف و تالیف میں ترجمان السنۃ علم حدیث میں ایک شاہکار تصنیف ہے جس میں اکابر دارالعلوم اور بالخصوص حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے علوم کو جمع کر کے خود اپنے علم اور علمی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہیں جو خواص و عوام میں مقبول ہیں۔

ماخوذ از (تاریخ دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆

شارح حدیث رسول حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنیؒ

سید محبوب حسن واسطی

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں ابھی درس حدیث سے فارغ ہو کر مدرسہ خیر المدارس ملتان میں اپنے رہائشی کمرے میں واپس آیا تھا کہ ایک سفید درویش متوسط قد بزرگ، دبلے پتلے، گورا رنگ، نورانی چہرہ ایک نوجوان کے ہمراہ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ادباً و احتراماً میں ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ تھے اپنے وقت کے عظیم محدث اور شارح اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم سہارنپور، دیوبند، ڈابھیل (سورت) بہاولنگر اور ٹنڈو اللہ یار کی علمی درس گاہوں کے مایہ ناز استاد، ندوۃ المصنفین دہلی کے عظیم دانشور و معروف مصنف اور مدینہ منورہ کے صاحب فیض بزرگ جن سے لاکھوں تشنگانِ معرفت و سلوک مستفیض ہوئے۔ یعنی حضرت مولانا سید بدر عالم اور ان کے صاحبزادے سید آفتاب احمد۔

ان حضرات سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور ان کے ہمراہ حدیث شریف کے میرے استاد اور مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ ابتدائی گفتگو سے حضرت مولانا کی ملتان آمد کا سبب معلوم ہوا کہ وہ اپنے صاحبزادے سید آفتاب احمد کو مدرسہ میں داخل کرانا چاہتے تھے اور مدرسہ کے منتظمین نے سید آفتاب احمد کو میرا شریک کمرہ بنایا تھا۔

مدرسہ خیر المدارس ملتان میں میرے تعلیمی ایام ۱۰/ شوال ۱۳۶۸ھ تا ۱۴/ شعبان ۱۳۶۹ھ تھے۔ میری ملتان آمد سے پیشتر میرے والد بزرگوار کی درخواست پر شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے میرے بارے میں ایک دستی مکتوب حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کے نام لکھ دیا تھا۔ اس مکتوب کے احترام کے پیش نظر حضرت مولانا خیر محمد نے مجھے قیام کے لیے مدرسہ کا سب سے عمدہ اور نفیس کمرہ عنایت فرمایا تھا۔ یہ کمرہ خوب روشن اور ہوادار تھا اور اب اسی کمرہ میں بحیثیت شریک سید آفتاب احمد کے قیام کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے دورہ حدیث اسی سال اس مدرسہ سے مکمل کیا جبکہ مجھے یاد ہے کہ سید آفتاب احمد دوران سال کسی بنا پر مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

حضرت مولانا بدر عالم سے اس پہلی ملاقات کے بعد بھی میں بعض دینی مجالس میں ان کا شریک صحبت رہا جس کے گہرے نقوش آج بھی میرے قلب پر نقش ہیں۔ ایک انتہائی پاکیزہ اور نفیس مزاج بزرگ بڑے خوش لباس، کوئی معمولی دھبہ بھی کبھی میں نے ان کے کپڑوں پر نہیں دیکھا۔ بے حد پاکیزہ گفتار، انتہائی شستہ زبان میں آہستہ آہستہ گفتگو فرماتے۔ بات کرتے تو ایسا لگتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ لہجہ میں بڑی شفقت تھی۔ دل موہ لیتے تھے۔ ساری عمر دین اسلام کی خدمت کی۔ خالق کائنات نے

شاید اسی صلہ میں جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جگہ دی اور جنت البقیع مدینہ منورہ میں قبر کے لیے جگہ ملی۔ حضرت مولانا بدر عالمؒ کی زندگی کو ہم چار ادوار پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1) ۱۳۳۶ھ تک تعلیمی دور

(2) ۱۳۳۷ھ کے بعد کا تدریسی و تصنیفی دور

(3) ۱۳۶۶ھ کے بعد کا قیام پاکستان کا تنظیمی وسیاسی دور

(4) ۱۳۷۲ھ کے بعد کا مدینہ منورہ کا فقر وسلوک اور فیض عام کا دور

حضرت مولانا کے والد بزرگوار حاجی تہور علی سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ تھے۔ سولہ سال کی عمر سے مرتے دم تک کبھی آپ کی تہجد کی نماز ناغہ نہیں ہوئی۔ دائم الذکر تھے۔ تلاوت کلام پاک اور اذکار میں مصروف رہتے۔ اپنی زندگی میں سات حج کیے۔ آپ کا تعلق موضع الدن ضلع میرٹھ سے تھا۔ (چنانچہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ میرٹھی لکھنا پسند فرمایا) اگرچہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے مگر تاعمر کبھی رشوت نہ لی۔ بدایوں میں تعینات تھے کہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ان کے یہاں علم ودانش کا یہ درخشاں آفتاب طلوع ہوا۔ یعنی حضرت مولانا بدر عالم پیدا ہوئے۔ دینی ماحول میں آپ کی تربیت ہوئی۔ ابتداً آپ نے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی تعلیم کے لیے الٰہ آباد کے ایک اسکول میں داخل ہوئے۔ ابھی میٹرک تک نہ پہنچے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے مولانا کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔

ایک دن نماز جمعہ کے لیے الٰہ آباد کی جامع مسجد میں تشریف لے گئے۔ اتفاقاً اس دن وہاں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ تھا۔ علوم دینیہ کی عظمت اور ان کے حصول کی فضیلت کا یہ وعظ اتنا پراثر اور سحر انگیز تھا کہ اس گیارہ سالہ بچے کے دل کی گہرائیوں میں اترا اور اس کی آئندہ زندگی کے لیے ایک اہم موڑ بن گیا۔ مسجد سے گھر آئے تو بدر عالم بدلے بدلے سے تھے۔ انگریزی تعلیم سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا اور ہر دم یہی فکر دامن گیر ہوگئی کہ مجھے دینی علوم حاصل کرنا اور دین اسلام کا خادم بننا ہے۔

بدر عالم کا یہ پختہ عزم دیکھ کر باپ نے اسے تقدیر الٰہی تصور کیا اور سہارن پور کے عظیم محدث حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مہاجر مدنیؒ کو اس سلسلے میں ایک تفصیلی خط لکھا اور ان کے مشورے پر انہیں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل کر دیا گیا جہاں شب وروز آٹھ سال محنت کے بعد ۱۳۳۶ھ میں ۲۰ سال کی عمر میں حضرت مولانا بدر عالم فارغ التحصیل ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے ایک سال بعد آپ ۱۳۳۷ھ میں سہارن پور میں ہی مدرس مقرر ہوئے۔ ابھی اس تقرری کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ کو دار العلوم دیوبند جا کر مزید دینی علوم کی تحصیل اور مکرر دورۂ حدیث کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۳۳۹ھ میں آپ نے دار العلوم دیوبند میں امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، امام الفقہاء وصدر مفتی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور عارف کامل، ماہر علوم حدیث حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ سے حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں اور سند فراغت لی۔ پھر ۱۳۴۰ھ میں یہیں مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ اساتذۂ حدیث میں آپ کی شخصیت پر سب سے زیادہ گہرے

نقوش حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے تھے جن سے آپ نے حدیث شریف کی کتابیں صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھی تھیں۔ تین سال مسلسل سماع حدیث کے بعد ۶/ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ کو حضرت علامہ کشمیریؒ نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی سند آپ کو عنایت فرمائی۔ حضرت مولانا بدر عالم اس سند حدیث کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں۔

''تین سال یہ جو سند حدیث میں مذکور ہوئے اور سات سال مزید، اس طرح میں کل دس سال امام العصر حضرت علامہ کی خدمت میں رہا (پھر از راہ انکسار فرماتے ہیں) کوئی دوسرا اتنی مدت اس عظیم استاد حدیث کے ساتھ رہتا تو اس کا سینہ علم وحکمت سے بھر جاتا لیکن میں تو ایک بنجر زمین کی طرح تھا جس میں نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ گھاس اگتی ہے۔''

دار العلوم دیوبند میں تقریبا چوالیس (۴۴) سال دینی علوم کی خدمت کے بعد ۲۹/ شوال ۱۳۳۳ھ کو جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) دوسری بار زیارت حرمین شریفین کے لئے حجاز مقدس روانہ ہوئے اور یہ تاثر عام ہوا کہ اب آئندہ شاید دار العلوم دیوبند آپ کی تدریسی خدمات سے محروم رہے تو ان کے لائق شاگرد امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بحیثیت قائم مقام مدرس ان کی جگہ لی اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس سنبھالا۔ ۱۳۴۵ھ تک آپ دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت صدر مدرس درس حدیث دیتے رہے۔ پھر مدرسہ کے بعض منتظمین سے اختلاف کی بناء پر آپ ۱۳۴۶ھ میں اپنے بعض رفقاء کے ہمراہ حدیث شریف کی خدمت کے لیے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔ آپ کے جن تلامذہ ورفقاء نے آپ کے ساتھ دیوبند سے ڈابھیل جانا پسند کیا ان میں حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی، مولانا سراج احمد دیوبندی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ شامل تھے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا بدر عالم سترہ سال حدیث شریف کی خدمت میں مصروف رہے۔ یہاں کے قیام میں حضرت کو علوم حدیث میں گہری نصرت حاصل ہوئی۔ یہیں آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے استاد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے بخاری شریف کے درس کے دوران آپ نے جن علوم کا استفادہ کیا ہے اور جو تشریحات وتوضیحات قلم بند کی ہیں انہیں ایک کتابی شکل دی جائے چنانچہ سخت کاوش اور محنت کے بعد آپ نے عربی زبان میں تقریباً دو ہزار صفحات تحریر فرمائے اور چار ضخیم جلدوں میں یہ کتاب ''فیض الباری علی صحیح البخاری'' کے نام سے ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں مصر سے طبع ہوئی۔

ڈابھیل (سورت) میں سترہ سال تدریس حدیث کے بعد آپ بہاول نگر تشریف لے گئے وہاں جامع العلوم بہاول نگر کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور تقریباً ایک سال وہاں قیام فرمایا۔ جب یہ ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تو پھر سے آپ نے خدمت حدیث کے لیے کمر باندھی۔ عربی زبان کے ذریعے خدمت حدیث کے بعد اب آپ میں اردو زبان میں حدیث شریف کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا اور یہی جذبہ ۱۳۶۲ھ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چار جلدوں میں تشریحات احادیث کی اردو زبان میں آپ کی خوبصورت ترین کتاب ''ترجمان السنۃ'' کی تالیف کی داغ بیل یہیں پڑی۔ حضرت مولانا بدر عالم کے پاکستان تشریف لانے سے پیشتر اس عظیم کتاب کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ دوسری جلد کا کچھ مسودہ مکمل ہوگیا تھا کہ تقسیم ہند کا مرحلہ پیش آ گیا۔ اب پاکستان سے اس کتاب کی چاروں جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

مولانا بدر عالم قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہاں تشریف لے آئے تھے۔ یہاں تشریف آوری کے بعد آپ کو نت نئے مسائل کا سامنا تھا۔ یہ مسائل علمی نوعیت کے بھی تھے اور عوامی وسیاسی نوعیت کے بھی۔ مثلاً پاکستان میں دینی مدارس اور تحقیقی، دینی کتب پر مشتمل لائبریریوں کا فقدان تھا اور اسی لیے ابتداءً یہاں علمی و تحقیقی کام بہت مشکل تھا۔ ساتھ ہی بعض ایسے عوامی اور سیاسی مسائل تھے جن سے آپ چشم پوشی یا کنارہ کشی نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ پاکستان میں موجود آپ کے استاذ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور رفقاء مثلاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ وغیرہ ان عوامی اور سیاسی کاموں میں مصروف تھے۔ پاکستان کے صحت مند دینی مستقبل کے لیے مندرجہ ذیل عوامی وسیاسی کام بے حد اہم تھے۔

(۱) زعماء مسلم لیگ کی اصلاح

(۲) سرحد کے ریفرنڈم میں کامیابی کے لیے سعی

(۳) پاکستان میں دینی مدارس کا قیام

(۴) جمعیت علماء اسلام پاکستان کی تشکیل اور اس کے استحکام کے لیے مختلف شہروں کے دورے

(۵) کشمیر کی جدوجہد آزادی

(۶) پاکستان میں اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے مساعی

(۷) تحریک ختم نبوت اور رد قادیانیت کی کوشش

(۸) اسکولوں، کالجوں وغیرہ میں دینی تعلیم کے لیے جدوجہد

(۹) قرارداد مقاصد کی ترتیب وتدوین وغیرہ۔

مولانا بدر عالم نے ہجرت مدینہ سے قبل قیامِ پاکستان کے دوران دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر ان میں سے بعض اہم میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہر مکتبہ فکر کے جید علماء کا جو اجلاس منعقد ہوا اور جس کے نتیجہ میں ۲۲/ نکات پر مشتمل اسلامی دستور کا خاکہ حکومت پاکستان کو پیش کیا گیا۔ حضرت مولانا بدر عالم اس میں موجود تھے۔ تحریک ختم نبوت اور رد قادیانیت کے سلسلے میں بھی آپ نے پاکستان کے مختلف شہروں کے دورے کیے اور گراں پایہ خدمات انجام دیں۔

مولانا بدر عالم کی زندگی کا چوتھا اہم دور آپ کے ۱۳۷۲ھ بمطابق ۱۹۵۳ء میں مدینہ منورہ کی ہجرت سے شروع ہو کر ۱۳۸۵ھ بمطابق ۱۹۶۵ء میں آپ کے وصال مبارک تک تیرہ سالہ دور ہے۔ اسی دور میں فقر وسلوک بھی ہے اور اہل اللہ کا آپ کی طرف رجوع بھی، علمی تبحر بھی ہے۔ مخلوق خدا کو نفع رسانی کا بے پناہ جذبہ بھی بیماری اور تکلیفیں بھی ہیں اور حصول رضا الٰہی کے لیے ان پر صبر بھی، شریعت وطریقت بھی ہے اور حقیقت ومعرفت بھی۔ روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب بھی ہے اور ذکر الٰہی کی طمانیت بھی۔

تالیفات: ابتدائی تالیفات میں مولانا بدر عالم کا اسلوب نگارش پرشکوہ اور ادیبانہ ہے اور انتخاب موضوعات کے سلسلے

میں آپ کا میلان طبع دقیق علمی تحقیقات کی طرف لیکن بعد کی تالیفات میں انتہائی سادگی آ گئی ہے۔ موضوعات نسبتاً زیادہ عملی اور مفید خلائق اور انداز نگارش اور دل نشیں ہو گیا ہے۔ آپ کی بعض اہم تالیفات یہ ہیں:

(۱) فیض الباری علی صحیح البخاری (عربی) مطبوعہ مصر چار جلدوں میں

(۲) ترجمان السنۃ (اردو) مطبوعہ ہند و مطبوعہ پاکستان چار جلدوں میں

(۳) جواہر الحکم (اردو) 3 حصوں میں

(۴) نزول عیسیٰ علیہ السلام

(۵) خلاصہ زبدۃ المناسک

(۶) آواز حق

(۷) ترجمہ الحزب الاعظم

(۸) شان حضور

(۹) قسمت کا ستارہ

(۱۰) محجوب الارث

(۱۱) نصیحت نامہ

وصال: آخر عمر میں دینی جذبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ بستر علالت پر کتاب کا املا کرایا کرتے تھے اور بیماری کی حالت میں ۱۴/ گھنٹہ یومیہ کام کرتے تھے۔ پورے چار سال صاحب فراش رہے مگر صبر و شکر اور رضا بالقضا کا پیکر، قبر کے لیے تمنا تھی کہ جنت البقیع مدینہ منورہ میں امہات المؤمنین کے عین قدموں میں جگہ ملے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اسے پورا کیا۔ شب جمعہ ۵/ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو اپنے پروردگار حقیقی سے جا ملے۔ ناصر علی وجدی نے ارتحال قدسی صفات (۱۳۸۵ھ) سے تاریخ نکالی۔

باغ جہاں سے سوئے خلد بریں گئے وہ
خلق خدا کے حق میں تھے رحمت خدا جو
تاریخ رحلت ان کی پوچھے جو کوئی تم سے
وجدی تم ارتحال قدسی صفات کہہ دو

☆☆☆

۱۳۸۵ھ

مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ

(ہم عصر اکابرین کے تاثرات)

رئیس المحدثین قطب العارفین حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ کی وفات حسرت آیات پر آپ کے ہم عصر علماء اور مشاہیر امت نے آپ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا، جن میں صرف چند اکابر علماء کے مختصر تاثرات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ آپ کی شخصی عظمت اور علمی وعملی مقام کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے۔

ا۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ: میرے رفیق قدیم حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی پچھلے دنوں مدینہ منورہ میں رحلت فرما گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) حق تعالیٰ انہیں اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازے، بڑے خوش نصیب تھے کہ جنت البقیع کی خاک مقدس نصیب ہوئی۔ میرا اور ان کا تعلق تقریباً نصف صدی تک قائم رہا ہے۔ ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہوکر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے اور حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر دورۂ حدیث شریف پڑھا تھا اور پھر ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس پر مامور ہوئے۔ اسی سال مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور احقر کو دارالعلوم دیوبند میں خدمت تدریس پر مقرر کیا گیا۔ ہم تینوں اس وقت کے نوعمر بچے تھے جن کو اکابر اساتذہ کی خدمت میں رہ کر تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دینے کا موقعہ ملا۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند ائمہ فن، اتقیاء اور اولیاء کا ایک بے مثال گہوارہ تھا۔ کسی شخص پر ان حضرات کی توجہ اور نظر عنایت ہوجانا بلاشبہ حق تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہوتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اکابر دیوبند کی خاص نظر عنایت نے ہم تینوں کو ایسا مخلص رفیق بنادیا تھا کہ نہ کبھی کوئی معاصرانہ چشمک درمیان میں آئی نہ کوئی شکوہ شکایت۔ پاکستان بننے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ہم تینوں کو پاکستان میں جمع کردیا اور مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ میرے پاکستان میں مستقل قیام کا سبب مولانا سید بدر عالم صاحب تھے، احقر شروع میں جب پاکستان آیا تو ہجرت کی نیت سے نہیں بلکہ ایک کام دستور اسلامی کے سلسلہ میں انجام دینے کے لئے آیا تھا۔ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ میں ہمارا وہ کام پورا ہوگیا تو میرا ارادہ واپس ہندوستان جانے کا تھا۔ مولانا بدر عالم گورا قبرستان سے میری رہائش گاہ وکٹوریہ روڈ پر پیدل چل کر اس لئے تشریف لائے کہ مجھے پاکستان میں مستقل قیام کے لئے تاکید کریں کیونکہ ان کی نظر میں اس وقت میرا قیام پاکستان کے لئے ضروری تھا۔ مولانا بدر عالم ایک بڑے عالم محدث اور محقق تھے، بہت سی کتابیں انہوں نے اہل علم کے لئے یادگار چھوڑیں جن میں فیض الباری، ترجمان السنۃ، اور جواہر الحکم خاص علمی شاہکار ہیں۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، حق تعالیٰ ان کی دینی علمی اور تبلیغی واصلاحی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ ''ماہنامہ البلاغ کراچی''

۲۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ: حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ کی وفات کی خبر سن کر دل کو ازحد رنج وقلق ہوا۔وہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ہمارا اوران کا بہت قریبی تعلق تھا،فن حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ تھا۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی کئی بار حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں ترمذی اور بخاری کی تلاوت فرمائی۔آپ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے خاص ترجمان تھے۔فیض الباری شرح بخاری آپ کی تالیفات کا عظیم شاہکار رہے۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے جس مایہ ناز فرزند نے مسجد نبوی میں قرآن وحدیث کا درس دینا شروع کیا وہ مولانا سید بدر عالم میرٹھی کی ذات گرامی ہے۔درِرسول پر بیٹھ کر حدیث رسول پڑھانے کا جو شرف اوراعزاز حضرت مولانا مدنی قدس سرہ اور حضرت مولانا بدر عالم کو حاصل ہوا وہ کسی کسی کو ہی نصیب ہوسکتا ہے۔زہے نصیب۔بارہ تیرہ سال مسجد نبوی میں روضۂ رسول کے سامنے حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے علوم قرآن وحدیث کی جو شمع روشن کی،یہ ایک بہت بڑی سعادت اور بہت بڑا اعزاز ہے۔

۱۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲۔ تاثرات ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

۳۔استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ: حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ کے وصال کی خبر سے بڑا دکھ ہوا۔وہ ہمارے نہایت مہربان شفیق دوست تھے۔اپنے زمانہ کے جید عالم دین،عظیم محدث،فقیہ اور عارف تھے۔دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فضلاء میں سے تھے،اور امام المحدثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے علوم ومعارف کے امین اور ترجمان تھے۔متانت اور وقار کا پہاڑ اور صبر وتحمل اور بردباری کا پیکر تھے۔نہایت نفیس الطبع اور نفیس روح تھے۔علم وتقوی کا مجسمہ اور تواضع وانکساری میں بے نظیر تھے۔زندگی بھر علم حدیث کی خدمت میں مصروف رہے۔علم وحکمت آپ کا زیور اور حیاء وشرافت آپ کا لباس رہا۔آپ کی حیات مستعار تدریس وتبلیغ اور ارشاد وہدایت میں بسر ہوئی۔اللہ حضرت مرحوم کو درجات عالیہ نصیب فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

روزنامہ ''امروز،ملتان''

۴۔محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ: آہ حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ مہاجر مدنی ۵/ رجب ۱۳۸۵ھ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۶۵ء یوم جمعہ کو مدینہ طیبہ میں واصل بحق ہوگئے (اناللہ وانا اللہ وانا راجعون) مولانا بدر عالم صاحبؒ ان ممتاز علماء میں سے تھے جن کی بدولت علم دین کی ساکھ قائم ہے۔جن سے مدرسے آباد ہیں،منبر بارونق ہیں،آپ قابل ترین مدرس،فاضل مقرر،کامیاب ومقبول مصنف تھے۔اردو،عربی کے ادیب وشاعر تھے،مؤثر اسلوب،شگفتہ طرز ادا کے مالک تھے،اپنے وقت کے جید عالم دین اور شیخ کامل تھے۔حیات طیبہ کے آخری لمحات وانفاس میں سید الانبیاء رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار مقدس میں قیام کی تمنا پوری ہوگئی۔عرصہ سے مدینہ منورہ کی سکونت کی آرزو دل میں موجزن تھی اور نہایت ہی والہانہ انداز میں مدینہ کی ہجرت کا سودا دماغ میں سمایا ہوا تھا،چنانچہ البدء الباری تعلیقات فیض الباری میں انتہائی والہانہ اور رقت انگیز انداز میں اس آرزو کا اظہار کیا،جو رب العرش العظیم کی بارگاہ سے شرف قبولیت کے ساتھ سرفرازی ہوئی اور نالہ ہائے سحری رنگ لائی اور جوار حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنائے تصور سے بااثر طریقے پر واقعہ کی صورت اختیار کرگئی۔الغرض ذوق وجدان بصیرت وعرفان،علم وعمل،ورع وتقوی کا یہ پیکر

نوری تقریر وتحریر کے کمال کا حامل اور ظرافت وشگفتگی کا مظہر اپنی باوقار شخصیت کے ساتھ اپنے احباب واقرباء، مخلصین سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خادمِ علم دین کو اپنی بیکرانی رحمت سے نوازے اور جنت الفردوس میں رضوان الٰہی سے سرفراز فرمائے آمین۔ ماہنامہ ''بینات، کراچی''

۵۔**خطیب الامت حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ:** حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ مہاجر مدنی صاحبؒ کی وفات حسرت آیات، ہم سب کے لئے ایک حادثۂ عظیم اور خاجعہ الیم ہے، آج بلا مبالغہ آپ کے ہزاروں شاگرد برصغیر ہندوپاک کے علاوہ پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں، جو آپ کی روحانی اولادیں ہیں اور ہزاروں معتقدین، مسالکین اور محبین جن کے لئے حضرت مولاناؒ کا وجود باوجود اوران کی زیارت وملاقات دل کی دنیا لئے روشنی طمانیت اور بہار کا سامان تھا، وہ سب آج سوگوار ہیں۔ مولانا مرحوم کی وفات سے علمی، دینی حلقوں میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ عرب وعجم کے شیخ کامل اور ایک عظیم محدث ومدرس تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ نصیب فرمائے اوران کے پسماندگان، متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین روزنامہ ''جنگ، کراچی''

بشکریہ: سیرت بدر عالمؒ، تالیف حافظ محمد اکبر شاہ بخاری غفرلہ مؤلف ''تذکرہ اکابر علماء دیوبند، سیرت عثمانی مفتی اعظم پاکستان، خطیب الامت اور سیرت خلیل وغیرہ

☆☆☆

نعت شریف

مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ (مہاجر مدنی)

ہر جلوہ پر ضیاءِ رخِ انور کا نور ہے
شانوں میں کیا بلند یہ شانِ حضورؐ ہے
جو جلوہ ہے وہ رشکِ تماشائے طور ہے
واللہ کیا بلند یہ شانِ حضورؐ ہے
مکہ کے تاجدار مدینہ کے حکمراں
عالم کے رہنما ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
بے چین دل کا چین ہیں آنکھوں کا نور ہیں
منزل ہیں عاشقوں کی یہ شانِ حضورؐ ہے
عفو و کرم کا ابر ہیں بخشش کی ہیں گھٹا
بارش ہیں رحمتوں کی یہ شانِ حضورؐ ہے
بحرِ سخا ہیں اور سمندر ہیں جود کا
لطف وکرم کی موج ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
شافع ہیں روزِ حشر کے سب کے پیشوا
محبوب کبریا ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
مرکز ہیں دائرہ کے یکتائے روزگار
بے مثل و بے نظیر یہ شانِ حضورؐ ہے
مخزن ہیں حکمتوں کے ہدایت کے آفتاب
خاتم ہیں انبیاء کے یہ شانِ حضورؐ ہے
ضرب المثل ہیں حلم میں کوہِ وقار ہیں
انسانیت کے تاج یہ شانِ حضورؐ ہے
وعدے کے کیسے پکے صدوق وامین بھی
اخلاق کیا شگفتہ یہ شانِ حضورؐ ہے
بارعب بھی کمال کے اس پر وہ مہرباں
سب میں گھلے ملے ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
حسن وادا غضب کے تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ
شمس و قمر ہیں ماند یہ شانِ حضورؐ ہے
خود نازنیں ہیں اس پر جفائیں جہان کی
کس شوق سے اٹھائیں یہ شانِ حضورؐ ہے
سب پر حریص اور رؤف و رحیم ہیں
سب میں عزیز تر ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
حاصل ہے زندگی کا اک ان کا وجودِ پاک
جیسے ثمر شجر کا یہ شانِ حضورؐ ہے
منشا ہیں خلق وامر کا مبدا ہیں منتہی
منبع وجود کا ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے
قرآن نے خود ہی آپ کو پیارا لقب دیا
سب نے کہا کہ خوب یہ شانِ حضورؐ ہے
ساقی ہیں صرف آپ ہی کوثر کے روز حشر
سب کو بُلا بُلا کر یہ شانِ حضورؐ ہے
کیا کیا لکھوں صفات کو ہر شان ہے نئی
لکھ لکھ کے تھک رہا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے
مجھ سیاہ رو کی جو بخشش بھی ہوگئی
یہ شانِ مغفرت ہے یہ شانِ حضورؐ ہے
میں نعت کیا کہوں گا کہ عاصی ہوں شرمسار
جو کچھ بھی کہہ گیا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے
ہر چند خستہ حال ہوں درماندہ اور تباہ
اس پر بھی مطمئن ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے
جز ناز ان کے در کا میرے پاس کچھ نہیں
خدمت میں اپنی رکھ کے یہ شانِ حضورؐ ہے
مہمانِ بے نوا کو معزز بنالیا
اک آسرا یہی ہے یہ شانِ حضورؐ ہے

نسبت ہے ایک شیخ سے جن کے طفیل ہے
مجھ کو بسالیا ہے، یہ شانِ حضورؐ ہے

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

سید رضی الدین ہاشمی

مولانا سید فخر الدین احمد کا تعلق ہاپوڑ کے مدرسہ سادات کے ممتاز خانوادہ سے تھا۔ آپ کے دادا سید عبدالکریم پولیس میں تھانیدار کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ کے بزرگ سید عالم اور سید قطب اپنے دو بھائیوں کے ساتھ شاہجہاں کے دور میں ہرات سے دہلی آئے تھے۔ بادشاہ نے ہاپوڑ کا یہ مشہور مدرسہ انہی دو بزرگوں کی قیادت میں دینی تعلیم کے فروغ کے لئے تعمیر کیا تھا، مسجد اور مدرسہ کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ میرے نانا سید شرف الدین مولانا کے قریبی عزیز تھے اور مدرسہ سادات میں ان کے آبائی گھر کے پڑوسی بھی، میرے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ میں نے مولانا کو نہ صرف دیکھا، ملاقات کی بلکہ انکے خاندان کے کئی افراد سے ملاقات بھی رہی ہے۔ مولانا خود کئی دفعہ گلاؤٹھی تشریف لائے۔ پچاس سال قبل کی یہ ملاقاتیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مولانا کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں اجمیر میں ہوئی۔ ان کی تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی، ابتدائی تعلیم خاندانی بزرگوں سے اسی مشہور زمانہ مدرسہ سادات سے حاصل کی۔ والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ انکو گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم بھیج دیا جائے جو اس وقت دینی تعلیم ایک اعلی مرکز تھا۔ اسی مدرسہ میں اپنے دور کی ایک مایہ ناز شخصیت اور نابغۂ روزگار استاذ حضرت مولانا ماجد علی جونپوری آپ کے معلم اور سرپرست تھے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر محسوس ہوتا ہے کہ میرا خاندان اس مدرسہ کا متولی اور مہتمم رہا ہے، میرے جدِ امجد سید نجم الدین اور انکے بعد مولانا سید محی الدین اور انکے صاحبزادہ سید حمید الدین اور انکے وارثان پچھلے ڈیڑھ سو سال سے اس مدرسہ کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ اس مدرسہ کو بھی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانئ دارالعلوم دیوبند) نے ۱۲۸۷ھ ہجری میں قائم فرمایا تھا۔ مولانا محترم گلاؤٹھی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا ماجد علی جونپوری کے ہمراہ دہلی کے مدرسہ میں زیر تعلیم رہے، اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند روانہ ہوئے جہاں داخلہ کے لئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا امتحان لیا۔ اس امتحان کو انہوں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور یوں ان کی دیوبند کی اعلی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں ہی سائنس شعبہ میں طلباء کو درس کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۹۱۰ء سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ دارالعلوم میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ اپنے اساتذہ کے اصرار پر ۱۹۱۱ء میں مولانا فخر الدین صاحب مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد تشریف لے گئے اور ۱۹۲۱ء میں مولانا صدر مدرس کے مقام پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۴ء حضرت مولانا مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے انتقال کے بعد مولانا دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں شیخ الحدیث

مقرر ہوئے، مدرسہ قاسمیہ بھی مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک پر قائم ہوا تھا۔مولانا مدنی اس کی شوری کے ممبر رہے ہیں۔حضرت مولانا محمود احمد سرحدی اسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا۔۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ العلماء نے بحیثیت مدرس مدرسہ شاہی میں کام کا آغاز کیا، ۱۸۹۷ء میں مولانا قاضی محمد حسن گلاؤٹھی سے تشریف لائے اور مسند تدریس پر فائز رہے۔

حضرت شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید انور شاہ کشمیری کے وہ لائق ترین شاگرد تھے اور حدیث کے استاد کی حیثیت سے انہی دو بزرگوں کا رنگ ان پر غالب رہا۔ان کے بخاری پر درس بڑے بڑے مفصل اور علمیت سے لبریز سمجھے جاتے تھے۔فقہ کی تعلیم پر ان کے تقابلی دلائل بڑے ٹھوس اور زوردار سمجھے جاتے تھے، صحیح بخاری پڑھانے کے دوران ان کی علمیت سے سننے والے نہ صرف مرعوب ہوتے بلکہ علمی تجسس کی جس طرح وہ تشفی کرتے اس کا اندازہ صرف انکے اس دور کے شاگرد ہی کر سکتے ہیں۔وہ یقیناً اپنے وقت کے حدیث کی تعلیم کے ممتاز ترین اساتذہ میں سے تھے اور طلباء ان کے شاگرد ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔

۱۹۵۷ء میں مولانا مدنیؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری نے انہیں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے مرتبہ پر فائز کیا۔

تعلیمی سرگرمیوں سے ہٹ کر وہ ہندوستان کے قومی وسیاسی افق پر اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے۔مولانا حسین احمد مدنی کی جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت کے دوران آپ نے نائب صدر کے طور پر خدمات بھی انجام دیں، اور انکے بعد جمعیۃ کے صدر کے طور پر اپنی آخری سانس تک علمائے ہند کی اس جماعت کے سربراہ رہے۔

عمر کے آخری حصہ میں خرابی صحت کے پیش نظر تبدیلی آب وہوا کی خاطر آپ کو مراد آباد لایا گیا اور آخر کار اپریل ۱۹۷۲ء کو علم کا یہ سورج غروب ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا قاری طیب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس طرح عالم اسلام کا یہ روشن ستارہ سرزمین مراد آباد میں مدفون ہوا اور صحیح بخاری کے دو عظیم استاذوں کی ساٹھ سالہ خدمات کا اختتام ہوا۔

کل نفس ذائقة الموت

مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا فخر الدین کے ہزاروں شاگرد صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ یورپ امریکہ کی درسگاہ میں صحیح بخاری کے لاکھوں طلباء کو فیض پہنچا چکے ہیں۔جمعیۃ العلماء ہند کے موجودہ صدر مولانا سید ارشد مدنی بھی مولانا ہی کے شاگرد ہیں۔

☆☆☆

مولانا سید محمد اصلح الحسینی (مرحوم)

مولانا سید محمد اصلح الحسینی

صوفیہ عفیفہ الحسینی

گلاؤٹھی ضلع بلندشہر (یوپی) کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ بعض تاریخی شواہد کی بنا پر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے دوران آباد ہونا شروع ہوا۔ یہاں کے بعض خاندانوں کی تاریخی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں ان کی بعض سربرآوردہ شخصیات کو شاہی جاگیروں اور اعلی سرکاری عہدوں سے نوازا گیا۔ قدیم زمانہ ہی سے نواح دہلی کا یہ مردم خیز خطہ ممتاز علماء، ادباء، شعراء اور دانشوروں کی آماجگاہ رہا ہے اور قصبہ گلاؤٹھی اور اسکی نواحی بستیوں مثلاً سینٹھ، گٹھاؤلی اور مالاگڑھ کی بعض ممتاز شخصیات نے شہرت واعتبار کا ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

مولانا سید محمد اصلح الحسینی ۲۵/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو سادات گلاؤٹھی کے ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی حکیم سید محمد صالح اس قصبے کی ممتاز شخصیت تھے جنہوں نے دینی تعلیم مقامی دینی مدرسے ''منبع العلوم'' میں حاصل کی تھی۔ یہ مدرسہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دارالعلوم دیوبند سے تقریباً ۴ سال بعد ۱۲۸۷ھ میں قائم کیا گیا تھا۔ آپ کے والد صوفی محمد حسن نقشبندی اس مدرسے کے پہلے مہتمم اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نہایت قریبی عزیز پیر جی عبداللہؒ اس کے پہلے صدر مدرس تھے۔ حکیم صاحب موصوف قدیم شاہی فرامین اور اعلی علمی اور روحانی وابستگیوں کی وجہ سے ریاست حیدرآباد اور ریاست بھوپال کے وثیقہ دار تھے اور اس قصبے میں بلا معاوضہ طبی خدمات انجام دیتے تھے۔

مولانا سید اصلح الحسینی نے بھی اسی عربی مدرسے (منبع العلوم) میں اپنی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کر کے امتیاز کے ساتھ سندِ فضیلت حاصل کی۔ تحصیل علوم کے اس زمانے میں آپ کو عالم اسلامی کے مشہور اور ممتاز علماء شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (شیخ الحدیث) مولانا ابراہیم بلیاوی اور مولانا رسول خان صاحب جیسے اساتذہ علوم عقلیہ اور مولانا اعزاز علی صاحب جیسے استاذ فقہ وادب کی خصوصی توجہ سے علمی وروحانی فیوض حاصل کرنے کا شرف رہا۔ دارالعلوم دیوبند کے بعد پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹی سے مشرقی علوم کے اعلی امتحانات خصوصی امتیازات کے ساتھ پاس کئے۔ اسی دوران کچھ عرصہ آپ نے بھوپال میں قیام کیا اور ریاست کے قاضی مولانا محمد حسن مرادآبادی کے زیر تربیت فقہ اسلامی میں تخصص پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور قاضی صاحب موصوف کی اس خصوصی توجہ کی وجہ سے نواب حمید اللہ خان مرحوم نے بھوپال کی شرعی عدالت عالیہ (مجلس علماء) کے رکن کے منصب پر فائز کیا۔ مولانا اصلح الحسینی کو ابتداء سے ہی سیاسیات میں دلچسپی تھی جو انہیں وراثت میں ملی تھی ۔ان کے والد کے دادا میر عنایت علی مرحوم کو ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان

کے روحانی رشتوں کے سلسلے میں بھی ان کے دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے مرید مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جہاد آزادی کے سلسلے میں مصائب ومشکلات کا نشانہ بنے تھے (جن کی الگ مفصل تاریخ ہے) اسی تسلسل میں ۲۲۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں پچھلی صف کے معاون ومددگار کی حیثیت سے ان کو بھی مصائب ومشکلات پیش آئیں اور ۲۰ جون ۱۹۲۲ء کو جرمنی اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ خفیہ روابط کے شبہ میں ان کے مکان پر چھاپہ پڑا تھا۔

اس پس منظر کے نتیجے میں مولانا سید اصلح الحسینی نے ۳۲۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں حصہ لیا اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے جولائی ۱۹۳۳ء میں مولانا عبدالحلیم صدیقی کی رہنمائی میں نکلنے والے ایک جلوس میں گرفتار ہوئے اور سزایاب ہوکر لاہور بورسٹل جیل سے اسی سال دسمبر میں رہا ہوئے۔اسی سیاسی جدوجہد اور کم عمری کی بنا پر بھوپال کی مجلس قانون ساز میں ایک ہندو مہاسبھائی لیڈر راجہ اودھ نرائن نے مجلس علماء کے اس پُر وقار منصب پر اعتراض اٹھایا اور وزیر امور مذہبی سردار مسعود نے جو اس زمانے میں بھوپال میں ریاست کے وزیر تھے، آپ کے تقرر کے احکامات واپس لینے کی سفارش کی لہذا والی ریاست کی طرف سے احکام تقرر واپس لینے کی وجہ سے آپ بددل ہوکر واپس دہلی آگئے۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ نے مولانا احمد سعید (ناظم جمعیۃ علمائے ہند) اور مولانا حفظ الرحمٰن ومفتی عتیق الرحمٰن کی ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی میں ترجمہ وتالیف کی خدمات انجام دیں۔اسی دوران ''الجمعیۃ'' دہلی کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہوئے اور صدر جمعیۃ علمائے ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم جمعیۃ کی رہنمائی میں جولائی ۱۹۳۹ء تک صحافتی وادارتی خدمات انجام دیتے رہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہونے والی تھی، اس ضمن میں ہندوستان میں تحریک آزادی کے خلاف پیش بندیوں کے طور پر جمعیۃ علمائے ہند کے اخبار ''الجمعیت'' سے ایک بھاری ضمانت طلب کی گئی جس کے نتیجے میں اخبار بند ہوگیا تو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار نے جو جمعیۃ علمائے ہند کے اہم مرکزی رہنماؤں میں سے تھے۔آپ کو Independent Party Bihar کے ترجمان اخبار الہلال کی ادارت کے عہدہ کے لئے منتخب فرمایا اور آپ دہلی سے پٹنہ (بہار) چلے گئے۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے ''زم زم'' لاہور اور ''المدینہ'' بجنور اخبارات کے ادارہ تحریر سے وابستہ رہے۔اس دوران آپ کی ملاقات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی ہوئی، ان سے قریبی تعلق رہا اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کے مواقع ملے۔مولانا احمد علی لاہوری بھی جو مشہور روحانی پیر اور مفسر تھے، ان سے روحانی فیض حاصل ہوا۔لاہور قیام کے دوران مولانا آزاد سے ایک طویل ملاقات کے دوران مسلم ہندوستان کی سیاست کے بارے میں کافی مفصل گفتگو رہی اور مسلم سیاست اور روایات سے استفادہ کا موقع ملا۔

کچھ عرصے بعد صحافت سے دست کش ہوکر آپ تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں مصروف رہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ نے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تدریس میں ملازمت اختیار کی اور اس کے ساتھ ہی بعض تصنیف وتالیف کے اداروں کے لئے مختلف کتابوں کے ترجمے اور تالیف کی خدمات انجام دیتے رہے۔

ان تمام علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست سے ان کی دلچسپی برقرار رہی اور جمعیۃ علمائے ہند اور صوبہ (یوپی) کے

رکن کی حیثیت سے اور دیگر مختلف حیثیتوں میں اہم ذمہ داریاں انجام دیتے رہے اور ۴۸۔۱۹۳۹ء کے درمیانی عرصے تک ان کے علمی وسیاسی مشاغل برقرار رہے۔ان علمی وسیاسی مشاغل کے دوران انہیں بین الاقوامی اور عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیات کے قریب رہنے اور ان کو سمجھنے کا موقع ملا۔آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی جلسوں میں شرکت کی اور آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان آئے اور اپنے تمام سیاسی مشاغل کو ترک کر کے خالص علمی و دینی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ایک مختصر عرصے کے لئے آپ نے کراچی کے ایک مشہور ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی اور چند ہی مہینہ بعد حکومتی نشریاتی ادارے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوگئے اور یہاں سے آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور مختلف زبانوں پر عبور کی وجہ سے خارجی نشریات کی بہت سی اہم ذمہ داریاں آپ کو سونپی گئیں لیکن ملکی نشریات میں بھی تفسیر قرآن اور قرآن ہماری زندگی کے موضوعات پر جو نشری خدمات انجام دی ہیں، وہ علمی حلقوں میں نہایت قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں جس کا سلسلہ نشریاتی اداروں سے یعنی ریڈیو، ٹی وی سے اب تک جاری ہے۔

علمی و دینی خدمات کے سلسلے میں اندرون ملک اور بیرون ملک دوروں کا بھی اتفاق ہوا، اور مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ کو محدث کبیر مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (مولف فیض الباری شرح جامع بخاری) سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔مولانا نے غیر معمولی شفقت ومحبت سے اس حد تک توجہ فرمائی کہ ان کے قریبی عزیز آپ کو مولانا بدر عالم کا محبوب کہنے لگے۔اسلامی تصوف اور فلسفۂ تصوف میں آپ کی گہری نظر ہے اور اس سلسلے میں وجود وشہود جیسے مشکل موضوعات پر آپ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔آپ کا نام پاکستان خصوصا کراچی کی علمی، ادبی اور دینی مجالس میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے، اور آپ کی معلومات اور علم سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔حلقہ علم وادب میں آپ کے مختلف ملکوں کے سفارتکاروں کے ساتھ نیز مشہور ومعروف ادیب، تنقید نگار سلیم احمد، احمد ہمدانی، افتخار احمد مدنی، اسلم فرخی اور جمال پانی پتی جیسے کئی مشہور شخصیتوں سے علمی وادبی روابط ہیں۔

مولانا کی دینی وعلمی، ادبی وسیاسی زندگی کے علاوہ ایک خاندانی اور گھریلو زندگی بھی ہے۔آپ کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے جو مختلف سرکاری ونیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں۔اگرچہ ضعیف العمری کی وجہ سے اب علمی وادبی مذہبی روابط میں وہ پہلی سی گہما گہمی نہیں رہی لیکن اب بھی مخلصانہ طبیعت اور جذبہ محبت وشفقت کا یہ عالم ہے کہ اپنا ہو یا پرایا کوئی بھی کسی وقت اور کسی بھی موضوع پر ان کی ذات سے فیضیاب ہونا چاہے تو آپ اسے ہر ممکن طریقے سے مطمئن کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

بزرگ عالم دین مولانا سید اصلح الحسینی انتقال کر گئے

کراچی/کبیر والا (اسٹاف رپورٹر) مولانا سید حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید، خادم خاص اور خلیفہ مجاز، شیخ المشائخ مولانا سید محمد اصلح الحسینی تقریباً ایک سو ایک (۱۰۱) برس کی عمر ۶ جون ۲۰۱۴ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مدرس رہے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا نصیر احمد خان صاحب (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مولانا ریاست علی بجنوری استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا ولی رازی اور مولانا عبیداللہ انور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب کہ ان کے خلفائے مجاز میں مولانا سید ارشد مدنی استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند، امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت مولانا عبدالمجید لدھیانوی، مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، مفتی نظام الدین شامزئی شامل ہیں۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب جامعہ بنوری ٹاؤن میں جامعۃ الرشید کے استاذ الحدیث مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی نے پڑھائی۔ دریں اثناء مولانا کی وفات پر مدینہ منورہ سے قاری شبیر احمد، دارالعلوم دیوبند سے مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا انوار الرحمٰن سمیت تمام اساتذہ وانتظامیہ نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے مولانا کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی۔ خانقاہ ذکریا کبیر والا سے مولانا محمد عبدالغفار نے حضرت سید اصلح الحسینی کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ حضرت مدنی کی نسبت کے امین، ان کی سیاسی فکر اور انقلابی فلسفے کے علمبردار اور اکابر کی نشانی تھے۔ وہ صاحب نسبت بزرگ، جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔

یہ خبر جنگ اخبار میں شائع ہوئی تھی جس میں مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا

☆☆☆

مولانا سید حمید الدین اخترؒ (مہتمم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی)

ندیم ماہر

حضرت مولانا سید حمید الدین مولانا سید محی الدینؒ کے بڑے صاحبزادے تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں ہوئی، بعدازاں حضرت مولانا محمد حسن مرادآبادی (جو مدرسہ میں پڑھاتے تھے) نواب بھوپال کے دربار میں بحیثیت قاضی القضاۃ تقرر ہوا، تو مولانا حمید الدین صاحب نے بھی اپنا رختِ سفر باندھا۔ مولانا محمد حسن مرادآبادی اپنے زمانہ کے علم حدیث کے بڑے اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے نیز ہمہ نواب صاحب کی معیت میں رہا کرتے تھے اور نواب کے مشیرِ خاص تھے، لہٰذا مولانا حمید الدین صاحب بھی ہمہ وقت شاگرد رہے اور سفر و حضر میں اپنی کتابیں ساتھ رکھتیں۔ جب وقت ملتا تو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔

فراغت کے بعد مولانا سید حمید الدین صاحب نے روزگار کی تلاش میں راندیر (سورت۔ گجرات) کو اپنا پڑاؤ بنایا اور مدرسہ اشرفیہ میں بحیثیت استاذ عربی تقرر ہوا۔ یہاں انکی علمیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ انکے شاگردوں میں مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ جیسے لوگ موجود تھے۔ آپکی اہلیہ بھی مدرسۃ البنات میں قرآن کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ اس طرح وہاں اُس زمانے کے اکثر مرد و خواتین مولانا مرحوم اور ان کی اہلیہ کے شاگرد رہے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں جب آپ کے والد حضرت مولانا سید محی الدین صاحب کی طبیعت خراب ہوئی تو آپ کے والد نے ان کو گلاؤٹھی بلوالیا اور ۱۹۳۵ء میں باضابطہ حضرت مولانا سید محی الدین کے انتقال کے بعد آپ نے عہدۂ اہتمام سنبھال لیا۔

مولانا حمید الدین ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین شاعر بھی تھے، چنانچہ اُس زمانے میں گجرات، مہاراشٹر، بھوپال، ناگپور اور گرد و نواح کے مشاعروں میں باضابطہ آپ نے بحیثیت شاعر شرکت ہی نہیں کی بلکہ اپنے پختہ کلام سے ایک مقام حاصل کیا۔ آپ نے اردو، فارسی اور عربی زبان میں شاعری کی۔ راقم نے آپ کا کلام جمع کیا ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب شائع ہوگا۔

مولانا موصوف علم فرائض (علم میراث) میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے پاس الہ آباد ہائی کورٹ کے کئی جائیداد کے مقدمات آئے جن کا تصفیہ آپ نے فرمایا۔ آپ سیاسی میدان میں بھی کارفرما رہے، آپ کا تعلق کانگریس سے تھا اور آزادی کی لڑائی میں بھرپور طور پر حصہ بھی لیا اور کئی بار اس سلسلہ میں قید و سلاسل کی پابندیاں بھی جھیلیں، جواہر لال نہرو سے قریبی تعلقات تھے۔

علاوہ ازیں آپکی شخصیت میں سادگی اور متانت تھی، جسم و جثہ کے اعتبار سے نہایت وجیہ اور نورانی چہرہ تھا، ایک خاص قسم کی کشش تھی، لوگوں کا بیان ہے کہ جو ان کو دیکھتا تھا دیکھتا رہتا تھا۔ ایک خاص وصف یہ تھا کہ آپ کے اندر غصہ بالکل

ندارد تھا، کتنی ہی کڑوی اور کیسی ہی بات ہو کبھی چہرے پر شکن نہیں آتی تھی۔ شفقت اور اخلاق کا ایک عملی نمونہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیشہ نمایاں رہا۔

مدرسہ کے جہاں موافقین کا ایک طویل فہرست تھی وہیں پر کچھ مخالفین بھی رہے (ویسے حق کے ساتھ باطل کا رشتہ ہمیشہ رہا ہے) اور کئی ایسے مواقع آئے کہ جہاں یہ اختلافات شخصی حد تک پہنچے لیکن حضرت مرحوم نے ڈٹ کر اور مصلحت کے ساتھ اپنی سرد مزاجی کو سامنے رکھ کر فیصلے کئے اور الحمدللہ ادارہ کا یہ وہ وقت تھا جب یہاں غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے کے طلبہ زیر تعلیم تھے، نیز اس کے علاوہ افغانستان کے بیشتر صوبوں کے تشنگانِ علوم یہاں سیرابی حاصل کیا کرتے تھے۔

ایک لمبی فہرست ایسے علماء کی رہی جنہوں نے تقسیمِ ہند سے قبل اس ادارے سے سندِ فضیلت حاصل کی اور چہار دانگِ عالم میں علم دین اور علوم روحانی سے اس امت کی رہنمائی کی اور اس ادارے کا نام روشن کیا، جن میں آج بھی اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت مولانا شیر علی قندھاری (شیخ الحدیث جامعۃ الفلاح ترکیشور۔ سورت گجرات) ہیں جو مولانا مرحوم کے شاگرد رشید تھے اور ابتدائی تعلیم سے لے کر علیا تک گلاؤٹھی میں مقیم رہے اور آج مولانا شیر علی صاحب کے شاگردوں کی بیشتر تعداد ہندوستان کے علاوہ لندن، جنوبی افریقہ اور امریکہ میں مقیم ہے۔

آپ کے پسماندگان میں مولانا سید احمد میاں (فارسی زبان کے ماہر تھے، نیز کتابت (خوشخطی) میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، بلا کی ذہانت تھی اور حافظہ بھی اللہ نے خوب عطا کیا تھا، مدرسہ منبع العلوم میں بحیثیت مدرس کام کیا اور کتب خانہ کی ترتیب اور شعبہ خوشخطی سے وابستہ رہے) آپ کے بیٹے سید غفران راشدؔ گلاؤٹھی میں مقیم ہیں۔

قاری سید محمد میاں صاحب، حافظ سید نسیم الدین جن کا ذکر آگے کے صفحات میں آرہا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سید قسیم الدین حمادؔ جو کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل گڑھ مکتیشور میں مقیم ہیں، قاضی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی مدرسہ کی سرپرستی نیز دینی سرگرمیوں میں اہم حصہ رکھتے ہیں۔ آپ محکمہ بجلی (حکومت ہند) سے ریٹائر ہوئے۔

آپ کے چھوٹے فرزند مولانا ڈاکٹر سید سلیم الدین حسان دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے دہلی یونانی کالج سے بی یو ایم ایس کیا۔ سعودی سفارت خانہ (دہلی) میں ملازمت کی، اور ۱۹۸۲ء میں سعودی عرب چلے گئے جہاں وزارت صحت (بریدہ القصیم) میں ملازمت کی اور ۲۰۰۹ء میں ریٹائر ہوئے اور آج کل گلاؤٹھی میں مقیم ہیں۔ آپ کی تین صاحبزادیاں تھیں، ساجدہ بیگم (زوجہ سید ذکی الدین گلاؤٹھی) صالحہ بیگم (زوجہ سید مظہر اللہ حیدرآباد) حسانہ بیگم (زوجہ رئیس احمد رٹول)۔

۱۴/ فروری ۱۹۷۴ء کو حضرت مولانا سید حمید الدین نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا اور گلاؤٹھی ایک مایہ ناز عالمِ دین اور ایک زیرک مشفق اور مہربان سے محروم ہوگئی۔ آپ کو اپنے والد مولانا سید محی الدین کے پہلو میں آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

☆☆☆

حاجی تہور علی (مرحوم)

نگہت نسیم

ہمارے خاندان اور برادری کی تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے اپنی قابلیت ،علم اور ہنر مندی سے نہ صرف معاشرے میں معتبر مقام حاصل کیا بلکہ اپنے عمل ،عبادت گزاری اور تقوے میں بھی اللہ کے محبوب بندے کہلائے۔ایسی ہی ایک شخصیت میرے دادمحترم حاجی تہورعلی صاحب کی تھی۔

۱۸۵۲ء میں الدن کے صدیقی خاندان میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔آپ کے جداعلی شیخ صدرالدین ساکنان الدن کا حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیقؓ سے بیسواں واسطہ ہے۔(تاریخ الدن مرتب ۱۲۵۱ھ)

مورث اعلی ایک عرصہ سے پولیس کے محکمہ سے منسلک تھے، والد روشن علی میرٹھ شہر کے نائب کوتوال رہے بڑے بھائی منشی یوسف علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔خاندانی روایات کو پابند رکھتے ہوئے آپ نے بھی مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۷سال کی عمر میں پولیس کی ملازمت اختیار کی۔دوران ملازمت آپ نے نہ صرف ایک قابل پولیس آفیسر کی حیثیت سے شہرت پائی بلکہ پولیس اکیڈمی ریاست رامپور میں بحثیت تربیتی آفیسر کے خوب نام کمایا۔اپنے دور ملازمت میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ پولیس تربتی ادارے کے لئے قوانین مرتب کرنا تھا جس کو بے حد سراہا گیا۔ان قوانین پر تقسیم ہند کے بعد بھی ریاست رامپور میں ایک طویل عرصہ تک عملدرآمد ہوتا رہا۔

ایک طرف پولیس کی ملازمت تھی دوسری طرف شخصیت کا دوسرا پہلو صوم وصلوۃ کے پابند، عارف کامل،عبادت وریاضت کا یہ عالم تھا کہ ۱۶سال کی عمر سے سفر وحضر میں بھی کبھی تہجد کا ناغہ نہیں کیا۔چشتیہ سلسلہ میں داخل تھے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔آخری عمر میں تلاوت قرآن اور دیگر وظائف کے علاوہ ذکراللہ اسّی اسّی ہزار مرتبہ یومیہ کیا کرتے تھے۔سات مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا جو اس ملازمت کے لحاظ سے محیرالعقل معلوم ہوتا ہے۔اللہ کا شکرادا کیا کرتے تھے کہ اولاد کے لئے کچھ نہ چھوڑا اور ان کے جسم میں حرام کا ایک پیسہ نہیں لگایا۔

آپ کو شعروادب سے بھی خاصا لگاؤ تھا لیکن اس میں محور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہی تھی ۔ چند اشعار آپ کے دیوان (یادگار علوی) سے پیش خدمت ہیں

کرتے ہیں آج ذکر محمد کے نور کا

صلی علی کا شور ہے نغمہ طیور کا
آئے گی جائے شمع تجلی کوہِ طور
ہو اہلِ بزم دور شرابِ طہور کا
آمد ہے قدسیوں کی بصد شوق بزم میں
سایہ ہے تم پہ رحمت ربِ غفور کا
تمنا یہ رکھتے ہیں مضطر تمہاری
اٹھیں حشر میں مرکے درپہ تمہارے
یہی کیا لطف کم ہے شہ ناز ہم پر
اگر مرکے رہ جائیں در پر تمہارے
قفس میں پھڑکنا نہ صیاد دیکھے
اگر نہ کٹیں گے ابھی پر تمہارے
ذرا در کے اوپر سے پردہ اٹھادو
بہت منتظر رہیں گے باہر تمہارے

اللہ نے آپ کو چار فرزند اور تین دختر عطا کیں۔ زوجۂ اول جن کا تعلق گلاؤٹھی ضلع بلند شہر سے تھا سے مولوی شمس الحق اور دو دختر اور زوجۂ ثانی (رامپور) سے سب سے بڑے مولانا محمد حامد ان سے چھوٹے مولانا محمد بدر عالم اور ان سے چھوٹے محمد محمود اور ایک دختر بلقیس فاطمہ تھیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی استاذ حدیث جامعۃ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''حاجی تہور علی کی نیک نامی کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو اولاد عطا کی ہیں ان میں سے تین بڑے مولوی شمس الحقؒ، مولانا محمد حامدؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ زندگی بھر دین کی خدمت کرتے رہے''

آپ کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا اور میرٹھ میں تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) باوجود کوشش کہ میں اپنے تایا مولوی شمس الحق کے بارے میں معلومات حاصل نہ کرسکی لہٰذا ان کے بارے میں کچھ بھی تحریر کرنے سے قاصر ہوں لیکن اپنے والد محترم مولانا محمد حامد کے بارے میں لکھتے ہوئے فخر محسوس کر رہی ہوں۔

مولانا محمد حامد: ۱۸۹۶ء میں رامپور میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد محترم حاجی طہور علی سپرنٹنڈنٹ پولیس تعینات تھے۔ بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کے والد نے آپ کو اور اپنے چھوٹے فرزند مولانا بدر عالم میرٹھی کو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور بھیج دیا جہاں آپ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی زیر تربیت رہے اور اسی ادارہ سے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سند حاصل کی۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ امتحانات سے کچھ پہلے اپنی پڑھائی شروع کرتے اور اول آتے۔ کتابیں خوب یاد تھیں۔ یہاں آپ

کو امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ جیسے مایہ ناز اساتذہ ملے جنہوں نے آپ کی خوب تربیت فرمائی۔

اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ کالج پشاور سے کیا، جہاں آپ دینیات کے استاذ اور نائب ناظم رہے۔ ۳۵ سال اس ادارہ سے منسلک رہنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئے اور پھر کراچی تشریف لے آئے۔ مولانا یوسف بنوریؒ کی خواہش پر جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے منسلک ہوگئے۔ یہاں آپ ادب اور منطق کے استاذ اور ناظم تعلیمات رہے۔ عربی ادب اور معقولات میں آپ کو کامل دست گاہ حاصل تھی۔ آپ کا شمار یہاں کے انتہائی ذہین عالم اور مدرّسین میں ہوتا تھا۔ یہاں کے نامور استاذ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی، قاری مفتاح اللہ، مولانا فضل حق یوسفی اور مولانا عبدالعلیم خان آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

مولانا یوسف بنوریؒ کا آپ سے خصوصی تعلق تھا اور بے حد قدر کرتے تھے ایک عرصہ تک مولانا کے ساتھ ماہنامہ ''بینات'' کو دیکھتے رہے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان سے مختلف دینی موضوعات پر آپ کی تقریریں بے حد مقبول ہوئیں۔ تقوے کا یہ عالم تھا کہ جب آپ کو پہلی بار فالج کا حملہ ہوا اور کچھ عرصہ کے لئے آپ تدریسی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ صحت عطا فرمائی مولانا یوسف بنوری صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود بیماری کے دور کی تنخواہ کو جائز نہ سمجھا اور واپس کردی۔

۸۱ سال کی عمر میں دوبارہ بیماری کا حملہ ہوا اور کومہ میں چلے گئے اور بالآخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کے درجات بلند فرمائے۔

مولانا بدر عالم میرٹھی: جیسی عظیم اور مقدس ہستی کے بارے میں میرے لئے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، کہاں ایک جید عالم دین اور کہاں ہم گنہ گار۔ مولانا کے بارے میں زیر نظر کتاب میں تفصیل سے ذکر ہے اور اس وقت کے عالموں کی رائے اور آپ سے عقیدت کا اظہار بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عظیم خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)

☆☆☆

قاری سید محمد میاںؒ (مہتمم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی)

ندیم ماہر

آپ کی ولادت گلاؤٹھی کے ایک اعلیٰ علمی اور روحانی خانوادے میں ۱۳۴۱ھ ہجری کو ہوئی، آپ مولانا سید حمید الدین صاحب کے دوسرے نمبر کے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم حسبِ روایت مقامی مدرسہ منبع العلوم میں حاصل کی۔ گھریلو ماحول چونکہ خالصتاً دینی تھا اس لئے عہدِ طفولیت سے قاری صاحب اسی تعلیم کی طرف راغب رہے۔ حفظِ قرآن کریم کے بعد آپ نے ابتدائی درسِ نظامی کی کتب مدرسہ ہی میں پڑھیں، وسطی درجات کی تعلیم کے لئے آپ نے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ابھی دارالعلوم میں کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ آپکی شخصیت اور متانت کا شہرہ پورے احاطۂ دارالعلوم میں گشت کرگیا۔ آپکے قرآن پڑھنے کا اندازِ ترتیلی آپکی شناخت بن گیا۔ اسی دوران احاطۂ دارالعلوم کی مسجد میں منصب امامت خالی ہوا جس کے لئے ایک عمدہ قاری کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل حضرت قاری صاحب کی شکل میں عمدگی کے ساتھ ہوگئی اور آپکو عہدۂ امامت سونپ دیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں درسِ نظامی سے فراغت ہوئی بعدازاں سہ سالہ تجوید و قرأت کے کورس کی تکمیل کی، اسی دوران حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے موسوم مدنی مسجد میں جس میں آپ رمضان المبارک میں اعتکاف فرماتے تھے۔ نیز حضرت مدنی اکثر اوقات اسی مسجد میں نماز ادا فرماتے تھے، قاری صاحب نے مدنی مسجد میں بھی ایک سال امامت کی۔ حضرت مدنی کی خاص شفقت آپ کو حاصل رہی اس طرح قاری صاحب نے حضرت مدنی کی خدمت میں کافی عرصہ گزرا نیز ڈھائی سال تک آپ حضرت کے ساتھ اسفار میں بھی رہے۔

آپ کی شہرت خاص طور پر قرآن مجید کی نسبت سے زیادہ رہی۔ آپ کے استاذ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ کے قرأت کے مشہور استاذ قاری حفظ الرحمٰن صاحب تھے، آپ کے قرآن کا یہ عالم تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جب دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو ایک بڑا جلسہ منعقد کیا گیا جس میں قرآن پاک کی تلاوت آپ نے فرمائی۔ یہ تلاوت تقریباً پندرہ منٹ پر محیط تھی۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ایسا سماں باندھا کہ اہل جلسہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور دیکھنے والوں نے بتایا کہ جتنی دیر قرأت جاری رہی مولانا ابوالکلام آزاد زاروقطار روتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں فراغت کے بعد حضرت مدنی کے ایماء پر ہی آپ مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور ۱۹۴۸ء ہی میں اونچی مسجد بلیماران میں عہدۂ امامت آپکے سپرد ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں آپکو جمعیۃ علمائے ہند صوبہ دہلی کے عہدۂ صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور تبھی سے تاحال آپ صوبہ دہلی کے صدر مجلسِ عاملہ اور مجلسِ منتظمہ کے رکن رکین رہے۔ ۱۹۹۴ء میں دہلی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا اہم ترین منصبِ امامت شاہی عیدگاہ دہلی آپکو سپرد کیا گیا جو آپ نے انتہائی استغنائیت کے ساتھ

بعد صد اصرار قبول کیا۔مزاج کی سادگی، استغناء، سنجیدگی، وضعداری، اصولوں کے پابند اور کم گو غرضیکہ وہ تمام صفات جو ایک انسانِ کامل میں مظہرِ اعلی ہوسکتی ہیں وہ آپکی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

آپ کی علمیت اور استغنائیت کا شہرہ ہندوستان کے شرق وغرب میں رہا، مدرسہ عالیہ فتحپوری میں مسندِ درسِ حدیث، اونچی مسجد بلیماران میں منصبِ امامت کے ساتھ ساتھ آپ کو چہ رحمان میں بعد فجر تفسیرِ قرآنِ مجید بھی فرمایا کرتے تھے۔جس میں سینکڑوں افراد یومیہ شرکت کرتے تھے نیز شرکاء میں بڑی تعداد مستورات کی ہوا کرتی تھی۔رمضان المبارک کے مہینہ میں قرآنی اعجاز کا مشاہدہ ہوا کرتا تھا آپکی خوش الحانی اور ترتیلی انداز سننے کے لئے تراویح میں شرکت کرنے والوں کا ایک ہجوم ہوا کرتا اور ایک بڑی تعداد قرآن پاک سننے کے لئے دور ودراز سے سفر کر کے آیا کرتی کہ تین منزلہ وسیع وعریض مسجد اپنے ناکافی ہونے کا گمان کرنے لگتی۔

آپکی شخصیت اور آپکے استغناء کا بین ثبوت یہ تھا کہ آپکے پاس آنے والوں کے لئے بلاتفریق اصول وضوابط تھے جن میں کس کی رعایت نہیں تھی بقول شاعر

بوریا حاضر ہے شاہوں کے لئے　　　ہم فقیروں کی یہی ہے کائنات

اردو ادب سے کافی لگاؤ تھا شاعری چونکہ آپکو ورثہ میں ملی تھی آپکے دادا حضرت مولانا سید محی الدین نیز والدمحترم حضرت مولانا سید حمید الدین صاحب کے علاوہ آپکے برادران میں مولانا سید احمد میاں، مولانا سید نسیم الدین، مولانا قسیم الدین اور ڈاکٹر سید سلیم الدین صاحبان بھی خاصا شعری ذوق رکھتے تھے لیکن افسوس آپکا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور آپکی حیات میں بھی اس جانب کوئی خاص توجہ اور اہتمام نہ ہوسکا۔

طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے آپ اپنے آبائی وطن گلاؤٹھی منتقل ہوگئے، اپنے برادر خورد ڈاکٹر سید سلیم الدین حسان کے گھر میں آپ نے قیام کیا اور عمر کے آخری ایام یہیں بسر فرمائے لیکن دہلی اور اہلِ دہلی سے تعلق برابر قائم رہا۔آپکی عیادت کرنے والوں میں اہالیانِ دہلی کا تانتا لگا رہتا۔آپ حالانکہ صاحبِ فراش تھے لیکن اگر کوئی عیادت کرنے کیلئے آتا تو آپ اسکی ضیافت کا خاص خیال فرماتے اور اہلِ خانہ سے تاکید بھی فرماتے۔

تقریباً ایک سال کی علالت کے بعد مورخہ ۲۷ نومبر ۲۰۰۲ء مطابق ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ایک آفتاب وماہتاب شخصیت سے یہ دنیا ایک بار پھر خالی ہوگئی۔نماز جنازہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) نے پڑھائی، ایک اندازے کے مطابق آپ کے جنازے میں شرکاء کی تعداد کئی ہزار سے متجاوز تھی، اتنا مجمع اہل گلاؤٹھی نے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، جس میں وزراء، امراء، علماء، اور سیاسی حضرات سمیت بلالحاظ مذہب وملت عوام شامل تھے۔

آپ کے پسماندگان میں دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔سید شجاع الدین عمار (حیدرآباد) اور سید عزیز الدین گلاؤٹھی میں مقیم ہیں جبکہ عمرانہ خاتون (میرٹھ) اور ریحانہ خاتون نظام آباد (آندھرا پردیش) میں مقیم ہیں۔

☆☆☆

ایک قدآور مربی، ڈاکٹر فرحت علی برنی (مرحوم)

عبدالستار خان (ایڈیٹر اردو نیوز جدہ)

جمعرات ۲۰ اگست ۲۰۰۹ء کا سورج ایک اندوہناک خبر لے کر طلوع ہوا۔ یہ سعودی عرب اور خلیج کی معروف شخصیت ڈاکٹر فرحت علی برنی کی وفات کی خبر تھی، جو جنگل کی آگ کی طرح امریکہ، یورپ اور پاکستان سمیت پورے خلیج میں پھیل گئی۔ اسلام آباد میں علی الصباح آپ کا انتقال ہو گیا تھا (اناللہ وانااللہ والیہ راجعون)

دنیا میں کچھ سعید روحیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اللہ تعالی اپنی خدمت کے لئے چُن لیتا ہے۔ وہ اللہ تعالی سے زندگی بھر کا سودا کر لیتے ہیں، پھر وہ اللہ تعالی سے اپنا کیا ہوا عہد سچا کر دکھاتے ہیں۔ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے درجات کی بلندی اور گناہوں کے کفارے کے لئے اللہ تعالی انہیں مختلف تکالیف و آلام دیتا رہتا ہے تاکہ جب وہ اللہ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوں تو گناہوں سے پاک صاف ہو جائیں، تکالیف و آلام کی اس بھٹّی سے کندن بن کر نکلیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب یا کسی اور شخص کی پاکی بیان نہیں کر سکتے، اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کون زیادہ متقی ہے تاہم ہمارا گمان ہے کہ اللہ تعالی نے ڈاکٹر صاحب کو بھی اس بھٹّی سے گزار کر کندن بنایا ہوگا۔ ڈاکٹر شجاعت علی برنی اور ڈاکٹر فرحت علی برنی دونوں بھائیوں نے دعوتِ دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اہلِ ایمان میں سے ان لوگوں کی طرف اللہ تعالی نے اشارہ کر کے فرمایا کہ ''ان میں سے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا عہد سچا کر دکھایا، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت کے آنے کا منتظر ہے'' ایک بھائی نے گزشتہ برس اپنی نذر پوری کر دی تھی، دوسرے طویل علالت کی زندگی گزارتے ہوئے وقت آنے کے منتظر تھے اور آخر کار ۲۰ اگست ۲۰۰۹ء کی صبح کو ان کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔

ڈاکٹر فرحت علی برنی کا تعلق کراچی سے تھا مگر آپ کا بچپن اندرون سندھ میں گزرا، آپ کے والد محکمہ ڈاک میں اعلی عہدے پر فائز تھے۔ والد صاحب کا مختلف شہروں میں ٹرانسفر ہوتا رہا، عمر کا زیادہ حصہ شکار پور میں گزرا جہاں ان کے دونوں صاحبزادے ڈاکٹر شجاعت اور ڈاکٹر فرحت نے اپنا بچپن گزارا۔ ڈاکٹر شجاعت علی برنی اور ڈاکٹر فرحت علی برنی دونوں بھائیوں نے سعودی عرب میں طویل عرصہ گزارا، اللہ تعالی نے دونوں بھائیوں سے دعوتِ دین کا کام لینا تھا۔ سو اسی کام کو ادا کرنے کے لئے دونوں بھائیوں نے سعودی عرب سمیت خلیج و امریکہ اور یورپ کے متعدد دورے کئے۔ ڈاکٹر فرحت علی برنی کے دروس آج بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے دروس کی کیسٹس اور سی ڈیز مملکت کے مختلف شہروں میں آج بھی بڑے شوق اور عقیدت سے سنی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مملکت اور خلیج کے مختلف شہروں کے علاوہ پاکستان ، امریکہ، کینیڈا، امارات اور دیگر ممالک میں درس دینے میں معروف تھے۔آپ کے دروس سے ہزاروں افراد مستفید ہوئے ۔سعودی عرب میں آج بھی ایسے بے شمار افراد ہیں جن کی ڈاکٹر صاحب نے تربیت کی ۔بہترین مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مربیؔ بھی تھے ۔ دنیا میں ہزاروں افراد ایسے گزرے ہیں جنہیں تقریر کرنے کا ملکہ حاصل تھا اور انکی دینی خدمات کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے مگر دنیا سے گزر جانے کے بعد انہوں نے اپنا یہ فن کسی کو منتقل نہیں کیا۔ڈاکٹر صاحب ان نادرالوجود افراد میں سے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے فن کو کیسٹوں کی صورت میں محفوظ رکھا بلکہ تقریر کے فن کو دوسرے افراد تک منتقل کرنے کے لئے ان کی تربیت کا اہتمام بھی کیا۔

ڈاکٹر فرحت علی برنی کئی خوبیوں کے مالک تھے، انکے بارے میں چند خاص باتیں ڈاکٹر سعید احمد شاد سے معلوم ہوئیں، جو ان کے دفتر کے ساتھی بھی تھے، وہ کہتے ہیں کہ'' ڈاکٹر برنی نے ۵۰ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا اور ۶، ۷ سال کے بعد انہیں قرآن مجید حفظ ہوگیا۔ایک درس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ قرآن مجید کو غیر معمولی روانی سے پڑھ رہے ہیں۔میں نے تنہائی میں ان پوچھا کہ کیا آپ حافظ قرآن ہیں؟ انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ'' آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے۔الحمدللہ میں نے قرآن مجید حفظ کرلیا ہے۔انہوں نے اس چیز کو لوگوں سے ایک عرصے تک پوشیدہ رکھا، بعد ازاں اپنے ساتھیوں کو قرآن مجید حفظ کرانے کی ترغیب دلانے کے لئے بتایا کہ قرآن مجید کو حفظ کرنا آسان ہے، میں نے اس عمر میں قرآن مجید حفظ کیا ہے'' وہ بلا کے حافظے کے مالک تھے۔بے شمار دروس دیئے مگر کبھی ان کے پاس نوٹ نہیں دیکھے گئے ۔جب بھی درس دیتے، اپنی یادداشت کی بنیاد پر دیتے۔ڈاکٹر برنی دعوتی سرگرمیوں میں کافی مصروف رہتے مگر اپنے کسی اجتماع کو رات کے ۱۱ بجے کے بعد تک نہیں رکھتے تھے، کیونکہ وہ تہجد کے پابند تھے، وہ قرآن مجید کے ایک پارے کو دن میں دو مرتبہ تلاوت کرتے اور تیسری مرتبہ رات کو تہجد میں پڑھتے تھے۔ایک ماہ میں پورے قرآن مجید کا دور مکمل کرتے ۔جب حفظ کرنا شروع کیا تو حفظ پکا کرنے کے لئے تہجد میں اپنی اہلیہ کو اپنی اقتدا میں شامل کرتے ، وہ قرآن مجید کا نسخہ اپنی اہلیہ کو دیتے اور خود یاد کیا ہوا پڑھتے ۔ جہاں ان سے غلطی ہوتی تو اہلیہ جو قرآن مجید کو ہاتھ میں لئے ہوتیں اور انہیں لقمہ دیتیں۔اس طرح انہوں نے اپنا حفظ پکا کیا۔ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ قرآن مجید کے ورد کو جاری رکھنے سے عاجز تھے، انہیں اعصابی مرض لاحق ہوگیا جو روز بروز بڑھتا رہا یہاں تک کہ انہیں مستقل صاحب فراش ہونا پڑا۔آخری ایام میں وہ بات چیت کرنے سے بھی عاجز ہوگئے ۔انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات پر ہی تھا کہ وہ تہجد اور ایک دن میں قرآن مجید کے ایک پارے کی تین مرتبہ تلاوت نہیں کرسکتے تھے۔

ڈاکٹر فرحت علی برنی ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے شہر بلند شہر میں پیدا ہوئے ۔انڈسٹریل انجیئرنگ میں پی ایچ ڈی کی اور ۱۹۸۶ء میں جدہ آگئے ۔کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی میں ۱۸ سال تک پروفیسر رہے اور ۲۰۰۳ء میں ریٹائر ہوکر مستقل طور پر امریکہ کی ریاست لویزیانا چلے گئے جہاں ایک عرصے تک قیام کرنے کے بعد اسلام آباد میں اپنی بیٹی کے ہاں منتقل ہوگئے۔

بہترین منتظم ،مقرر اور مربی ہونے کے علاوہ ڈاکٹر فرحت علی برنی بہترین انسان بھی تھے۔آپ کی علمی اور دینی

خدمات برسوں یاد رکھی جائیں گی۔جن خطوط اور بنیادوں پر ڈاکٹر فرحت علی برنی نے دعوتی کام کی بنیاد رکھی ان پر آج بھی عمل ہورہا ہے اوران شاءاللہ صدیوں تک جاری رہے گا،ان کے دروس کی کیسٹس سنی جاتی رہیں گی اوران کے تربیت یافتہ افراداللہ کے دین کواللہ کے بندوں تک پہنچانے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔جب تک یہ عمل جاری رہے گا اس کا اجرانہیں ملتا رہے گا۔ڈاکٹر صاحب کا شماران افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے بعد نیک اعمال کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھوڑا ہے۔اللہ تعالی انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطافرمائے۔آمین

☆☆☆

مولانا حافظ سید نسیم الدینؒ (ناظم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی)

ندیم ماہر

۱۲۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ولادت ہوئی۔ مولانا سید حمید الدین کے تیسرے نمبر کے صاحبزادے تھے۔ آپ نے حفظِ قرآنِ مجید مدرسہ ہی میں مکمل کیا اور درسِ نظامی کی بیشتر کتابیں متوسط تک مدرسہ منبع العلوم ہی میں پڑھیں۔

حافظ سید نسیم الدین صاحب ایک جولانی الطبع، روشن خیال اور بے انتہا ذہین شخص تھے۔ نیز طبیعت کے اندر جستجو اتنی تھی کہ ابتدائی عملی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں رہا جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر آپ نے حیدر آباد کا رخ کیا اور اپنے ماموں حضرت مولانا سید یحیٰ صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہاں تعلیمی سلسلہ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ نظام حیدر آباد کی تحریک رضا کار میں بحیثیت ایک فوجی اور رضا کار کے شمولیت اختیار کر لی (واضح رہے کہ یہ نظامِ حیدر آباد کی حکومت کے ہندوستان میں انضمام کے خلاف تھی جس کی کمان قاسم رضوی نے سنبھال رکھی تھی)۔ لیکن حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے والد مولانا حمید الدین نے مولانا یحیٰ صاحب سے کہہ کر زبردستی اس تنظیم سے اُن کو چھڑایا اور حیدر آباد سے واپس گلاؤٹھی لے آئے۔ یہاں آکر آپ نے گلاؤٹھی کے قرب میں راجپوتوں کے ایک مرکزی اور بڑے گاؤں (جو تقریبا قصبہ کی حیثیت رکھتا تھا) بجھیڑہ کلاں میں امامت کی۔ پھر یہاں مزاج نہ مل سکا اور آپ نے اس بار چورو (راجستھان) کا رخ کیا بلکہ اپنے ساتھ بیوی بچوں کو بھی لے کر چلے گئے۔ یہ علاقہ راجستھان کا ایک بنجر اور بیابان علاقہ تھا، یہاں کی آب وہوا غیر معمولی طور پر بالکل بھی صاف اور ستھری نہ تھی، یہ علاقہ بچھوؤں کا گڑھ تھا، چہار جانب ریت ہی ریت، تہذیب وثقافت کا فقدان، لسانی اجنبیت غرضیکہ کچھ عرصہ اس بے آب وگیاہ ریگستان میں انتہائی نا مساعد حالات میں رہے۔ پھر اس کے بعد راجستھان کی سرزمین کو خیر باد کہہ دیا۔

واپس آنے کے بعد سکندر آباد سے ملحق گیسو پور میں بحیثیت امام تقرر ہوا۔ یہاں آپ نے زندگی کا ایک اچھا خاصہ عرصہ گزارا۔ یہ علاقہ بھی گو کہ قریب تھا لیکن یہاں پر بھی مسلمانوں میں آپس میں بڑی رسہ کشی اور طناطنی کا دور تھا، یہاں آکر سب سے پہلے مرحوم نے آپسی اُس خلا کو پُر کیا اور حکمتِ عملی کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو متحد کرنا شروع کیا۔ اس مسجد سے ملحق ایک چھوٹا سا مکتب (مدرسہ) قائم کیا، یہ دور تھا جہاں آپکی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ایک مختصر سے عرصے میں آپ نے گیسور پور کو ایک نئی پہچان عطا کی۔ یہاں آپکی خوبیوں کا ذکر آج بھی پرانے لوگوں کے زبانوں پر ہے۔ آپ کی نفاست، شخصیت میں رعب اور سنجیدگی، وسیع الخیال، وسیع النظر، خوش ذوق اور وجیہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بحیثیت شاعر ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے، چنانچہ آپ کے کلام میں رومانیت کے ساتھ اُس زمانہ کے حالات بھی نمایاں ہیں۔ آپ کا اصلاحی تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا، اسی کے ساتھ ساتھ جمعیۃ العلماء سے وابستگی رہی اور عملی طور پر سیاسی اور ملی خدمات میں اپنی کوششوں کو بروئے کار لائے۔ آپ نے کئی ملیّ نظمیں بھی کہیں۔

۱۹۶۸ء میں والد ماجد کی صحت کی خرابی کے بعد آپ نے گیسو پور کو الوداع کہا اور ہمیشہ کے لئے گلاؤٹھی کو اپنا مسکن بنالیا، یہاں آکر آپ نے مدرسہ میں والد کے ساتھ انکا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ نیز مولانا حمید الدین صاحب علالت کی وجہ سے سفر نہ کر سکتے تھے اس لئے مدرسہ کے تمام اسفار، بمبئی اور گجرات وغیرہ کے آپ نے شروع کر دیئے۔ مولانا حمید الدین صاحب کے انتقال کے بعد علمی اور روحانی اعتبار سے گو کہ قاری سید محمد میاں اصل عہدۂ اہتمام کے حقدار تھے لیکن قاری صاحب کے قیام دہلی کی وجہ بحیثیت ناظم مدرسہ آپ کو منتخب کیا گیا اور عہدۂ اہتمام قاری سید محمد میاں کے پاس ہی رہا۔ ادارے کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے آپ نے تعمیری جانب رخ کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مدرسہ نے جتنی تعمیری ترقی پچھلے ستر اور اسی سال میں نہیں کی تھی اتنی ترقی مولانا سید نسیم الدین صاحب کے اکیس سالہ دور نظامت میں کی۔ چنانچہ دار الاقامہ کی توسیع، کتب خانہ کی جدید عمارت، مسجد کی تزئین، ملحقہ اراضی پر توسیع مدرسہ، مسجد کے وضوخانے اور اس سے ملحق عمارت یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ ایک طویل فہرست ہے۔

آپ جیسا تعمیری ذوق شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ کبھی کوئی نقشہ نہیں بنایا اور کسی قسم کا ہوم ورک نہیں کیا بلکہ جو چیز ذہن میں آتی اس کو صبح میں عملی جامہ پہنانے کے لئے کمربستہ ہوجاتے۔ چنانچہ جتنا بھی کام ہوا وہ صرف اور صرف آپکی اپنی پسند پر مشتمل تھا اور اس میں اپنی کوشش کا عمل دخل ہوتا تھا۔ شدید گرمی، سردی کے موسم میں بھی کئی کئی گھنٹے متواتر کھڑے ہوکر اپنی نگرانی میں کام کراتے تھے۔

شاعری میں خاصا ذوق تھا آپ حامدؔ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا کچھ کلام محفوظ ہے، جس کو راقم نے ترتیب دیا ہے اور ان شاءاللہ جلد منظر عام پر آئے گا۔ آپ کی شاعری میں روایتی غزلوں کے علاوہ ملی نظمیں اور کچھ نظمیں ہیں، اسلامی افکار اور آزادی ہند کی کافی جھلک آپ کی شاعری میں ملتی ہے۔

آپ ایک خوددار اور وضعدار آدمی تھے۔ ٹوٹ کر ملنے کا ہنر جانتے تھے، گو کہ آپ کا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا لیکن جس سے تعلق ہوگیا تو کبھی قطع نہیں کیا، طبیعت میں غصہ زیادہ تھا، قوتِ برداشت کم تھی لیکن مراتب کا خیال کرتے تھے۔ آپ جیسا بارعب شخص بہت دیکھنے میں آتا ہے۔ کپڑے پہننے میں نفاست کا عمل دخل رہتا، ہمیشہ خوشبو میں تر رہتے، کوئی بھی آپ کو دیکھ کر آپ کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، آخر عمر تک آپ کا یہی وطیرہ رہا۔ خاندان میں بھی آپ کو ایک مرکزی حیثیت تھی حالانکہ آپ سے بڑے دو اور بھائی تھے لیکن خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کا ہر چھوٹا بڑا احترام کرتا تھا۔

۴ نومبر ۱۹۹۵ء کو اچانک طبیعت خراب ہوئی، آپ کو میرٹھ کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ لیکن ۵ نومبر ۱۹۹۵ء کو اس شخص نے سب سوگوار کر دیا اور اپنے خالقِ حقیقی سے ۶۷ سال کی عمر میں جاملا

اُس شخص کو جانے کی جلدی تھی بہت

آپ کے لواحقین میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر شہزادی خاتون، رشدہ خاتون، غفرانہ خاتون، حنانہ خاتون، مولانا سید فرید الدین، راقم ندیم ماہر، سید وسیم الدین اور سید فہیم الدین فاکر ہیں۔ آپ کی اہلیہ شاہدہ خاتون کا انتقال ۲۰۰۵ء میں ہوا۔

☆☆☆

چوتھا باب

تذکرہ الشعراء

حضرت مولانا ناطقؔ گلاوٹھوی مرحوم

(دیوان ناطق سے ماخوذ)

نام وسلسلہ نسب: حضرت مولانا مرحوم کا اسم گرامی ابوالحسن، والد بزرگوار کا نام ظہورالدین حسن اور تخلص ناطقؔ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب بغداد شریف کی مقدس سرزمین گیلان کے سادات خاندان سے ملتا ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ مولانا سید منہاج الدین اٹھارہویں صدی عیسوی میں احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے۔ آپ ان کی پشت میں ساتویں پوتے تھے۔

شجرہ خاندان: مولانا سید منہاج الدین کی پشتوں میں ایک بزرگ عزالدین کا پتہ چلتا ہے جو مولانا ناطقؔ مرحوم کے تیسرے دادا تھے۔ شجرہ خاندان حسب ذیل ہے۔

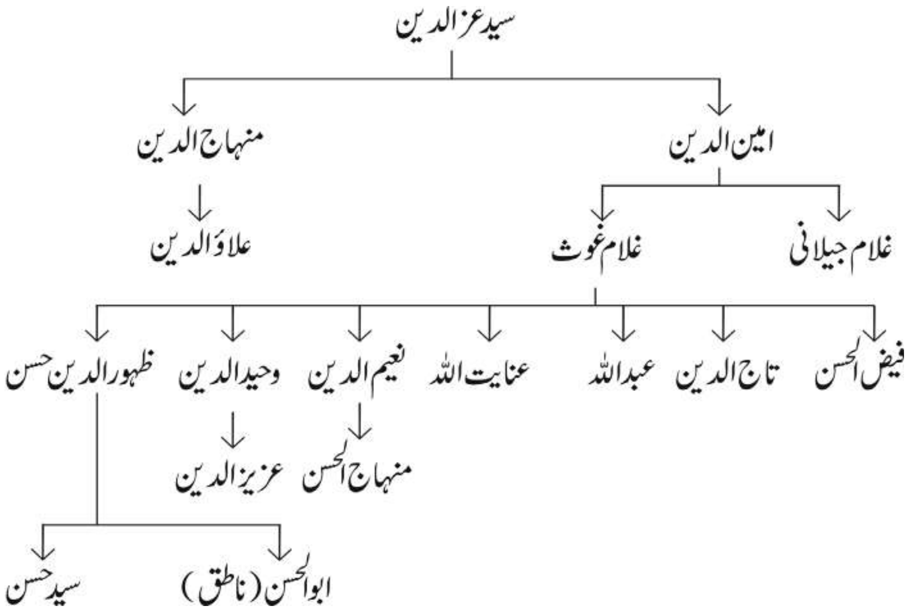

خاندانی حالات: سید عزّ الدین کے پوتے سید غلام غوث قصبہ گلاوٹھی کے رہنے والے تھے۔ وہ میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ گلاوٹھی اور اس کے اطراف میں آپ کی بڑی جائیداد اور زمینداری تھی۔ سید غلام غوث کے 7 بیٹے تھے۔ سب سے بڑے سید فیض الحسن ڈپٹی کے نام سے مشہور تھے۔ موصوف ریاست بہاولپور کی وزارت عظمیٰ کے ساتھ منصف اعلیٰ کے منصب پر فائز

رہ کر وہیں انتقال فرمایا۔ وہ عالم، ادیب، شاعر تھے اور فن خطاطی میں ایک مخصوص طرز کے مالک بھی تھے۔ ان کے متجر علمی، اعتقاد، پرہیزگاری کے نواب صاحب والی بہاولپور بہت زیادہ گرویدہ تھے۔ پنجاب کے مشہور بزرگ حضرت چاندنی شاہ کے مرید تھے۔ آپ کے اہل دل و صاحب باطن ہونے کی بہت سی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ بہاولپور میں آپ کا مزار مبارک اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔

غلام غوث کے دوسرے بیٹے سید تاج الدین پنجاب میں تحصیلدار تھے۔ وہیں ملازمت کے دوران فوت ہوئے۔ تیسرے بیٹے سید عبداللہ اپنے برادر بزرگ سید فیض الحسن صاحب کے ساتھ بہاولپور میں رہتے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ چوتھے بیٹے سید عنایت اللہ اپنی والدہ اور تین چھوٹے بھائی سید نعیم الدین، سید وحید الدین اور سید ظہور الدین حسن کے ساتھ گلاوٹھی میں مقیم تھے اور جدی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی فوج نے جب حکومت برطانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ریاست مالاگڑھ (ضلع بلند شہر) کے حکمران نواب ولی داد خان نے اس ہنگامہ میں بڑی سرگرمی دکھائی مگر ان کا پانسا الٹا پڑا اور وہ بھاگ کر روپوش ہو گئے۔ شعلہ بغاوت جب سرد پڑا اور باغیوں کی گرفتاری اور دار و رسن کا سلسلہ شروع ہوا تو گلاوٹھی کے ایک شخص نے سید عنایت اللہ کو نواب مذکور کا شریک کار بتا کر گرفتار کرا دیا۔ انگریز عنایت اللہ کو پکڑ کر بلند شہر لے گئے اور بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں مقدمہ چلائے بغیر تختہ دار پر لٹکا دیا۔ پھانسی کے وقت ان کی عمر بمشکل ۱۸ سال رہی ہوگی۔ انگریزوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تمام جدی جائیداد اور مال اسباب ضبط کر کے نیلام کر دیا اور دستاویزات کو جلا ڈالا۔ اس واقعہ سے قصبہ گلاوٹھی میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ عنایت اللہ کے چھوٹے بھائی سید نعیم الدین جو اس وقت صرف ۱۴ سال کے تھے اپنے 2 چھوٹے بھائیوں سید وحید الدین اور سید ظہور الدین حسن کو جن کی عمر بالترتیب دس اور سات برس کی تھی اپنے ساتھ لے کر وسط ہند کی طرف بھاگ آئے اور بھنڈارہ (مہاراشٹر) پہنچے۔ یہاں وہ اپنے خالہ زاد بھائی کے مکان میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہونے تک چھپے رہے۔

سید نعیم الدین نے بڑے ہو کر کامٹی (ضلع ناگپور) میں سکونت اختیار کی اور وہیں ملازم ہو گئے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر سید منہاج الحسن مرحوم وزیر صحت سابق مدھیہ پردیش نے وسط ہند میں بہت نام پیدا کیا۔ ان کے علاوہ ان کے اور صاحبزادے نامی گرامی رہے ہیں جن کی باقیات الصالحات اب بھی موجود ہے۔

سید ظہور الدین حسن نے رائے پور میں بود و باش اختیار کر کے وہاں تجارت شروع کی اور محکمہ ریلوے کو عمارتی لکڑی فراہم کرنے لگے۔ وہ ایک اچھی قابلیت و صلاحیت کے انسان تھے اور عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں رائے پور میں انتقال فرمایا۔ اپنے پیچھے دو بیٹے اور چار بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام سید ابوالحسن تھا۔ یہی سید ابوالحسن بعد میں مولانا ناطق گلاوٹھوی کے نام سے دنیائے شعر و ادب میں مشہور ہوئے۔ چھوٹے بیٹے سید حسن نام کے تھے جو تیس برس کی عمر پا کر ۱۹۲۵ء میں چل بسے۔ وہ بھی شاعر تھے۔ حسن تخلص کرتے تھے۔ اگر زندہ رہتے تو اچھے شاعر نکلتے۔

مقام و تاریخ پیدائش: مولانا ناطق محلّہ وارث پور کامٹی (ضلع ناگپور۔ مہاراشٹر) میں ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔

سات برس تک آپ کی نشو و نما کامٹی کی آب و ہوا میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت: کامٹی میں اردو، فارسی اور کچھ عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۴ء میں اپنے آبائی وطن گلاؤٹھی چلے گئے جہاں فارسی کا نصاب، وہاں کی ایک برگزیدہ ہستی مولانا عبدالعزیز صاحب بزاز سے ختم کیا۔ گلاؤٹھی ہی کے مدرسہ منبع العلوم میں جسے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے قائم کیا تھا عربی کا بیشتر حصہ پڑھا۔ وہیں دوران تعلیم درس و تدریس کا کام بھی اعزازی طور پر انجام دیا۔ بعدازاں مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ الہند مولانا محمودالحسن صاحب اسیر مالٹا سے دورۂ حدیث کیا اور وہیں سے علوم عربیہ کی سند لی۔ یہیں مولانا شیخ الہند کے چھوٹے بھائی حکیم احمد حسن صاحب سے کتب طب پڑھیں۔ آپ کے اساتذہ مدارس میں مذکورہ حضرات کے علاوہ مولانا عبداللہ صاحب امبیٹھوی، مولانا محی الدین صاحب گلاؤٹھی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد حسن مرادآبادی اور مولانا ماجد علی جونپوری جیسے محدث منطقی حضرات تھے۔

دوران تعلیم آپ کا رجحان کھیل کود کی طرف زیادہ رہا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس طرف کوئی رغبت نہیں رہی۔

آپ نے انگریزی، مراٹھی اور ہندی زبان کسی اسکول میں نہیں پڑھی مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ زبانیں بھی لکھ بول سکتے تھے۔

شاعری: آپ نے ۱۹۰۰ء میں جب آپ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے، مولانا سید معشوق حسن اطہرؔ ہاپوڑی کی تحریک پر شعر گوئی شروع کی۔ ابتداء میں آپ کے اساتذۂ مدارس، ہم جماعت احباب اور اعزہ نے آپ کو اس سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ اس لیے چوری چھپے اپنے اس ذوق کی تکمیل کرتے رہے۔ اس زمانے میں دیوبند میں انسان کے لیے بسلسلہ معقول حیوان ناطق کی اصطلاح عام تھی۔ جب آپ کو تخلص کی فکر ہوئی تو لفظ ''ناطق'' بہت زیادہ مناسب معلوم ہوا چنانچہ آپ نے یہی تخلص رکھ لیا۔

پہلے آپ نے سید محمد مرتضٰی میاں یزدانی میرٹھی (۱۸۵۰ء۔۱۹۰۰ء) کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا مگر چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور آپ ان سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے۔ ابتداء میں آپ کی نظر مولانا اطہرؔ ہاپوڑی کی طرف بھی اٹھی تھی جو آپ کی شاعری کے محرک بھی تھے اور عزیز بھی مگر بعض وجوہ کی بنا پر ان کا تلمذ اختیار نہ کر پائے۔

مولانا عبدالرحمٰن راسخؔ دہلوی کو بھی استاد بنانے کا خیال آیا مگر یہاں بھی چند وجوہ مانع ہوئیں۔ سید محمد اسماعیل منیرؔ شکوہ آبادی اور فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) کے کلام کا عمیق مطالعہ فرمایا۔ مرزا داغؔ کے مجموعوں میں ''آفتاب داغ'' آپ کو بہت زیادہ پسند آیا۔ اس زمانہ میں یہ دیوان آپ کو پورا حفظ ہو گیا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنے والد صاحب کے مشورہ سے بذریعہ خط و کتابت حضرت داغؔ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ایک سال کے بعد حضرت داغؔ بھی داغ مفارقت دے گئے اس کے بعد آپ نے کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ آفتاب داغؔ اور اپنے ذوق کو رہبر بنایا اور اپنے کلام پر خود ہی اصلاح کی نظر کی۔

آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ شروع میں نظم نگاری مگر بعد میں زیادہ تر غزل مرغوب طبع رہی۔

تلامذہ: برصغیر ہند و پاک کے اکثر مقامات پر آپ کے شاگرد تھے مگر آپ نے ان کی کوئی فہرست نہیں رکھی۔ آپ کے بعض قابل ذکر شاگردوں میں جنہوں نے آپ سے مسلسل اصلاح لی، سید امیر حسن امیرؔ گلاٹھوی، مولوی عبدالباری آسیؔ الدنی، مولانا

محمد غضنفر حسین شاکر نائطی، ڈاکٹر ممتاز احمد خان خوشتر کھنڈوی، مرزا اظفر حسین ظفر ناگپوری اور سلیم احمد زخمی راز مانوی قابل ذکر ہیں۔

خطابات واعزازات: آپ کو اپنی زندگی میں ملک کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے متعدد خطابات ملے مگر آپ نے خود نہ اپنے نام کے ساتھ کبھی کسی خطاب کو استعمال کیا اور نہ دوسرے صاحبان کے استعمال پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ آپ کے خطابات واعزازات کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

☆ ''رونق بزم سخن'' ''شاعر پُرفن'' ۱۹۱۳ء

☆ ''عمدۃ الشعراء'' ۱۹۱۵ء ہاپوڑ

☆ ''پیر مغاں خمخانۂ سخن'' ۱۹۲۴ء میرٹھ

☆ ''فخر المتاخرین'' ۱۹۳۰ء لکھنؤ

☆ استاذ الاساتذہ ۱۹۴۰ء لکھنؤ

۱۹۵۵ء میں حکومت ہند نے آپ کی ادبی وشعری خدمات کے سلسلہ میں مبلغ ایک صد روپیہ ماہوار تاحیات ادبی وظیفہ مقرر کیا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کی اہلیہ کو حکومت مہاراشٹر کی طرف سے اب بھی وظیفہ جاری ہے۔

آپ کے انتقال کے بعد ناگپور میونسپل کارپوریشن نے آپ کی یاد قائم رکھنے کے لیے آپ کی رہائش گاہ کے بالمقابل شاہراہ اور شہر کے خوشنما جمعہ تالاب کے ایک چوراہے کو علی الترتیب ''مولانا ناطق روڈ'' اور ''مولانا ناطق چوک'' کے نام سے موسوم کیا۔

تصنیفات:

(الف) ''نطق ناطق'' نظموں کا مجموعہ — اشاعت ۱۹۱۳ء شمس المطابع میرٹھ

(ب) ''کلیل میں غلیل'' ایک طویل مکتوب — اشاعت ۱۹۵۰ء برقی کوثر پریس بنگلور

(ج) ''سبع سیارہ'' مکاتیب، مضامین کا مجموعہ — اشاعت ۱۹۶۰ء نفیض عام پریس لکھنؤ

(د) ''کنز المطالب'' شرح دیوان غالب — اشاعت ۱۹۶۸ء مکتبہ دین ادب لکھنؤ

(ھ) ''دیوان ناطق'' مجموعہ کلام — اشاعت ۱۹۷۶ء تعاون مہاراشٹر اردو اکیڈمی

غیر مطبوعہ تصانیف میں ''تصریحات اردو''۔ استفسارات وجوابات''۔ ''مجموعہ مضامین'' اور کچھ کلام شامل ہے۔ آپ کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ محفوظ کلام جو طبع ہوا ایک اندازے کے مطابق صرف دس فیصد ہے۔ اگر یہ تمام کلام شائع ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا اور ہزاروں تشنگان ادب اس سے استفادہ کر کے سیراب ہوتے بلکہ خود مرحوم کو بھی اسی زمانے میں دنیائے شعر وادب میں مناسب مقام ملا ہوتا۔ افسوس! اس وقت کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ وجوہ کچھ ہی رہی ہوں مگر یہ تاریخ اردو ادب کا ایک زبردست المیہ ہے۔

بیماری وانتقال: ۲۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کو آپ کی طبیعت خراب ہوئی، آپ کو ناگپور کے ہی میور میموریل اسپتال میں داخل کیا

گیا۔ چار پانچ ماہ کا عرصہ بڑی تکلیف میں گزارا۔ نقل وحرکت سے مجبور تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کو حالت تشویش ناک ہوگئی اور اسی دن رات بارہ بجے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ناگپور ریڈیو اسٹیشن نے خبرمرگ نشر کی جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ سہ پہر کو آپ کی قیام گاہ محلّہ لشکری باغ سے جنازہ اٹھا۔ جلوس جنازہ میں ناگپور بلدیہ کے عہدیداران وممبران، سرکاری افسران، شعراء حضرات، عمائدین شہر اور بلا امتیاز مذہب وملت آپ کے نیازمندوں کی کثیر تعداد شریک تھی۔ بعد نماز عصر مسجد امان اللہ کے میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور سر شام مسلم قبرستان مومن پورہ میں سپرد خاک کردیے گئے۔

☆☆☆

سید ابوالحسن ناطقؔ گلاؤٹھوی

مولانا سید اصلح الحسینی

قصبہ گلاؤٹھی میں سادات کی آبادی کی اکثریت زیدی سلسلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ حسنی اور حسینی سادات کے وہ چند سلسلے جو گلاؤٹھی میں آباد ہوئے وہ انہی سادات کی رشتہ داریوں کے حوالہ سے اس بستی میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ابوالحسن ناطقؔ گلاؤٹھوی مرحوم کا خاندان بھی ان کے اپنے شجرۂ نسب کے اعتبار سے حسنی سادات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں سے جو لوگ گلاؤٹھی میں آباد ہوئے ان میں سے بعض نے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں دوسرے مقامی سادات کے کنبوں کے ساتھ سرگرم حصہ لیا تھا، جس کی پاداش میں آپ کے چچا سید عنایت اللہ کو ۱۸ سال کی عمر میں بلند شہر کے بدنام خونی درخت پر جو کالے آم کے نام سے مشہور تھا پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

ناطق کے جدی مکان کے ہم دیوار ایک دوسرا خاندان آباد تھا جو بعد میں مقبروں کے خاندان کے نام سے بدنام ہوا، جو ویران ہو گیا یا ترک سکونت کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہو گیا تھا۔ اسی خاندان کے کسی شخص کی مخبری کی بنیاد پر ابوالحسن ناطق کے یہ عزیز گرفتار ہوئے اور انہیں موت کی سزا دی گئی۔ گلاؤٹھی کے گردونواح سمکولہ وغیرہ کے مواضعات میں ان کی زمینیں تھیں جن میں سے بہت سی بغاوت کی پاداش میں ضبط ہو گئیں، کچھ بچیں تو اس قابل نہ رہیں کہ وہ معیشت کا سہارا بن سکتیں۔ اس لئے یہ خاندان نچلے متوسط طبقہ کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ ابوالحسن ناطق قصبہ گلاؤٹھی کی جس فضا میں پروان چڑھے وہ بڑی پُر جوش، دینی، روحانی اور ادبی فضا تھی۔ انہوں نے ابتدا میں اسی قصبہ کے اہل علم حضرات سے جن میں محمد حسین یقین سے دینی تعلیم حاصل کی اور فارسی ادبیات میں بڑی بصیرت اور دقتِ نظر پیدا کی۔

قصبہ کی عام ادبی فضا سے متاثر ہو کر انہوں نے شعر گوئی کی طرف توجہ دی لیکن خاندانی بزرگوں کی طرف سے ان کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ ان کے معاصرین میں محمد حسین کے دو صاحبزادے شمس الحق خیالؔ اور انوار الحق کمالی مولوی محمد صالح، صوفی کرم حسین، مولانا بدرالدین، مولانا محی الدین، حاجی ریاض الدین اور عبدالوحید فداؔ جیسے علم دوست حضرات شامل تھے۔

مدرسہ منبع العلوم کے جن اساتذہ سے انہوں نے علمی استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اور بانی مدرسہ منبع العلوم کے داماد پیرجی عبداللہ انصاری اور ان کے بعد مولانا ماجد علی جونپوریؒ جو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تلامذہ حدیث میں تھے، مولانا محمد حسن مراد آبادی جو بعد میں بھوپال کے قاضی القضاۃ اور نواب بھوپال کے اتالیق مقرر ہوئے۔ منبع العلوم میں متوسط درسیات کی تکمیل کے بعد وہ دیوبند گئے جہاں انہیں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ سے علم حدیث

کی تکمیل کا موقعہ ملا اور اس کے بعد وہ اپنے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے روحانی حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔

بھوپال کی حکمراں سلطان جہاں بیگم حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھیں، جن کو مولانا گنگوہی نے اس شرط پر بیعت کیا تھا کہ وہ اس روحانی نسبت کا اظہار نہیں کریں گی تاہم اس نسبت کے تعلق سے سلطان جہاں بیگم نے حضرت گنگوہی کے تلامذہ اور مریدین میں سے بہت سے افراد کو بھوپال میں کسی نہ کسی خدمت کے حوالہ سے جمع کیا۔ ان میں مولانا محمد حسن مرادآبادی قاضی بھوپال اور ان کے شاگردوں میں سے ابوالحسن ناطق، حکیم محمد صالح اور کئی دوسرے اشخاص کچھ عرصہ بھوپال میں مقیم رہے۔ ابوالحسن ناطق کو ریاست کی گھٹی ہوئی فضا میں وہ آزادی محسوس نہیں ہوئی جس کو ان کی آزاد پسند طبیعت تلاش کرتی تھی۔ اس لئے وہ اور ان کے کئی ساتھی جلد ہی بھوپال سے وطن گلاؤٹھی واپس آ گئے۔ ابوالحسن ناطق مرحوم کی اپنے تائے کے گھر شادی ہوگئی تھی لیکن ان کو گھریلو زندگی کے قیود سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں تھی ان کے اکثر معاصرین قصبہ کی اس ادبی فضا سے منہ موڑ کر معاشی وسائل کی تلاش میں منتشر ہو چکے تھے اور اس علمی وادبی فضا پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اپنی خاندانی الجھنوں اور گھر کے باہر مجلسی زندگی کی اس ویرانی سے اکتا کر ابوالحسن ناطق نے بھی اپنے بیوی، بچوں اور گھرانے کو چھوڑ کر C.P کا رخ کیا جہاں رائے پور وغیرہ مختلف مقامات میں ان کے دور کے رشتہ دار مقیم تھے۔

ناگپور میں ناطق نے اپنی دنیا آپ پیدا کی، وہ ادبی ذوق جو وہ گلاؤٹھی اور ہاپوڑ کے اپنے بعد سینئر رفقاء ان صحبتوں میں پروان چڑھا چکے تھے ان کا سہارا تھا۔ داغؔ دہلوی مرحوم کا وہ مکتب ادب جو اس قصبہ اور اس کے گردونواح کی ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا، ناطق کے لئے بھی دلکش تھا اسی کی پیروی میں انہوں دادِ سخن گوئی دی اور نہ صرف C.P کے مشاعروں میں بلکہ دہلی، لکھنؤ، علیگڑھ اور مختلف مقامات پر کل ہند مرکزی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ادب اور شعر پر تنقید کے سلسلہ میں ان کے مختلف مضامین دلی اور لکھنؤ کے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ناگپور میں رہتے ہوئے انہوں نے وہ مقام اور اعتبار حاصل کیا کہ ایک مرتبہ وہ کل ہند مرکزی مجلس قانون ساز میں منتخب ہو کر بھی دہلی آتے جاتے رہے۔ وہ طرز داغؔ کے شیدائی تھے اور اس کی تبلیغ اور دفاع میں آخری عمر تک سرگرم جدوجہد کرتے رہے اور اس تسلسل میں ان کی داغؔ کی طرف منسوب ہونے والے بعض مشہور اساتذہ سے چشمکیں بھی چلتی رہیں۔ اور امیرؔ مینائی یا مومنؔ کے مدرسہ شعر وسخن سے تعلق رکھنے والے گلاؤٹھی کے بعض اساتذہ شعر وسخن پر بھی انہوں نے کہیں کہیں چھینٹے پھینکے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں وہ برسہا برس کے بعد اپنے وطن گلاؤٹھی کچھ دن قیام کے لئے واپس آئے اور اپنے جدی گھر کے بجائے خود اپنے وطن میں ایک غریب الدیار مہمان کے طور پر اپنے ایک دوست منشی صفی اللہ کے محل پر مقیم رہے۔ اسی زمانہ میں مجھے کراچی سے گلاؤٹھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ابوالحسن ناطق کو کسی نے بتایا کہ ان کے ایک مرحوم دوست مولوی محمد صالح کے صاحبزادے آئے ہوئے ہیں، یہ سنتے ہی وہ خود ملاقات کے لئے آئے، دوران گفتگو اندازہ ہوا کہ ان کے مخصوص تلامذہ میں اکرام

اللہ اور بیگم شائستہ اکرام اللہ کراچی میں مقیم ہیں، پاکستان آنے کے بارے میں جب ان سے درخواست کی تو وہ کچھ نیم دلی کے ساتھ اس نقل مکانی کے لئے آمادہ تھے مگر آخر کار وہ پاکستان نہ آسکے۔گلاؤٹھی کے قیام سے وہ جلدی اکتا گئے جواب ان کے لئے ایک ویرانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی، جہاں انہوں نے اپنے آغاز شباب کی امنگیں دفن ہوتے دیکھی تھیں، ان کا ایک شعر وطن سے ان کی اکتاہٹ کا ترجمان ہے ۔

خیال اہل وطن آ گیا جب اے ناطقؔ
وطن ہی کہنے کے قابل گلاؤٹھی نہ رہی

☆☆☆

سید محمد حسین یقیںؔ

(فارسی تخلص ہجرؔ) (اردو اور فارسی ادب کے نامور شاعر و ادیب)

مولانا سید اصلح الحسینی

گلاؤٹھی کے مشہور خاندانوں میں ایک پلولیہ خاندان ہے۔ ان کی وجہ شہرت علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات ہیں۔ اس خاندان کے ایک مشہور فرد محمد بخش صاحب مرحوم کی تصنیف شجرۃ الاقارب کی تفصیلات کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ بابر کے عہد میں اس قصبہ میں جاگیردار کے طور پر آباد ہوئے تھے اور عالمگیر کے زمانہ میں اس خاندان کے کئی افراد پلول میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان پلولیہ کہلاتا ہے۔ اس خاندان کی ایک مشہور شخصیت غلام سرور مرحوم تھی جن کے ایک بیٹے ولایت علی مرحوم ان بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے اس قصبہ میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالنے میں منشی سید مہربان علی مرحوم کا بھرپور ساتھ دیا۔ غلام سرور مرحوم کے دوسرے دو صاحبزادے فدا علی اور واجد علی مرحوم تھے جو روحانیت اور علمی حیثیت سے بڑی معتبر اور ممتاز شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ فدا علی مرحوم کے دو صاحبزادے محمد حسین اور احمد حسین ادبی اور معاشرتی اعتبار سے قصبہ کے نمایاں لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ محمد حسین یقیںؔ دہلی کی مشہور اور ممتاز صاحب تذکرہ شخصیت مولانا امام بخش صہبائی کے بڑے محبوب اور ممتاز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ طالب علمی کے دوران اپنے استاد کی خدمت میں دہلی میں قیام کیا۔

سر سید احمد خان سے آپ کے خصوصی مراسم تھے۔ سر سید احمد خان کی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' میں امام بخش صہبائی کے ساتھ آپ کا تذکرہ آپ کی علمی اور ادبی عظمت کا اعتراف ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خان آثار الصنادید صفحہ ۳۴۰، مطبوعہ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی'' میں رقم طراز ہیں:

''شاخسار سخنوری کی بلبل نغمہ طراز، شکرستان معنی پروری اور معنی آفرینی کی طوطی شکر گفتار مولوی محمد حسین ہجرؔ امام بخش صہبائی کے شاگرد رشید تھے۔ فارسی نظم، نثر، ادب عالیہ کی تمام درسی کتب کی تعلیم انہی سے حاصل کی اور شعر گوئی و سخنوری کی مشق انہی کی نظر التفات سے بہم پہنچائی۔ مروجہ درسی کتابوں کی تحقیق اور ان میں چھپے ہوئے رموز و اسرار کی نکتہ آفرینی نہایت خوبی کے ساتھ بہم پہنچائی۔ فارسی نعت و اصلاح زبان پر نہایت وسیع نظر ہے اور زبان و دری محاورہ پوری طرح پیروی میں کمال پیدا کیا ہے۔ نظم و نثر کی تحریر و انشا پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ چند اشعار بطور یادگار ہدیہ ارباب شوق کرتا ہوں۔

در جواب شکوہ ہائے کم نگاہی ٔ ہائے ناز   سرمہ گویا می کند چشم ترا نازم حیا
مدار و تاب مینش دیدہ حسن بے حجابش را   کہ باشد حیرت چشم نقا بے آفتابش را
زشوقش صد تپش فرسودہ دل اور نجل دارم   رم آہو نماں درکن سپارو اضطرابش را

محمد حسین یقینؔ فارسی اور اردو ادب کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ان سے استفادہ کرنے والوں کے وسیع حلقہ کا تو علم حاصل نہیں ہوسکا لیکن قصبہ میں بہت سی اہم شخصیات نے جو بعد میں اپنی جگہ ممتاز ادبی شخصیات شمار کی گئیں آپ سے استفادہ کیا۔ان میں سید عبدالوحید فداؔ، ابوالحسن ناطقؔ اور عبدالرشید واسطی بڑے ممتاز ہوئے۔آپ کا شمار اردو اور فارسی کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔فارسی میں آپ ہجرؔ تخلص کرتے تھے اور اردو میں یقینؔ۔ہماری خوش قسمتی سے ان کے اردو کلام کا ایک قابل لحاظ مجموعہ ہمیں انہی کے سلسلہ نسب کی ایک شخصیت جناب تنویرالحق واسطی کی عنایت سے حاصل ہوگیا ہے جو نسبی اعتبار سے آپ کے پرپوتے ہیں۔آپ کے دیوان سے چند اشعار بطور نمونہ اور یادگار پیش کیے جاتے ہیں۔

جب کسی سے کلام ہوتا ہے ذکر تیرا تمام ہوتا ہے
ختم ہوتی ہے آپ کی شہرت میرا قصہ تمام ہوتا ہے
میرے جانے سے ان کی محفل کا تہ و بالا نظام ہوتا ہے
آج جاتا ہوں سامنے ان کے دیکھیے کیا کلام ہوتا ہے
ایسے بیزار ہو تو بندہ نواز رخصت اب یہ غلام ہوتا ہے

مل جائے زندگی میں فقط ایک تو مجھے اس کے سوا نہیں ہے کوئی آرزو مجھے
شوریدگی جنوں میں نہیں مجھ کو بے سبب الفت پھرا رہی ہے تری کو بکو مجھے
تجھ سے سوا نہ کیوں ہو تصور ترا عزیز جب آنکھ بند کی نظر آیا ہے تو مجھے
پڑھنا ہوئی ہے جب کبھی مجھ کو نماز عشق کرنا پڑا ہے خون جگر سے وضو مجھے

☆

سنا ہے عیادت کو وہ آ رہے ہیں یقیںؔ یہ خبر مجھ کو اچھا نہ کر دے
وہ ایک طرح کا تعلق ہے جو مجھے ان سے بہلا رہا ہوں مگر یاد آئے جاتے ہیں
جس میں لطف زندگی حاصل نہ ہو ایسے جینے سے یقیںؔ مر جائیے
یقیںؔ یہ زندگی بھی کوئی اپنی زندگی ٹھہری نہ وہ اپنے نہ گل اپنے نہ گلشن کی بہار اپنی

آپ کا سن وفات معلوم نہیں ہوسکا۔قیاس یہ ہے کہ چودھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں آپ کی وفات ہوئی ہے اور اپنے والد کے پہلو میں مشہور قبرستان مقبرہ کے بالمقابل تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆

سید عبدالوحید فدؔا گلاؤٹھوی

(مکتب داغ کے ایک قادر الکلام شاعر)

سید منصور عاقل

اردو شاعری کا دامن بے حد وسیع ہے۔ دنیا کے کسی بھی زبان وادب کے مشاہیر سے ہم اپنے شعراء کا مقابلہ وموازنہ نہایت سرخروئی سے کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خود اردو زبان اپنی وسعت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اردو کے لسانی ارتقاء کی کہانی صرف ایک زبان کی داستان نہیں بلکہ اس میں ہندی و سنسکرت، فارسی وعربی اور ترکی و نیز بعض یورپی زبانوں کی نشو ونما کے قصے بھی ملتے ہیں۔ اردو شاعری کا کلاسیکی دور خاص طور پر شخصیتوں اور افکار کی بوقلمونی کے باعث ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کلاسیکی شعر وادب کا سرمایہ معروف شخصیات اور ان کی نگارشات ہی کے حوالے سے اس قدر نمایاں ہے کہ ہم اس پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ کاش ہمارے سرمایہ افتخار میں ان بزرگوں کی قلمی کاوشیں بھی شامل ہوتیں جن کے چہرے سے تاریخ پردہ اٹھانے سے قاصر رہی ہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں، میں اپنے نانا جناب سید عبدالوحید فدؔا کو شمار کروں گا جنہیں آج ادبی تاریخ کے تسلسل کے حوالہ سے شبستان شاعری کا چراغ تہہ داماں قرار دیا جاسکتا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو فدؔا صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا غلغلہ سنا۔ انہیں دیکھا تو صرف اس قدر کہ وہ آخری عمر میں صاحب فراش تھے اور فالج کے مرض میں مبتلا ہونے کے سبب چلنے پھرنے سے معذور۔ مجھے یاد ہے کہ گلاؤٹھی میں دور دور سے ان کے شاگردان کی خدمت میں حاضر ہوتے جن میں غیر مسلم شعراء بھی شامل ہوتے اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ اپنے استاد کا جس قدر احترام کرتے تھے ہم اس دور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس ارادت وعقیدت کا اظہار ان کے شاگرد موہن لعل شفیؔق جو قصبہ پاپوڑ کے ایک متمول شخص تھے، اور لاڈلی لعل لائؔق جو اٹاوہ کے مشہور وکیل تھے خاص طور پر کرتے۔ گلاؤٹھی میں متعدد حضرات ایسے تھے جو باقاعدگی سے فدؔا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ ان میں محمد اسحٰق واصؔف بھی تھے جنہیں فدؔا صاحب اکثر اپنا تازہ کلام املا کراتے۔ شعر و شاعری میں شغف رکھنے والے لوگوں میں کم ہی ایسے لوگ تھے جو فدؔا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف بحور وقوافی میں غزلیں املا کرا کے نہ لے جاتے ہوں۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا سلسلہ تو گویا ایک ادنیٰ بات تھی۔ استاد شاگرد کے درمیان فکری وشعری روابط کا یہ انداز کلاسیکی دور کی نمایاں خصوصیت ہے جس کے لیے مصحفؔی وانشاؔ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ خود داغ دہلوی کی قادر الکلامی اور شعر بخشی کا بھی یہی حال تھا جو ان کے خاص تلامذہ میں جس میں فدؔا صاحب بھی شامل تھے ورثہ کی صورت میں منتقل ہوا۔ بہر حال فدؔا صاحب کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کی داستانیں بھی ان کے عہد میں عام تھیں۔ ان کے کلام کا جو کچھ بھی حصہ ہمیں میسر آ سکا ہے وہ موجودہ حالات میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کی شاعرانہ عظمتوں کو خراج عقیدت پیش کرنے

کے لیے غنیمت ہے۔

میرے بڑے بھائی مرحوم علامہ سید قابلؔ گلاوٹھوی شاعری میں فداؔ صاحب کے شاگرد تھے اور جانشین بھی۔ ان کے بارے میں فدا صاحب نے ایک جگہ کہا ؎

قابل مری کھلتی ہوئی کلیوں کا تبسم
شاداب اسی پھول سے گلزار فدا ہے

چنانچہ میں نے قابلؔ صاحب سے فداؔ صاحب کے اشعار اکثر سنے اور اپنی والدہ مرحومہ سے بھی جو خود ایک اچھا ادبی مذاق رکھتی تھیں اور کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں، لہٰذا فدا صاحب کی شعر گوئی سے متعلق ابتداءً میری معلومات اس سے زیادہ نہ تھیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں گورنمنٹ کالج میانوالی میں سیاسیات کا لیکچرر تھا تو کالج کی لائبریری میں ایک کتاب بعنوان ''ترکش'' میری نظر سے گزری۔ یہ کتاب احسان دانشؔ مرحوم کی مرتب کردہ تھی جو مختلف شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل تھی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کتاب میں میرے نانا فداؔ صاحب کا انتخاب کلام بھی موجود تھا۔ یہی نہیں بلکہ گلاوٹھی کے دیگر شعراء کے کلام سے بھی انتخاب کیا گیا تھا۔ جس میں مشتاق علی مضطرؔ مرحوم اور سید امیر حسن امیرؔ گلاوٹھوی شامل تھے۔ ترکش میں فدا صاحب کے جو اشعار دیے گئے تھے ان میں سے مندرجہ ذیل دو شعر مجھے ہمیشہ یاد رہے ؎

ہوا ہے کون سرگرم تبسم | کہ پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے
مری چھوٹی ہوئی نبضوں سے پوچھو | کہ ان کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے

چنانچہ یہیں سے میری آتش شوق میں اضافہ ہوا اور مجھے آخر کار کراچی کے دوران قیام فداؔ صاحب کا کچھ کلام حاصل کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ ان کے کلام پر مشتمل ایک رجسٹر مجھے اپنے ماموں زاد بھائی اور فداؔ صاحب کے پوتے سید مشیر حسن واسطی سے ملا جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ اس میں فداؔ صاحب کا بیشتر اردو کلام اور کچھ فارسی کلام غالباً ان کے اپنے خط میں مندرج ہے، جیسا کہ اساتذہ قدیم کا طریقہ تھا ان کی اِس بیاض میں حروف تہجی کا اہتمام نظر آتا ہے۔ چنانچہ صفحہ اول پر ردیف ''الف'' کے تحت جو حمد باری تعالیٰ درج ہے اس کا مطلع ہے ؎

رخ آئینہ حیرت طلسم کن فکاں تیرا
بہار باغ قدرت رقص مرغ خواں تیرا

اس کے علاوہ فداؔ صاحب کی ایک اور بیاض ان کے حقیقی بھتیجے مرحوم سید خورشید حسن واسطی صاحب سے مجھے ملی جو میری والدہ مرحومہ کے عم زاد ہونے کی نسبت سے میرے ماموں تھے۔ دوسری اور پہلی بیاض میں اکثر غزلیں اور نظمیں مشترک ہیں تاہم دوسری بیاض ان کے اضافی کلام پر مشتمل ہے۔ ان دونوں بیاضوں سے انتخاب کرنا تنہا میرے لیے ممکن نہ تھا چنانچہ میرے کراچی ہی کے دوران قیام میرے ماموں زاد بھائی سید محبوب حسن واسطی نے میری مدد کی جو ماشاءاللہ ایک عالم دین، محقق، نقاد اور ادیب ہیں۔ ہم دونوں نے مختلف نشستوں میں ان بیاضوں سے کچھ کلام انتخاب کیا جس سے چند اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

بخش دے حشر سے پہلے اسے اے داور حشر
اپنے قاتل کا نہ دیکھوں میں پشیماں ہونا

اپنے ہوتے ہیں پرائے شب تنہائی میں
یاد ہے شام سے سائے کا گریزاں ہونا

بے پروں اڑتا ہے ہر ذرہ بیابانوں کا
ہے جلوس آج ہوا پر تیرے دیوانوں کا

تو ہی کہہ دے تجھے پیاں شکستہ کی قسم
کس کو میرا سا یقین ہے ترے پیانوں کا

بڑھ کے آئینہ دکھایا جو وفاؤں نے مری
منہ ذرا سا نکل آیا ترے احسانوں کا

آبلوں میں بھی نہ کچھ سوز دروں نے چھوڑا
گھر کا گھر پھونک دیا سوختہ سامانوں کا

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ میری معلومات جناب فدؔا اوران کے کلام کے بارے میں تقریباً صفر کے برابر تھیں۔ میری سب سے زیادہ کوشش یہ تھی کہ میں ان کے عہد کا ٹھیک ٹھیک تعین کرسکوں اور مجھے اپنے بڑے بھائی علامہ قابلؔ گلاوٹھوی کے کاغذوں میں فدؔا صاحب کی تاریخ وفات مل گئی جو یکم مئی ۱۹۴۳ء ہے۔ اس تاریخ کے درست ہونے میں مجھے قطعی شبہ نہیں اوراسی تاریخ کی وساطت سے ان کے سن ولادت کا تعین بھی اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ مصدقہ روایات کے مطابق فدؔا صاحب نے اسی برس کی عمر پائی تھی۔ اس طرح ان کا سال ولادت تقریباً ۱۸۶۳ء قرار پاتا ہے۔

فدؔا صاحب کا زیادہ تر وقت بہ سلسلہ ملازمت مین پوری میں گزرا جو یو پی کے مشہور اضلاع میں سے ہے۔ آپ کم و بیش ۳۵۔۴۰ سال مین پوری میں رہے اور بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ آئے دن شعروادب کی محفلوں کے ہنگامے رہتے جس میں اس عہد کے مشاہیر شرکت کرتے تھے۔ ان میں جگر مرادآبادی، مرزا واجد حسین، یاس یگانہ، شوکت علی خان، فانی بدایونی جو اٹاوہ میں وکالت کرتے تھے ٹونک کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن فرح آباد کے شاعر وصوفی حفیظ الرحمٰن مدیر ہفت روزہ ''مجیب'' مدرسہ فیض الاسلام فرح آباد کے بانی و مہتمم مولانا غلام مصطفیٰ بھوپال کے مشہور شاعر احسنؔ مارہروی، دلیرؔ مارہروی، اصغرؔ گونڈوی، سیمابؔ اکبرآبادی اور مضطرؔ گلاوٹھوی شامل تھے۔ فدا صاحب کے دور میں مین پوری کل ہند سطح کے مشاعروں کا مرکز بن گیا تھا اوران کی شخصیت ان تمام سرگرمیوں کا محور۔

۱۹۳۲ء میں ان کی زیر سرپرستی میں ایک ہفت روزہ ''تسخیر'' جاری کیا گیا جو ان کے شاگرد قابل گلاوٹھوی کی ادارت میں نکلتا رہا اور بعد میں کچھ عرصہ گلاؤٹھی سے بھی شائع ہوا۔

فدا صاحب نے تقریباً نصف صدی تک برصغیر کی اہم شعری نشستوں اور بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی جن میں ان کے شاعرانہ مقام و مرتبہ کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا۔ دہلی میں پنڈت امرناتھ ساحرؔ کے یہاں جو محلّہ بازار سیتارام میں رہتے تھے، اکثر مشاعرے ہوتے تھے جن میں فدؔا صاحب نے اپنے معاصرین کے ساتھ شرکت کی۔ گلاؤٹھی کے حوالے سے ایک بزرگ سید صفی اللہ کا نام اکثر دیکھنے میں آتا ہے جن کے یہاں شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں اور فدؔا صاحب ان میں پورے ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے۔ علی گڑھ کے جوبلی مشاعروں میں فدا صاحب نے اکثر شرکت کی اور معرکۃ الآراء غزلیں پڑھیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ اور مین پوری کی سالانہ نمائشوں میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں بھی فدؔا صاحب شرکت کیا کرتے تھے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۲ء کو دہلی میں پنڈت امرناتھ ساحر کی قیام گاہ پر جو طرحی مشاعرہ ہوا اس میں پڑھی جانے والی فدؔا صاحب کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں

شانہ ان کی زلف کا عقدہ کشا ہو جائے گا — اس خوشی میں آج ایک قیدی رہا ہو جائے گا
کیوں نہیں ہٹتی ہے آخر چشم دشمن سے نظر — آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا وعدہ وفا ہو جائے گا
کیا یہ سب دنیا کی دنیا آپ پر مٹ جائے گی — کیا زمانے کا زمانہ مبتلا ہو جائے گا

سیمابؔ اکبرآبادی جو آگرہ سے رسالہ ''شاعر'' نکالتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں داغ کے ''نورتن نمبر'' زیرعنوان ''شاعر'' کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں فدؔا صاحب کو شامل کیا گیا تھا اور ان کے انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ ان کے فکر وفن پر ایک مبسوط مقالہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ قابلؔ صاحب نے بھی ان کی مختصر سوانح ''حیات جاوید'' کے نام سے دہلی میں شائع کی تھی اور دہلی کے ایک روزنامہ ''وطن'' کے سالنامے ۱۹۳۷ء میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے، فدؔا صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک مقالہ شائع کیا تھا مگر ان دستاویزات میں سے کسی تک میری رسائی نہ ہوسکی۔

ریاضؔ خیرآبادی مرحوم فدا صاحب کے ممتاز ہم عصروں میں سے تھے۔ وہ امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے جبکہ فدا صاحب کو داغؔ دہلوی کے شاگردوں میں ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل تھا جیسا کہ داغؔ اور امیرؔ مینائی کے درمیان ہمیشہ شاعرانہ چشمک رہی اسی طرح ان دونوں عظیم شعراء کے تلامذہ کے متوازی گروہوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ریاضؔ خیرآبادی مرحوم نے ''فریاد'' کی ردیف میں ایک غزل داغؔ کے شاگردوں کی نسبت ایک چیلنج کے طور پر کہی اور فدؔا صاحب نے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا جس سے ان کی قادرالکلامی اور عظیم فکری صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

فدؔا صاحب کے کلام میں غزل اگرچہ ان کا خاص میدان تھا اور اس میدان میں ان کی طبع رسا نے بڑے بڑے جوہر دکھائے لیکن دوسری اصناف سخن مثلاً رباعی، قصیدہ، مثنوی، حمد، نعت، سلام اور منقبت وغیرہ میں بھی ان کی استاذی مسلّم ہے۔ چنانچہ ان کی غزلیات کے ساتھ ساتھ وہ نظمیں جو انہوں نے مخمس یا مسدس کی شکل میں کہی ہیں اپنی روانی، اثر آفرینی اور زبان وکلام کے محاسن کے اعتبار سے اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

(مقالہ نگار کی مولفہ کتاب ''برگ سبز'' سے ایک اقتباس)

☆☆☆

شمس الحق خیاؔل

مولانا سید اصلح الحسینی

شمس الحق خیاؔل، محمد حسین یقیؔن مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی جو نہ صرف مستند ترین نقاد ادب، ادبی شخصیت، مذہبی عالم اور ایک ماہر طبیب تھے۔ دین سے شغف، ادبی ذوق اور طب کی طرف رجحان اپنے والد ہی سے ورثہ میں پایا تھا۔ طب کے بجائے وکالت کو اپنا پیشہ بنایا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختار کاری اور وکالت انہوں نے کہاں سے حاصل کی۔ جوانی کے ابتدائی زمانہ میں اسلامی ہند کی مختلف مسلمان ریاستوں میں معاش کے مواقع کی جستجو کی جس میں بہاولپور اور بھوپال قابل ذکر ہیں اور اس تعلق سے ان ریاستوں کے حکمران اور مشہور شخصیتوں کے تذکرے انہوں نے اپنے قطعات، قصائد اور تاریخوں میں کیے ہیں۔ اپنے والد یقیؔن کے علاوہ جو داغ ہی کے طرز کلام اور اسالیب شعر کے ایک مستند استاد اور مرزا داغ کے استاد امام بخش صہبائی کے ارشد ترین تلامذہ میں سے تھے اور کن کن استاذہ سخن سے استفادہ کیا، یہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں مگر اتنا یقین ہے کہ وہ امیؔر مینائی کے مکتب شاعری سے زیادہ قریب تھے جن میں امیر اللہ تسلیؔم اور رازؔ رامپوری سے زیادہ قریب رہے۔ اپنے بعض قطعات میں انہوں نے داغؔ دہلوی کے ذوق زبان کی داد دیتے ہوئے مضامین غزل کی سنجیدگی کی طرف بھی ایک محتاط تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رامپور کے قیام کے دوران اپنے معاشی مشاغل سے زیادہ ادب وشعر کی طرف متوجہ رہے اور رامپور کی ادبی فضا میں ایک ہنگامہ شعر وسخن برپا رکھا۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ دیوان خاصہ ضخیم ہے جو بدقسمتی سے منظر عام پر نہیں آسکا۔ ابتداء میں شمسیؔ تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں خیاؔل تخلص کیا۔ زیادہ تر غزل سے شغف رکھتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں رامپور ہی میں ایک سانحہ میں وفات پائی اور وہیں اپنے مکان کے قریب پیر جھنڈا کے قبرستان میں دفن ہوئے جہاں آپ کے خاندان کے کئی اور بزرگوں کے مزارات بھی ہیں۔ وفات سے چند برس قبل تک وہ گلاؤٹھی کی ادبی صحبتوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ داغ کے نورتنوں میں عبدالوحید فداؔ ان کے والد کے بڑے چہیتے شاگرد اور داماد تھے۔ کلام کے نمونہ کے طور پر ان کی غزلیات سے چند شعر پیش خدمت ہیں۔

غزل

کسی کے وعدے کو پختہ سمجھ رہے ہو خیاؔل
خیال اس سے کوئی بڑھ کے خام کیا ہوگا

مر رہا تھا صدمہ درد فراق یار سے
دم نکل جانے سے میں زندوں میں شامل ہوگیا

یاروں نے کیسے مجھے دل سے بھلا دیا
افسانہ تھا خیالؔ نہ میں کوئی خواب تھا
جاتے ہیں اس خیال سے سامنے ان کے اے خیالؔ
شاید کریں وہ رحم کچھ حالت زار دیکھ کر

☆☆☆

غزل

او بے وفا کرے گا ہمارا تو کیا لحاظ
اہل وفا کا کرتے ہیں اہل وفا لحاظ
میرے مقابلہ میں عدو کا کیا لحاظ
بس جایئے بھی دیکھ لیا آپ کا لحاظ
اک خلق کی نظر ہے رخ بے نقاب پر
کیوں صاحب اب کہاں گیا وہ آپ کا لحاظ
آنکھیں لڑا رہے ہیں سر بزم غیر سے
اللہ ! تمہاری آنکھ کا ایسا اٹھا لحاظ
وہ بھی کوئی بشر میں بشر ہے جسے نہ ہو
کچھ دوستی کا بہرِ ملاقات کا لحاظ
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کر ان کے لیے خیالؔ
دنیا ہی میں نہیں ہے مروت ، وفا ، لحاظ

☆☆☆

غزل

حکم یہ ہے کوئی حالِ دلِ مضطر نہ کہے
ضبط سے جان پہ بن جائے تو کیوں کر نہ کہے
کچھ کہا جائے اگر تم کو اثر کچھ بھی نہیں
اور پھر کہتے ہو مجھ کو کوئی پتھر نہ کہے
مذہبِ عشق میں کیا فرض ہے میری تقلید
کوئی اس بت کو خدا کے لئے کافر نہ کہے

یہ حکومت ، یہ قیامت ، یہ مصیبت کیسی
آدمی اپنی مصیبت سرِ محشر نہ کہے
اس سے اتنا تو کہوں گا کہ بُرا وہ مجھ کو
مہربانی ہو اگر غیر کے منہ پر نہ کہے
اُس سے کیا ملئے جو کُھل مِل کے نہ ملنا چاہے
اس کو کیا کہئے جو اک بات بھی کُھل کر نہ کہے
مانتا ہوں کہ نہیں خضرِ طریقت ہی خیالؔ
خود وہ گمراہ ہے جو شوق کو رہبر نہ کہے

☆☆☆

غزل

تلملانا دیکھئے شب بھر تڑپنا دیکھئے
آپ بھی آ کر کبھی میرا تماشا دیکھئے
میرا ذمہ آپ پہچانیں جو اپنے آپ کو
حال میرا دیکھ کر پھر اپنا نقشہ دیکھئے
شمع ہے دل سوختہ گل ہے ہر اک سینہ فگار
حسن کے پردے میں الفت کا کرشمہ دیکھئے
اک زمانہ کا الم سر پر لئے پھرتا ہوں میں
دیکھئے میرا جگر میرا کلیجا دیکھئے
کان ہیں مشتاق سنئے گفتگوئے دل فریب
آنکھیں نگراں ہیں کسی صورت وہ جلوہ دیکھئے
خواب میں بھی اے خیالؔ اب تو نظر آتا نہیں
کیجئے کیا کس طرح وہ روئے زیبا دیکھئے

☆☆☆

علامہ سید رحیم اللہ قابلؔ گلاؤٹھوی

سید منصور عاقل

کسی بھی خطۂ زمین کو عزت و سرفرازی از خود حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ یہ ان شخصیتوں کا فیضان ہوتا ہے جو اس سرزمین سے نسبی اور معاشرتی تعلق رکھتی ہیں اور جو اپنے افکار و اعمال اور اوصاف حمیدہ کے باعث اسے عظمت و احترام اور شہرت دوام عطا کرتی ہیں چنانچہ اس اعتبار سے گلاؤٹھی کو معاشرتی اور جغرافیائی تحدید و اختصار کے باوصف آغوش گنگ وجمن میں پروان چڑھنے والی تاریخی عظمتوں کی امین ایک بستی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کے فرزندان اولوالعزم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں علم و حکمت، ذہانت وبصیرت اور عزم وہمت کے انمٹ نقوش ثبت کئے، ایسی ہی ہستیوں میں علامہ سید قابلؔ گلاؤٹھوی بھی تھے جنہیں ان کی زندگی ہی میں اہل بصیرت نے ذہانت ودانائی اور علم وحکمت ہی کے شعبوں میں نہیں بلکہ ادب وشعر اور صحافت وسیاست کے میدان میں بھی سند اعتراف سے نوازا۔

قابل صاحب نے ۱۹۲۸ء میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے ہر منزل معلوم کو گرد سفر بناتے چلے گئے یہاں تک کے بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو اور انگریزی جرنلزم ہی نہیں بلکہ ادبی صحافت اور سیاست نگاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور دہلی کو جو ادب وسیاست اور تہذیب وثقافت کا منبع ومرکز تھا اپنی سرگرمیوں کا محور بنالیا۔

وہ اس مدت میں دو درجن سے زائد انگریزی وار دو زبان کے معروف مقتدر اخبارات ورسائل کے یا تو چیف ایڈیٹر یا ایڈیٹر رہے یا سب ایڈیٹر اور نامہ نگار رہے اور اپنے رشحات قلم سے ثابت کر دیا کہ تاریخ یا ادب ہو یا مذہب ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ ان اخبارات اور رسائل کے اگر نام گنوائے جائیں تو ان میں سرفہرست دہلی اور کلکتہ سے شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین (Statesman) ہے جس کے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک نامہ نگار رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۰ء کے دوران بی بی سی لندن کی نمائندگی بھی کی۔ اس کے علاوہ اردو اخبارات وحدت وطن، الامان، جنگ اور قومی گزٹ کے ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر رہے اور ایک اعزاز جو قابل صاحب کے حصہ میں آیا وہ کیبنٹ مشن کے ارکان سر اسٹیفر ڈ کرپس مسٹر پیتھک لارنس اور مسٹر وی اے الگزینڈر کا وہ سیاسی انٹرویو تھا جو تنہا ان کی ذات سے منسوب ہوا اور برصغیر ہی نہیں بلکہ عالمی میڈیا کی زینت بنا۔ جن لوگوں نے قابل صاحب کی صحافت کا یہ دور دیکھا ہے وہ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی ان کی مضبوط گرفت کے معترف بھی ہیں اور شاہد بھی کہ وہ ان تینوں زبانوں کے انشاء پرداز ہی نہیں بلکہ چونکا دینے والے خطیب بھی تھے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک برصغیر کے جن رسائل وجرائد انگریزی وار دو میں ان کی نگارشات زینت بنیں۔ ان میں سنڈے ٹائمز مدراس، بومبے کرانیکل بمبئی اور رینٹ کلکتہ کے علاوہ خلافت بمبئی، پیام حیدر آباد (دکن) عصر جدید کلکتہ، آزاد کلکتہ، عالمگیر لاہور، قوس وقزح لاہور، ادبی دنیا لاہور، شاعر آگرہ، ایشیا

میرٹھ، نگار بھوپال اور کپورتھلہ گزٹ شامل ہیں۔

سیاسی تحریکوں سے قابل صاحب کی دلچسپی اور امت مسلمہ سے والہانہ عشق زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا اور قوم کے زوال وعروج کے حقائق پر تمام عمر نہایت دردمندی سے نہ صرف غور وفکر کرتے رہے بلکہ مشاہیر وزعماء سے جن میں حضرت قائد اعظم بھی شامل تھے اپنی ملاقاتوں میں مختلف تدابیر اور اسباب وعلل پر گفتگو کرتے رہے اور آخر کار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

قابل ہے میرے قوم کی تاریخ مختصر
ساغر ملا تو ہاتھ سے تلوا گرگئی

سیاحت کے شوق نے قابل صاحب کو تمام عمر محوِ سفر رکھا۔ برصغیر کے چپہ چپہ سے آگاہی ان کی سفر دوستی ہی کا صلہ تھی بلکہ اکثر وبیشتر مسلم ممالک کا بھی سفر کیا اور سقوط ڈھاکہ کا جاں گسل لمحۂ تاریخ جب زہر آلود تیر بن کر پاکستان کے دل میں پیوست ہو گیا تو اس وقت قابل صاحب مشرقی پاکستان ہی میں تھے اور ان کی آنکھوں نے اسلامی تاریخ میں پہلی بار نوے ہزار فوج کو ہتھیار ڈالتے ہوئے اور مشرقی پاکستان کو بھارت کی آغوش منافقت میں بنگلہ دیش کی صورت میں منتقل ہوتے دیکھا۔ انہوں نے اپنا قلمی جہاد وہاں بھی جاری رکھا اور دو سال قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بچے کھچے پاکستان میں واپس آئے اور یہ صدمہ بھی ساتھ لائے کہ بنگلہ دیش کی پولیس اور بھارت نواز انتظامیہ نے انہیں ان کے ستر مسودات نظم ونثر سے محروم کر دیا تھا،

لٹ گئے ستر دواوین ادب بنگال میں
جو ہر قابل فقط ہے کچھ نہیں قابلؔ کے پاس

اللہ تعالیٰ نے قابل صاحب کے قلم میں بلا کی روانی عطا کی تھی اور ابلاغ واظہار پر ایسی قدرت کہ ناقابل یقین ڈان اخبار کو اردو میں اس روانی سے پڑھتے کہ دیکھنے اور سننے والے دونوں زبانوں پر ان کی دسترس کے قائل ہو جاتے۔ یہی عالم شعر گوئی کا تھا کہ کم وبیش سو اشعار روز کہہ لینا ان کا معمول تھا بلکہ ان کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ تقسیم ملک سے قبل کپورتھلہ میں ایک کل ہند مشاعرہ کے ضمن میں احسان دانش مرحوم نے اپنی سوانح ''جہانِ دانش'' میں رقم کیا ہے اور دوسرے شعراء پر ہی نہیں بلکہ خود پر بھی قابل صاحب کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔ ان کی ذہانت ان کی شاعری میں نکتہ آفرینی کے حسن کو نہایت واضح کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں

بہ اقلیم سخن تنہا ہوں قابلؔ
سخن ور ہم زباں کوئی نہیں ہے
مرے ہم پایہ ہیں کچھ لوگ لیکن
مرا ہمسر یہاں کوئی نہیں ہے

لیکن وقت کی سردمہری اور زمانہ کی غلط بخشی کے ہاتھوں آزردہ ہو کر آخری عمر میں یہ بھی کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

مٹی میں ملایا مجھے ناقدریٔ فن نے
شرمندہ ہوں قابلؔ میں بہت اپنے ہنر سے

کسے خبر تھی کہ ۱۹۰۶ء میں گلاؤٹھی میں قاضی سید حبیب اللہ کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مقامی پرائمری اور مڈل اسکول کا طالب علم اور منبع العلوم گلاؤٹھی سے فیض یافتہ نوجوان جسے اہل خاندان نے سید رحیم اللہ کا نام دیا قابل بن کر برصغیر میں اپنی ذہانت وذکاوت اور مطالعہ ومحنت سے صحافت وادب اور اردو شاعری میں ہلچل مچادے گا اور بحیثیت شاعر اپنے استاذ حضرت فدؔا گلاؤٹھوی کے کمال سخن کی نہ صرف لاج رکھے گا بلکہ گلاؤٹھوی کے لاحقہ کو اپنے نام کا مستقل حصہ بنا کر اپنے مولد ومسکن کا نام بھی روشن کرے گا۔ یہ چراغ جس نے ربع صدی سے زیادہ شعروادب اور صحافت کے ماحول کو منور کیے رکھا ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سے ٹمٹمانے لگا تاہم روشنی کی اس نحیف لَو میں تمام سرمایہ فکروفن لٹ جانے کے باوجود گرمی باقی رہی جس نے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے جوار میں واقع واہ کینٹ میں جولائی ۱۹۸۲ء تک اپنے آخری سانسوں کی حرارت کو بھی باقی رکھا اور دین کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں سموکر ماضی کے تمام رشتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ۵/ جولائی ۱۹۸۲ء کے سورج کے ساتھ خود بھی غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اب منزل وصال دل و جاں ہے ارض پاک
قابلؔ کے دل میں اب غمِ ہندوستان نہیں

☆☆☆

سید مشتاق علی مضطرؔ گلاؤٹھوی

سید منصور عاقل

آپ سید اشفاق علی کے فرزند تھے اور ایک شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، خوبصورت قد وقامت کے مالک تھے اور اپنے اخلاق واخلاص کے سبب اہل قصبہ میں تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ معاش کا ذریعہ محکمۂ مال کی ملازمت تھی چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد گلاؤٹھی ہی میں مستقل قیام کیا۔ آپ کو شاعری میں امیرؔ مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور شعر گوئی پر مکمل عبور حاصل تھا، دور دراز تک مشاعروں میں مدعو کئے جاتے تھے اور کلام میں سلاست وروانی اور برجستگی کے اوصاف کے باعث خوب داد حاصل کرتے تھے۔ طبیعت میں یک گونہ شوخی بھی تھی جس کا اظہار اشعار میں نہایت خوبصورتی سے کرتے۔ فلسفیانہ مضامین نظم کرنے میں آپ کو خاص مہارت حاصل تھی، آپ کا ایک شعر اتنا مشہور ہوا کہ زبان زدِ خاص وعام ہو گیا۔

سحر ہے یا الٰہی یا یہ کوئی مسکراتا ہے
الٰہی شام ہے یا کوئی مجھ سے منہ چھپاتا ہے
بشر بھی آ کے دنیا میں عجب شانیں دکھاتا ہے
کھلونا بن کے آتا ہے تماشا بن کے جاتا ہے

مضطرؔ گلاؤٹھوی کی طبیعت میں جو شوخی تھی اس کا اظہار بھی ان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے

کیا بتاؤں کہ تمہیں آج کہاں دیکھا ہے ابھی کہہ دوں تو اسی بات پہ جھگڑا ہو جائے

آپ کے حضرت فداؔ گلاؤٹھوی سے خصوصی مراسم تھے، چنانچہ آپ کی بڑی بیٹی شبیہ فاطمہ کی شادی فدا صاحب کے بیٹے سید عزیز حسن سے ہوئی، چھوٹی بیٹی صابرہ خاتون الدن میں الحاج سید ممتاز علی کے صاحبزادے سید احمد سے بیاہی گئیں، سنا ہے کہ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام چھوٹی بیٹی کے پاس ہے جو تا حال شائع نہیں ہو سکا لیکن مضطر گلاؤٹھوی کی شاعری ورثہ میں ان کے نواسے سید سجاد احمد تک پہنچی جو ایک میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک نہایت خوش فکر اور ہونہار شاعر ہیں، ان کا ایک شعری مجموعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ سجاد کو شاعری ورثہ میں نانا کے علاوہ اپنے چچا سید مظفر ضیاء سے بھی ملی ہو جو ایک صاحب دیوان شاعر ہیں۔

آپ کی ایک معرکۃ الآراء نظم ہے جو ۱۹۳۸۔۳۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کے موقعہ پر کہی گئی۔ قارئین کے لئے پیش ہے جس سے مضطرؔ صاحب کی شاعری اور انکی دینی فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

آپ کی ایک معرکۃ الآراء نظم جو جمیعۃ علمائے ہند کے اکابرین کی شان میں کہی گئی، پیش خدمت ہے

نذرِ عقیدت بحضور علماء حق

مبارک عندلیب زار وقت خوش نوائی ہے
چمن میں آج دہلی کے بہارِ خلد آئی ہے

نئی رنگینیاں شادابیاں رعنائیاں لے کر
نئے سرے سے چمن میں پھر تازہ بہار آئی ہے

مہکتا ہے ریاضِ دہر جن پھولوں کی نکہت سے
بہار اُن خاص پھولوں کو اب اس گلشن میں لائی ہے

خزاں نے اپنی کرنی میں کسر رکھی نہ تھی لیکن
شگفتہ ہیں خزاں دیدہ ، یہ شانِ کبریائی ہے

چمن بندی ہے ان سے گلشنِ دین محمدؐ کی
انہی کی رنگ آرائی ، انہی کی خوشنمائی ہے

انہی پھولوں میں دریا موجزن ہے حسن پنہاں کا
خدائی کے سفینے کو انہی کی ناخدائی ہے

خدائی میں خدا والوں کی صف میں مقتدا یہ ہیں
سیہ خانہ میں دنیا کے انہی کی روشنائی ہے

شریعت میں طریقت میں جماعت میں سیاست میں
حقیقت میں انہی کی رہنمائی رہنمائی ہے

یہ عالم دیکھئے ہر پھول کی رنگیں اداؤں میں
جلال کبریائی ہے جمالِ مصطفائیؐ ہے

کسی میں شانِ صدیقی کسی میں شانِ فاروقی
غنی کے بھیس میں کوئی بہ شکل مرتضائی ہے

انہی پھولوں کے سر سہرا ہے شادابی کا امت کی
عروسِ ملت بیضا انہی کی تو سجائی ہے

یہی وہ گل ہیں جو بادِ مخالف سے نہ مرجھائیں
خدا کے آسرے پر جن کی یہ رنگیں نوائی ہے

یہی تو مخزنِ اسرارِ توحید ورسالت ہیں
خدا کے علم کی دولت انہی کے ہاتھ آئی ہے

نہ یہ نیلی عباؤں میں نہ یہ کالی قباؤں میں
یہ ہیں سادہ اداؤں میں ، جو شانِ مصطفائی ہے

ادب اک شیوۂ محمود ہے ان خوش جمالوں کا
ادب ان کا نہ کرنا ایک بڑی ہی بے حیائی ہے

نواسنجانِ گلشن ، نعرۂ تکبیر کے نغمے
کہ اچھا وقت ہے سر پر گھٹا رحمت کی چھائی ہے

دعا مانگو کہ اس ابر کرم سے ایسی دب جائے
نہ اٹھے حشر تک اب جو خزاں نے خاک اڑائی ہے

خزاں کے تند جھونکے خاک اڑا کر کیا بگاڑیں گے
کھلائیں گل کھلائیں ، اب تو پھولوں کی بن آئی ہے

یہ ان میں سے نہیں گل بازیاں ہیں جن کی گل چیں تک
یہ وہ ہیں جن کی دربار الٰہی تک رسائی ہے

فلک نے خوب دیکھا ہے ، زمیں نے خوب برتا ہے
حق وباطل میں فتح حق ہمیشہ ہوتی آئی ہے

یہی دن ہیں کہ خاصانِ خدا پر ظلم ٹوٹے ہیں
شہادت آج جن کی داستانِ کربلائی ہے

وہ ظالم ، اور خاصانِ خدا کو چھوڑنے والے
کہاں ہیں ؟ کوئی ان کا نام لیوا دوست بھائی ہے

ابھی تک آپ نے دیکھے نہیں گل چیں مظالم کے
پرستارانِ حق نے جیل کاٹی مار کھائی ہے

مگر اللہ والے کیسے کوہِ استقامت ہیں
ڈٹے ہیں اپنے مرکز پر تماشائی خدائی ہے
ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے دنیا میں
فلک نے رنگ بدلے ہیں زمیں نے خاک اڑائی ہے
اب ان سے بھاگنا منہ موڑنا ان کو برا کہنا
تمہاری سادہ لوحی ہے تمہاری بے وفائی ہے
جہاں ہو تم وہیں اخلاص باہم کی ضرورت ہے
نفاقِ باہمی یہ شورشیں اک جگ ہنسائی ہے
تجاہل سے انہیں چھوڑا تو دیں داری سے منہ موڑا
تمسخر سے انہیں چھیڑا تو سمجھو شامت آئی ہے
قدم لو ان کے آنکھوں سے لگاؤ اے چمن والو
جو ان پھولوں میں بس جاؤ تو کانٹوں کی صفائی ہے
خدا قائم رکھے گلشن میں ان پھولوں کی جمعیت
سدا یوں ہی بہار آیا کرے جس طرح آئی ہے

☆☆☆

سید مظفر احمد ضیاؔ۔ایک باغ و بہار شخصیت

ڈاکٹر سجاد سید

جناب سید مظفر احمد ضیاؔ کی شخصیت وسیرت روشنی کا مینار ہے۔اس سے حساس اور باشعور انسان بصیرت حاصل کرسکتاہے۔موصوف کا وطن اُلدن ضلع میرٹھ ہے جہاں انہوں نے سادات کے ایک ممتاز گھرانے میں ۱۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو آنکھ کھولی۔ضیا صاحب سے پہلے مولانا عبدالباری آسی اُلدنی ادبی دنیا میں الدن کی علمی فضیلت کا پرچم لہرا چکے تھے۔مظفر ضیاؔ نے ابتدائی تعلیم الدن، پانچی اور میرٹھ میں حاصل کی۔۱۹۴۸ء میں تقسیم وطن کے بعد ضیا صاحب پاکستان چلے گئے اور صادق اِجرٹن کالج بھاولپور سے سلسلہ تعلیم قائم کیا،انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کیا اور اردو میں امتیاز کے ساتھ ایم اے کی سند حاصل کی۔انہوں نے سندھ مسلم کالج کراچی سے ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ضیا صاحب نے علمی دنیا میں ۱۹۵۵ء میں قدم رکھا ، انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا۔کولمبو پلان کے تحت کینیڈا،امریکہ، یورپ اور مشرقِ وسطی کا دورہ کیا۔اس کے بعد ایک سرکاری وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اٹلی ،فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ کا سفر کیا اور سینٹرل بورڈ آف ریوینو کے ممتاز رکن کی حیثیت سے خاص طور پر خدمات انجام دیں۔

جناب سید مظفر ضیاؔ صاحب سے میرا خون کا رشتہ ہے، میں نے ان کے سایۂ شفقت میں ان کی شخصیت کے دل آویز پہلو دیکھے ہیں۔اس بنیاد پر میں کہنا چاہتا ہوں کہ موصوف کی شخصیت تہذیب وشرافت کے ساتھ عزم وعمل کا بہترین نمونہ ہے۔انہوں نے قصباتی ماحول میں آنکھ کھولی۔پاکستان کی اجنبی زمین پر اپنی محنت اور دیانت کا پرچم لہرایا اور ملک کے اعلی سرکاری عہدوں پر پہنچ کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ ضیا صاحب نے اپنی شخصیت کی تشکیل خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔یعنی وہ خودساختہ Self Made انسان ہیں۔

ضیاؔ صاحب ایک باشعور اور حساس شاعر اور شخص ہیں،انہیں ہجرت کا صدمہ دوسطحوں پر برداشت کرنا پڑا۔ایک طرف انہیں اپنی والدہ ماجدہ، اپنے بھائیوں اور بہنوں سے جدائی کا غم تھا، دوسری طرف مادرِ وطن سے جدا ہونے کا صدمہ۔ان دونوں صدموں کے درمیان ان کی شخصیت کو اندر سے ٹوٹ کر بکھر جانا چاہئے تھا لیکن اللہ کے فضل اور ان کی شخصیت کی اندرونی طاقتوں اور صلاحیتوں نے سہارا دیا۔موصوف ایک جاذب نظر، پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں، ان کی شخصیت میں متانت اور وجاہت کا اچھا امتزاج ہے،کم سخن ہیں مگر اپنی بات کا اثر کم الفاظ میں مخاطب پر زیادہ سے زیادہ چھوڑ جاتے ہیں۔مزاج میں سنجیدگی ہے،شاید اوائلِ زندگی کی جدوجہد اور تنہائی کا اثر ہے کہ اس میں اگر انتظامیہ عہدوں کی گمبھیرتا کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کی گہری سنجیدگی کا راز سمجھ میں آجاتا ہے۔مگر بے تکلف دوستوں میں ان کی خوش مزاجی کا جوہر کھُلتا ہے اور ان کی پُرلطف اور باغ وبہار شخصیت سامنے آجاتی

ہے، اس مختصر تعارف کو میں ان کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

خود ذات میں گُم ہوں ، کبھی آفاق میں گُم ہوں
تاریخ کا نبّاض ہوں ، میں اہلِ قلم ہوں

قارئین کے ذوق کی نذر ان کی ایک غزل

دل میں اک شہر بسایا ہے میاں
تب کہیں جشن منایا ہے میاں
کاٹ کر غم کے گھنے جنگل کو
راستہ خود ہی بنایا ہے میاں
کام مشکل تو بہت تھا لیکن
پیڑ پتھر پہ اُگایا ہے میاں
زخم بے وجہ نہیں شانوں پر
دہر کا بوجھ اٹھایا ہے میاں
رسمِ منصور کا رکھنے کو بھرم
تختۂ دار سجایا ہے میاں

(بشکریہ ماہنامہ مخدومِ جہاں، نئی دہلی)

☆☆☆

سید مظفر ضیاء۔ میرا یار

سید منصور عاقل

دوست تو بہت ہوتے مگر یار بہت کم، سو وہ بھی پہلے پہل میرا دوست بنا اور پھر یار اور وہ بھی ایسا کہ پچاس برس سے بھی زیادہ یاری رہی، پھر وہ ایک روز مجھے ہی نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر چلا گیا، بیوی بچے عزیز رشتہ دار اور دوست آج تک منتظر ہیں مگر وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

منصور و مظفر کی دوستی دیکھنے اور جاننے والوں کو مثالی نظر آتی تھی ہم سچ مچ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ دوست احباب آتے تو میز بانی بھی اس طرح ہوتی کہ چائے اگر مظفر بناتا تو میں برتن دھوتا۔ کالج جانے سے پہلے اور بعد ہر لمحہ رفاقت میں گزرتا۔ شہر کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے جن میں حلقہ ارباب علم سے لے کر مضافات اور گلی کوچوں اور ہوٹلوں تک میں ہونے والی محفلیں شامل تھیں لیکن مظفر ابھی تک مظفر ہی تھا اور وہ مظفر ضیاء نہیں بنا تھا، افسانے لکھنے کا شوق تھا اور ہم نے ایک ادبی تنظیم جو ''انجمن تنقید ادب'' کے نام سے قائم کی تھی، مظفر اس کی روداد بحیثیت سکریٹری بڑے خوبصورت افسانوی انداز میں لکھتا لیکن ایک دن اچانک کھلا کہ افسانہ نگار مظفر عالم، شاعر مظفر ضیاء بن گیا کہ اسی روز ایک مقامی اخبار روزنامہ ''مغربی پاکستان'' میں اس کی ایک مختصر بحر والی ہلکی پھلکی غزل چھپی تھی اور پھر یوں ہوا کہ ۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو مظفر ضیاء جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ پانچ شعری مجموعوں کا خالق اور ایک ممتاز و معتبر شاعر تھا۔ اس کی موت کی خبر ملک کے بڑے بڑے اخبارات میں چھپی تھی کراچی جو اس کی آخری آرام گاہ بنا سوگوار تھا۔ اہل قلم کا ہجوم تھا، دوستوں کی آنکھیں اشکبار تھیں اور عزیزوں کو ایک دوست اور محبت کرنے والے شخص کا صدمہ نڈھال کئے دے رہا تھا۔ وہ ایک سینئر بیوروکریٹ کی حیثیت میں ریٹائر ہوا تھا کہ جہاں جہاں سے گزرا ماحول کو مہکا گیا۔ میں بھی کراچی ہی میں تعینات اور وہ بھی اس شہر میں کلکٹر کسٹم ۱۹۷۰ء میں کسٹم پریونیٹو کلب کے زیر اہتمام ایسا مشاعرہ کرایا کہ اس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ پاکستان کا کونسا بڑا شاعر ایسا تھا جو اس مشاعرے میں شریک نہ تھا۔

(مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء)

☆☆☆

سید منصور عاقل

افتخار عارف

(ستارۂ امتیاز، ہلال امتیاز)

حضرت منصور عاقل کا نام جہانِ اردو میں محتاجِ تعارف نہیں۔ممتاز شاعر، نامور محقق، صاحب نظر نقاد اور معتبر مدیر کی حیثیت سے ان کا علمی سفر گزشتہ پچاس برسوں سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔انہوں نے اردو کے ہمہ جہت قلم کار کی حیثیت سے نمایاں زندگی گزاری ہے۔وہ غیر منقسم برصغیر کے نامور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا ایک ایک فرد اپنے علمی قدوقامت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا مالک رہا ہے۔ان کے نانا سید فداؔ گلاؤٹھوی حضرت داغؔ دہلوی کے حلقہ تلامذہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔والدہ ماجدہ سیدہ تلمیذ فاطمہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور وہ بھی خانوادے میں ایک خوش فکر شاعرہ کے طور پر عزت وتکریم کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔سید منصور عاقل کے برادر بزرگ علامہ سید قابلؔ گلاؤٹھوی کا نام نامی پاک و ہند میں مشہور ومعروف تھا جن کے مجموعۂ شعر ''دبستان قابل'' کی ترتیب اور اہتمام اشاعت کا اعزاز بھی سید منصور عاقل کو حاصل ہے۔

حضرت منصور عاقل انگریزی، اردو اور فارسی زبانوں پر دسترسِ کامل رکھتے ہیں۔پاکستان کی سول سروس میں اعلی عہدوں پر کام کرنے کے بعد عزت وآبرو کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔دوران ملازمت جس جس شعبے میں بھی گئے اور انہوں نے جن جن شہروں میں بھی کام کیا، اپنے کردار اور صلاحیتوں کے سبب رفقائے کار کے دلوں میں بھی گھر کیا اور اہل شہر نے بھی خدمات کے سبب عزت واحترام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ملک میں اور ملک سے باہر اردو زبان وادب کے ضمن میں ہونے والے متعدد مذاکروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور اردو کی ترویج وفروغ کے سلسلے میں اَن مٹ نقوش چھوڑے۔وہ جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، ہالینڈ، سویڈن، سعودی عرب، بھارت اور بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں ہونے والی تقریبات میں شریک ہوئے اور وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں سے تبادلۂ خیال کیا اور پاکستان اور اردو کی عزت ووقار میں اضافے کا سبب بنے۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر وقتاً فوقتاً اسناد واعزازات سے نوازا جاتا رہا۔اس ضمن میں انجمن ترقی اردو لاہور کی جانب سے ''ہدیۂ سپاس وسند اعتراف''، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے ''نشان اعتراف'' بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی جانب سے ''سند اعتراف خدمت'' اور دیگر اداروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً اعزازات قابل ذکر ہیں۔

ان کا ثروت مند ادبی سفر ۱۹۵۹ء سے تاحال کم وبیش پانچ عشروں کو محیط ہے۔ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''حرف بہ حرف''، ''برگ سبز''، ''دبستان قابل''، ''مبارک نامہ''، ''خامہ خونچکاں اپنا'' اور ''شہاب دہلوی شخصیت اور فن'' ان کی وہ

تصانیف ہیں جو خالصتاً علمی اور ادبی کتب کے ذیل میں آتی ہیں۔ اپنے طویل علمی اور تخلیقی سفر کے دوران ملک کے ممتاز روزناموں اور ماہناموں میں سید منصور عاقل کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں روزنامہ ''تسنیم'' روزنامہ ''زمیندار'' سہ ماہی ''اُفق'' ''اردو روزنامہ'' سے وابستگی سے اہل علم بخوبی واقف ہیں ۲۰۰۱ء سے وہ مشہور تحقیقی اور تخلیقی مجلّے سہ ماہی ''الاقرباء'' کی مجلس ادارت کے صدر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ دینی، تہذیبی، علمی اور ادبی روایت کی ترجمانی کے طور پر ''الاقرباء'' بہت کم عرصے میں اپنے لئے اعتبار و امتیاز کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

''گہوارۂ سخن'' ان کی نگارشاتِ شعر پر مشتمل ہے۔ غزل کی صدیوں پر پھیلی ہوئی ادبی روایت میں سید منصور عاقل جس عمدگی سے شعر کہتے ہیں، اس نے انہیں پاکستان کے صفِ اول کے غزل گو شعراء میں شامل کر دیا ہے۔ نئے مضامین، فن عروض اور صحت زبان پر دسترس، ہنر کے تمام قرینوں سے آ گاہی نے انہیں جو مقام و اعتبار بخشا ہے وہ ہمارے زمانے میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔

ہم صبح و شام ہزاروں لوگوں سے ملتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں مگر ان میں کم کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو صاحب شخصیت افراد کے ذیل میں رکھا جا سکے۔ حضرت منصور عاقل میرے لئے صاحب شخصیت بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاقات اور صورت آشنائی تو بہت پہلے کی ہے مگر گزشتہ بیس برسوں سے میں ان کے حلقہ نیازمنداں میں شامل ہوں۔ جب بھی ان سے ملنے کا موقع میسر آتا ہے، کوئی نہ کوئی اچھا شعر، اچھا نکتۂ ادب ضرور لے کر اٹھتے ہیں۔ تحقیق، تاریخ اور علمی مسائل پر ایسی مستنظہر اور دل کو چھونے والی گفتگو کا ہنر کم کم لوگوں کو آتا ہے۔ تبحر علمی کے باوجود خُردوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ عاجزی اور انکساری کا وصف ایسا کہ بس دل سے ان کے لئے دعا نکلتی ہے۔ خوش گفتاری اور خوش مزاجی کس کس وصف کی تعریف کی جائے۔ ان کی محفل میں بیٹھ کر اور ان سے مل کر ایک فرحت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ میرے نزدیک بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم علم رکھنے والوں کو بھی اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ ان کے اصلاح احوال کے لئے جو سلیقہ اختیار کرتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس سے کسی قسم کی نخوت یا تمکنت کا اظہار ہو، بس بات بات میں اصلاح کر دی جاتی ہے۔ میں اسلام آباد میں ہی نہیں پاکستان میں جب اردو کی علمی و ادبی دنیا پر نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ حضرت منصور عاقل جیسے لوگوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔

میں سید گرامی مرتبت کی صحت و سلامتی کے لئے دعا گو ہوں۔ پروردگار منصور بھائی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ان کی عزت و آبرو میں، سرفرازی و سربلندی میں اور طمانیت و سکون میں اضافہ فرمائے۔

(۱۶ فروری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

سید منصور عاقل

سید منصور عاقل

ادب، صحافت کا آفتاب، ماہتاب

نسیم الدین ہاشمی

۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مفید عام اسکول گلاؤٹھی اور مسلم انٹر کالج بلند شہر میں حاصل کی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے اور لاہور میں دیال سنگھ کالج سے ۱۹۵۳ء میں بی اے کیا۔ ایم اے (پولیٹیکل سائنس) پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں ہسٹری (تاریخ) میں پنجاب یونیورسٹی سے دوسری مایہ ناز ڈگری حاصل کی۔

آپ قاضی سید حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ہیں جن کا شمار قصبہ کی مقتدر شخصیات میں ہوتا تھا، طبیہ کالج سے سند یافتہ طبیب حافظ قرآن اور قاری تھے۔ اجداد کو شاہان دہلی سے باون علاقے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے۔ یہ علاقے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی مزاحمت کی پاداش میں ضبط کر لئے گئے تھے، انگریزی، اردو اور فارسی زبانوں سے خاص شغف تھا۔ آپ کے ذاتی اثاثوں میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی شامل تھا۔ منصور عاقل صاحب کے نانا محترم سید فداؔ گلاؤٹھوی اپنے وقت کے ایک عظیم شاعر اور فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد خاص تھے۔

پنجاب کے گورنمنٹ ڈگری کالجز میں دو سال تک سیاسیات کے لیکچرر رہے۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان انفارمیشن سروس خیر پور (سندھ) سے ملازمت کا آغاز کیا اور مئی ۱۹۷۳ء تک ملک کے مختلف مقامات پر انفارمیشن کے ضلعی، ڈویژنل اور ریجنل سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائرمنٹ تک وفاقی حکومت سے وابستہ رہے اور دیگر مختلف مناصب کے علاوہ پنجاب اربن ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر، ڈائریکٹر جنرل وفاقی محتسب سیکریٹریٹ اور وزارت خزانہ میں ڈائریکٹر جنرل نیشنل سیونگز پاکستان کے عہدوں پر فائز رہے۔ پاکستان میں چیف احتساب کمشنر کا ادارہ قائم ہونے کے بعد حکومت پاکستان نے اس ادارہ کے لئے ۱۹۹۷ء میں آپ کی خدمات دوبارہ مستعار لیں۔

لاہور کے دوران قیام طالب علمی کے دور میں ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں کثرت سے لکھا۔ دوران ملازمت لائل پور اخبار کے چیف ایڈیٹر، سہ ماہی "افق" بہاولپور کے ایڈیٹر اور حکومت پنجاب کے ماہانہ "اردو نامہ" کے بانی مدیر اعلیٰ رہے۔ بیشتر بیرونی ممالک میں سفر کیا، حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ تاریخ و ادب کے موضوعات پر دو درجن سے زائد کتب کے مصنف و مؤلف ہیں جن میں آپ کا شعری مجموعہ "گہوارۂ سخن" بھی شامل ہے۔

اندرون ملک و بیرون ملک اداروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی جن میں اردو اکیڈمی بہاولپور، رکن تحقیق و مطالعات

تاریخی بورڈ پشاور، رکن ہمدرد تھنک ٹینک پاکستان، مستقل رکن سرسید میموریل سوسائٹی اسلام آباد، کے علاوہ پاکستانی مندوب کی حیثیت سے سیونگز کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ بمقام ٹریئر مغربی جرمنی میں شرکت، نائب صدر مغربی پاکستان انفارمیشن سروس ایسوسی ایشن، عالمی بنک کے زیر اہتمام سیونگز بنکاری کے موضوع پر سینئر پالیسی سیمینار بمقام اسٹاک ہوم (سویڈن) میں بحیثیت پاکستانی مندوب شرکت کی۔ آپ نے جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، انگلینڈ، سویڈن اور سعودی عرب کے علاوہ جنوبی ایشیا کے ممالک بھارت بنگلہ اور دیش کے دورے کیے۔

آپ کو ملنے والے کچھ ایوارڈ اور اعزازات میں خاص طور پر ہدیہ سپاس وسند اعتراف منجانب انجمن ترقی اردو لاہور، طویل خدمات ایوارڈ عطا کردہ گورنر پنجاب، محمد حسین یقین ایوارڈ (منجانب انجمن اخوان السادات کراچی) علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن راولپنڈی شیلڈ برائے علمی وادبی خدمات، نیشنل سیونگز ایوارڈ منجانب سنٹرل ڈائریکٹوریٹ آف نیشنل سیونگز حکومت پاکستان، سنداعتراف خدمات بین الاقوامی اقبال کانفرنس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد شامل ہیں۔

آپ کی تصانیف انگریزی اور اردو زبان میں دستیاب ہیں جن میں خاص طور پر حرف بہ حرف (تنقیدی وتحقیقی مضامین) برگ سبز (ادبی تحقیق) گہوارۂ سخن (شعری مجموعہ) حرف مجرمانہ (شخصیت فکروفن) گلاؤٹھی (تاریخ) دبستان قابل (سوانح، انتخاب کلام) مبارک نامہ (راولپنڈی ڈویژن کے فارسی گوشعراء کا انتخاب) خامہ خونچکاں (راولپنڈی کے شعراء کا رزمیہ کلام) شہاب دہلوی (فن اور شخصیت) پاکستان میں زرعی اصلاحات (تحقیقی مقالہ) مغربی جرمنی میں سیونگز بنک کا نظام، پاکستان میں تحفظ کتب ودستاویزات کا نظام، صحافت اور ادب تکنیکی موازنہ، پاکستان میں آئینی ارتقاء، اسلامی ریاست کے بنیادی عناصر، برصغیر میں مغل عہد کے دوران ثقافتی ترقی، حرف معتبر (ادبی اداریہ نویسی) متاع فکر ونظر (ادبی وتحقیقی تنقید) قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامیہ یونیورسٹی آف بھاولپور کی جانب سے ''سید منصور عاقل کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر طالبہ تحسین فاطمہ کے تحقیقی مقالہ پر ایم فل کی ڈگری عطا کی گئی۔

آپ نے میدانِ صحافت وادارت میں بھی کافی خدمات انجام دی ہیں جن میں نیوز ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور، نیوز ایڈیٹر روزنامہ عمر لاہور، چیف ایڈیٹر ہفت روزہ لائل پور اخبار لائلپور، ایڈیٹر سہ ماہی افق بہاولپور، بانی ایڈیٹر سہ ماہی ''اردو نامہ'' لاہور، صدر نشیں مجلس ادارت سہ ماہی ''الاقرباء'' اسلام آباد عالمی معیار کا تحقیقی وتخلیقی مجلّہ۔ آپ کی علمی وتحقیقی کاوشوں کا ذکر ان صفحات میں ممکن نہیں لیکن اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ منصور عاقل صاحب کی شخصیت مختلف الجہات اور ہشت پہلو ہیرے کی سی ہے جس کے ہر پہلو سے ایک نئی روشنی اور نئی جہتیں وا ہوتی ہیں۔

چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کے مسودے پر کام یوں تو میری جانب سے کافی مدت سے چل رہا تھا لیکن جناب منصور عاقل کی کتاب ''گلاؤٹھی'' جب منظر عام پر آئی تو ایک نئی تحریک پیدا ہوئی اور آپ کی یہ تصنیف اس کتاب کا محرک ثابت ہوئی۔ اللہ تعالی سے دعا گو ہوں کہ آپ صحت وسلامتی کے ساتھ رہیں اور ہمیں اور اس ملت کو زیادہ سے زیادہ آپ سے فیض حاصل ہو آپ کی عمر میں اللہ برکت عطا فرمائے۔ آپ اس وقت اسلام آباد میں مقیم ہیں اور باوجود ضعف العمری کے لکھنا پڑھنا جاری وساری ہے اور باقاعدہ آپ سہ ماہی الاقرباء کے شماروں پر کام کر رہے ہیں نیز علمی محافل اور مشاغل جاری ہیں۔

☆☆☆

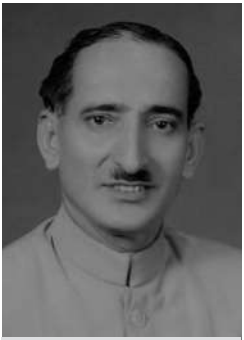

ظفر نیازی

ظفر نیازی۔ایک نقّاد

قمر آفتاب

موت زندگی کا سب سے غمگین عنوان ہے لیکن بعض زندگیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب ان پر موت کا عنوان قائم ہوتا ہے تو انکی حیات کے لاتعداد پہلو اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

ظفر نیازی صاحب بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھے۔انہوں نے زندگی کو جس طرح سمجھا اور برتا وہ انہیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز اور منفرد کر دیتا ہے۔انکی موت ایک حادثہ تو ہے لیکن یہ حادثہ انکی زندگی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اگر اہمیت ہے تو احساسات کی جو اُن کے دل میں تھے،ان کے جذبات کی جو ملک وملت کے لئے تھے۔اس اندازفکر اور طرزِ عمل کی جو صرف انہی کا حصہ وانفرادیت تھی۔انہوں نے ۱۹۰۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تک کا سفر جس منفرد انداز سے طے کیا وہ قابل تقلید بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔ باوجودیکہ زندگی کا ابتدائی دور انتہائی نامساعد حالات میں گزرا لیکن اپنے عزم واستقلال،محنت اور جدوجہد سے زندگی میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ایک ادیب،مصنف،طنز نگار،تنقید نگار اور ملک وملت کے سچے دردمند کے علاوہ بحیثیت انسان وہ ایک عظیم ہستی اور اعلیٰ اقدار اور بڑی پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔

ظفر نیازی صاحب نے صحافت میں قدم اپنے استادِ محترم خواجہ حسن نظامی صاحب کی رہنمائی کے ساتھ رکھا اور تاحیات اس عظیم سرمایۂ صحافت کی لاج رکھی۔جتنی شان اور سرفرازی کے ساتھ انہوں نے صحافت کا آغاز کیا آخر دم تک اِس مقدس فریضے کو مکمل دیانتداری سے نبھایا۔آپکی تحریر میں سادگی،برجستگی اور شگفتگی،درد اور فکر واحساس ہے۔

دہلی سے رسالہ ’’کامیاب‘‘ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں جاری کیا اور انتہائی عزم وجرأت کے ساتھ اپنے نظریئے کی تبلیغ اور ملت کی رہنمائی اپنے منفرد اندازِ صحافت میں کی۔سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر سخت اور بیباک تنقید کا انداز رسالوں میں انہوں نے ہی اپنایا۔

دہلی میں زنانہ دواخانہ کی بنیاد ڈالی جس کا سلسلہ کراچی میں آخر دم تک قائم رہا۔مارچ ۱۹۴۸ء میں کراچی سے ماہنامہ ’’نقاد‘‘ کا اجراء کیا جو انکی زندگی اور اندازِ فکر کی مکمل تاریخ ہے۔انکی تنقید میں سادگی اور شگفتگی کے ساتھ بلا کی تندی تھی۔خلوصِ دل،بے باک نظری اور احساساتِ آزادی سے آشنائی نے انکی تحریر کو ایک منفرد اسلوب اور اندازِ بیان بخشا۔دنیائے صحافت میں پاکیزہ اور اصلاحی تنقید کی نئی راہیں کھولیں،آپ کی دیگر مقبول ومشہور تصانیف ’’شیطان کی سوانح عمری‘‘ ’’نقاد اللغات‘‘ ’’حدیثوں کی ڈکشنری‘‘ ’’کاروانِ حیات‘‘ ’’قیامت کی نشانیاں‘‘ کے علاوہ لاتعداد مضامین ہیں۔

انجمن مدیرانِ جرائد کے وفد کے ساتھ یورپ،افریقہ اور چین کے دورے پر بھی گئے اور ملک وقوم کے بے باک

ترجمانی کی۔ انہوں نے جس بانکپن کے ساتھ زندگی بسر کی اسی انداز سے موت کو بھی لبیک کہا، یہ ان کے ہی قلم کا اعجاز ہے کہ جس نے ظفر نیازی والا نقاد اور نقاد والے ظفر نیازی کو لازم و ملزوم بنا دیا۔

جب بھی نقاد کا نام لیا جائے گا تو ظفر نیازی کا تصور اور ''نقاد'' ذہن میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ صحافت کے قدیم و جدید سنگم کی علامت تھے، ان کے دَم سے بہت سی قدیم روایتیں زندہ تھیں، ظفر نیازی کی صورت میں دنیا سے ایک اور خواجہ حسن نظامی اٹھ گئے،

ہم نشیں دستِ اجل کی کار فرمائی تو دیکھ
عظمتِ انسانیت کا نغمہ خواں رخصت ہوا
عمر بھر جس نے کیا ظلم و ستم کو بے نقاب
بے کسوں کا وہ رفیق و مہرباں رخصت ہوا

نذر عقیدت بخدمت محترم ظفر نیازی (مرحوم)

سید آفتاب عالم۔۱۳اپریل ۱۹۶۶ء

کرکے تحریر یوں ابلیس کا از روئے سخن
تو نے ماحول و ثقافت کو قلم بند کیا
فکرِ انسان کی پوشیدہ جہت چھُپ نہ سکی
تو نے اس طرح سے تہذیب کو تحریر کیا
فرق ظاہر کیا ، مکار شرافت کا ، سیاست کا
تو نے مظلوم کو تحریر سے طاقت بخشی
تو نے انسان کی عظمت کے ترانے گائے
فکرِ ابلیس کو ہر لمحہ ہی یوں خوار کیا
اپنے خالق کی طلب پر یوں کیا تو نے لبیک
جیسے ہر فرض کو ہر لمحہ نبھایا تھا کبھی
یوں اجل کو کہا لبیک ظفر مندی سے
یوں ظفر مند ہوئی روحِ مقدس تیری
حکم صادر ہوا از بارگہِ ربِ جلیل
میرِ نقاد کو بھی داخلِ جنت کردو

☆☆☆

انوارالحق کمالؔی

مولانا اصلح الحسینی

آپ کا نام انوارالحق، ابوالفرح کنیت اور کمالؔی تخلص تھا۔ شمس الحق خیاؔل کے علاّتی بھائی تھے۔ ابوالحسن ناطقؔ اور حکیم محمد صالح مرحوم کے ہم درس ساتھیوں میں تھے۔ مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی اور اس دور کے اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

آغاز جوانی ہی میں ترک وطن کر کے اپنی والدہ اور تین چھوٹے بھائیوں کے ساتھ گلاؤٹھی سے چلے گئے تھے۔ عرصہ دراز تک وطن میں کسی کو ان کا نام ونشان معلوم نہیں تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ایک طویل مدت کے بعد ایک مسافر کے طور پر وطن واپس ہوئے۔ اس اندیشے کے ساتھ کہ اب انہیں کوئی پہچان بھی سکے گا یا نہیں۔ فرماتے تھے کہ میں اپنے ہی جدّی مکان کو دور سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر حکیم محمد صالح مرحوم صبح کے وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ تلاوت سے فارغ ہوئے تو اس تجسّس میں کہ یہ کون اجنبی دیر سے ایک گوشہ مکان کے سہارے کھڑا ہوا ہے۔ میرے قریب آئے، مجھے پہچانا اور بڑی محبت سے بغل گیر ہوئے اور مجھے میرے اپنے ہی چچازاد بہن بھائیوں کے مکان میں تعارف کے لیے لے گئے جس کے باہر میں ایک اجنبی پردیسی کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ کمالی کی ابتدائی داستان طویل ہے۔ اگرچہ سبق آموز کہ کس طرح ایک انسان اپنی ابتدائی زندگی میں تمام دنیاوی سہاروں سے محروم ہو کر اللہ کے بھروسے اور اپنی جدوجہد کے سہارے اپنے بلند مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخری عشرہ میں یہ گلاؤٹھی ہی میں پیدا ہوئے اور ۱۸ برس کی عمر میں حصول تعلیم اور وطن کو خیرباد کہہ کر غربت ومسافرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ نہایت خوبصورت اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ کچھ عرصہ میڈھو ضلع علی گڑھ کے نواب صاحب کے بچوں کے اتالیق رہے اور پھر غربت زدہ شہر در شہر مشرقی بہار، اڑیسہ اور بنگال کے نواحی مقامات میں مارے مارے پھرتے رہے اور اخیر میں پاڑہ ضلع مان بھوم بہار میں یوپی یا دہلی کے ایک سید خاندان میں شادی کر کے وہیں بس گئے۔ نہایت پرجوش اور عوامی مقرر تھے۔ اتنے درد گو شاعر تھے کہ معمول کی باتوں کی طرح شعر کہتے تھے۔ بہار میں خاص طور پر ممتاز علماء اور خطیبوں میں شمار ہوتے تھے اور مولانا ابوالفرح کے نام سے مشہور تھے۔ طب میں بھی ان کی شہرت تھی جو آپ نے اپنے والد محمد حسین یقیںؔ سے پڑھی تھی۔

۱۹۴۰ء میں جب میں پٹنہ کے اخبار ''الہلال'' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو بعض اہل علم سے مولانا ابوالفرح کا نام ایک مبلغ، مستند عالم اور خطیب کی حیثیت سے سنا اور اس تجسّس میں کہ شاید یہی ابوالفرح ان کے نانا ہوں اپنا تعارف کراتے ہوئے ایک خط تحریر کیا۔ اس خط کے جواب میں بڑے شوق اور اضطراب کے عالم میں خود ہی بانکی پور پٹنہ چلے آئے۔ بڑے جذباتی انداز

میں ملے اور پھر کچھ دن بعد مجھے اپنے گھر ساتھ لے گئے۔ ملاقات کے بعد معلوم ہوا کہ ابتدائی زندگی میں تعلیم سے محروم رہ جانے والا یہ نوخیز طالب علم جو اپنی محرومی علم پر روتا تھا۔ ایک وسیع المطالعہ عالم اور شعر و ادب کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں ان کے ذاتی مطالعہ کا کتب خانہ بھی تھا جو ان کے شوق علم کی غمازی کرتا تھا۔

ادبی ذوق کے حوالہ سے وہ بھی داغ ہی کے مدرسہ ادب کی پیروی کرتے تھے اور ان ادبی رشتوں میں ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی سے ان کے خصوصی روابط تھے۔ اکثر وہ سی پی کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا سید محی الدین مدرسہ منبع العلوم کے مہتمم ان کے سینئر رفقاء میں سے تھے۔ ان کے صاحبزادے نظام الدین سے چھندواڑے میں کمالی کی ملاقات ہوئی۔ آپ کے کلام کا خاصا بڑا حصہ جو دو بڑے رجسٹروں میں تھا، آپ کے بھائی منظور الحق نے جمع کر لیا تھا جو اندیشہ ہے کہ بہار اور ٹاٹا نگر کے مسلم کش فسادات کے دوران ضائع ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں آپ کے بھائی اور بچے بھی شہید ہو گئے۔ آپ کے خاندان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ آپ کا کوئی ایک بیٹا غالباً اقرار الحق مشرقی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں نے ان سے کچھ ادبی استفادہ بھی کیا اور ان کے ضخیم مجموعہ کلام میں سے کچھ اشعار منتخب کیے تھے جو پیش خدمت ہیں۔ ان کا ایک شعر جو انہوں نے اپنی دکھ بھری طویل زندگی کی بپتا سناتے ہوئے پڑھا تھا، وہ آج بھی مجھے یاد ہے

چلا ہوں کوئے صنم سے کمالی اُکتا کر
خدا کرے نہ ملے میرے گھر کی راہ مجھے

☆☆☆

سید امیر حسن امیرؔ

سید منصور عاقل

سید امیر حسن کا اصلی وطن قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر تھا لیکن پیدا بھوپال میں ہوئے، جہاں ان کے والد سید نظیر حسن بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، پھر گلاؤٹھی آ گئے۔ وہیں قرآن ختم کیا، فارسی، عربی پڑھی، مڈل پاس کیا اور اس کے بعد کسی تعلق سے بلرام پور اور بہرائچ پہنچ گئے، وہاں سے میٹرک پاس کیا اور بھوپال پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ خلافت کی تحریک میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر گھر آ گئے۔ شعر و شاعری ورثہ میں ملی تھی، خاندان قاضیوں کا تھا لیکن مزاج اور مذاق رندانہ تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد سے کورٹ آف وارڈز میں ملازمت کر لی اور میرٹھ میں رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی آ گئے۔ شعر و شاعری پر ساری توجہ مرکوز کر دی اور کراچی کی ادبی دنیا میں اپنے لئے جلد ہی ایک منفرد مقام پیدا کر لیا۔

ہر صنف شاعری پر سید امیر حسن کو عبور تھا لیکن غزل اور تاریخ کہنے میں ان کا ثانی بمشکل مل سکے گا، انکی فارسی شاعری میں بھی وہی گداز ہے جو ان کی اردو غزل کو انفرادیت بخشتا ہے۔ غزلیں کی غزلیں سہل ممتنع میں ہیں اور بلا مبالغہ سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جو زبان زدِ خاص و عام ہونے کی کامل اہلیت رکھتے ہیں

کرم تمام ہی سہی ، صلائے عام ہی سہی
برائے نام ہی سہی ، حساب پھر حساب ہے

میکدے میں پاؤں رکھتے ہی چھناکا سا ہوا
جام تو سالم نظر آتے ہیں توبہ ہو تو ہو

آنکھیں ساقی کی مخمور
شیشے ہو گئے چکنا چور

طبیعت بڑی بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج پائی تھی۔ یگانگت اور اخلاص ان کا وظیفۂ حیات تھا، مخلص آدمی تھے، بہت اچھے دن دیکھے ہوئے تھے اور بڑے بڑے اساتذہ اور اہل کمال کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ اس امتزاج نے ان کی ذات میں ایک بڑے محبوب اور دلنواز دوست، ایک قادر الکلام اور طباع شاعر، ایک انجمن فروز اور محفل نواز ہمنشیں کی خصوصیات کو یکجا کر دیا تھا۔

گو کہ پاکستان میں ان کی معاشرتی حالت کچھ ویسی نہ تھی جیسی ہندوستان میں تھی لیکن اپنی سیر چشمی اور وضعداری کی بنا پر ان کے ہر درجہ کے شعراء اور ادیبوں سے مساویانہ اور بزرگانہ تعلقات تھے، اس میں بڑا دخل ان کے رکھ رکھاؤ کو تھا۔ نرم خو نرم مزاج

شیرین کلام،سعید الفطرت، ہرایک کے ساتھ وہ ایسے لبھاؤ سے ملتے کہ وہ ان کا بندۂ بے دام ہو جاتا اور پھر جب ان کے شعر سنتا تو ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔

۲۰ مئی ۱۹۷۹ء کو صبح اٹھے اور وضو کرنے کے لئے گئے، وضو کرتے کرتے گرے اور روح پرواز کر گئی

گلشن بکف رہے، وہ رہے جب تک اے امیرؔ
اور جب گئے تو ساتھ بہاروں کو لے گئے

☆☆☆

امیر حسن امیرؔ کی کچھ غزلیں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں جن سے ان کے کلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کلام مجھے ان کے بھتیجے بھائی آل حسن صاحب نے مہیا کیا تھا۔ نسیم الدین ہاشمی

تھک گئے تھے ، تری دیوار تلے بیٹھ گئے
مگر اب یہ کہ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

یوں کہیں منزلِ مقصود ملا کرتی ہے
کسمسا کر اٹھے ، دو گام چلے ، بیٹھ گئے

پاؤں اپنے ہیں ، نہ دل اپنا ، نہ منزل اپنی
دل چلا ، چلنے لگے ، پاؤں تھکے ، بیٹھ گئے

ان کی محفل میں نشست ان کی ہی مخصوص نہیں
ہم بڑھے اور تو وہ اور پَرے بیٹھ گئے

وہ اگر بادلِ ناخواستہ آئے بھی تو کیا
عرضِ معروض پہ دَم بھر کے لئے بیٹھ گئے

رہ گزارانِ محبت کی کسی نے نہ سنی
چیختے چیختے لوگوں کے گلے بیٹھ گئے

داد خواہوں کی لگی حشر میں صف ایک طرف
اک طرف ماہ جبینوں کے پَرے بیٹھ گئے

بیٹھنے تو نہ دیا مجھ کو کہیں بھی لیکن
محفلوں میں تری سکّے تو مرے بیٹھ گئے

دام تو عین نشیمن پہ لگایا لیکن
آپ خود چھپ کے نشیمن کے پَرے بیٹھ گئے

منہ چھپانے کی کہیں اور جگہ تھی ہی نہیں
ہم چراغوں ہی کے سایہ کے تلے بیٹھ گئے

☆☆☆

دورانِ سفر جب بھی کوئی گاؤں پڑے ہے
جو آدمی آوے ہے مرے پاؤں پڑے ہے

میں خود تو تمازت میں کھڑا رہتا ہوں لیکن
ہم سائے کے لوگوں پہ مری چھاؤں پڑے ہے

سایہ شجرِ سبز کا کیا سبز قدم ہے
تنکا بھی نہ پھوٹے ہے جہاں چھاؤں پڑے ہے

تپتے ہوئے صحرا کو نظر میں نہیں لاتا
ہر چند مرا سایہ مرے پاؤں پڑے ہے

اب فصلِ بہاراں کی بھی برداشت نہیں کچھ
ڈالوں ہوں کہیں اور کہیں پاؤں پڑے ہے

ہر چند گوارا ہی نہیں اس کو مگر پھر
جب پھینکے ہے پانسہ وہ مرے پاؤں پڑے ہے

☆☆☆

پھر اٹھے گا دردِ دل یہ فکر کھائے جائے ہے
کیا قیامت ہے کہ تھم تھم کر قیامت آئے ہے

کہنے بیٹھوں ہوں تو ان کا نام لب پر آئے ہے
چپ رہوں ہوں تو کلیجہ منہ کو آیا جائے ہے
بھولا بھولا راہبر ، تنہائیاں ویرانیاں
کس سے پوچھوں یار یہ رستہ کہاں کو جائے ہے
عقل کا بیگانہ بن ، اِس ہاتھ دے اِس ہاتھ لے
یاں کا دھندا ہے یہی جو کھوئے ہے وہ پائے ہے
تجھ سا داتا ہو تو خودداری کہاں کی، کس کی شرم
دامن اپنے آپ ہم جیسوں کا پھیلا جائے ہے
نیچی نظریں حسنِ ظن بھی اور سوءِ ظن بھی ہیں
آنکھ مل جائے تو دل کا چور پکڑا جائے ہے
کھوج کس کس کا لگائیں ان گنت ہیں نقشِ پا
آنے والا آئے ہے اور جانے والا جائے ہے
یہ جوانی تو مبارک ہو پر اتنا سوچ لو
سبزہ بڑھتا جائے ہے اور صحن دبتا جائے ہے
نازِ محرومی بجا حسنِ تغافل بھی بجا
تو نے پر اتنا نہ سوچا کوئی جی سے جائے ہے
سوزشِ دل کو ہَوا سے کام ہے ، کیسی بھی ہو
سانس ٹھنڈی ہی سہی پر آگ بھڑکا جائے ہے
جھوٹے وعدے کاوشِ دل کا مداوا تو نہیں
ہاں ذرا سی دیر کو آرام سا پڑ جائے ہے

وہ تو دھوکہ باز ہے، تم بت کہو کافر کہو
دل بھی کچھ مومن نہیں ہر بار دھوکا کھائے ہے

☆☆☆

انہیں ڈھونڈیں گے دل کی روشنی سے
نہ پوچھا ہے نہ پوچھیں گے کسی سے
نہ نکلا کام کچھ خود آگہی سے
خودی پائی تو پائی بیخودی سے
نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا کسی سے
پیے جاتا ہوں اشکِ غم خوشی سے
جو ہنستے تھے بڑی بے ساختگی سے
وہ روئے بھی بڑی دریا دلی سے
وہ ہیں بیزار اپنے جان جی سے
محبت ہوگئی شاید کسی سے
چلے اٹھ کر بڑی خود رفتگی سے
ابھی ٹکرا گئے ہوتے کسی سے
مری گاڑھی نہیں چھنتی کسی سے
مگر صاحب سلامت ہے سبھی سے
ہزاروں صورتیں نظروں سے اتریں
اندھیرا خوب تھا اس روشنی سے
وہ اک تصویر بھی تم نے منگا لی
کبھی ہنس بول لیتے تھے اسی سے
میں ان کی بوئے پیراہن چھپائے
بچا پھرتا ہوں اک اک آدمی سے
وہ بالیں پر کسی کا ہاتھ ملنا
محبت ہوگئی پھر زندگی سے
کسی کو مطمئن ہونے نہ دیں گے
کہیں گے کچھ کسی سے کچھ کسی سے

پتہ کی کہہ گئے سب سے ہنسی میں
سلام ان دوستوں کو دور ہی سے

☆☆☆

حافظ سید شمس الدین شمسؔ

ندیم ماہرؔ

تلاش بسیار کے بعد بھی آپ کی تاریخ ولادت ووفات کے بارے میں کوئی حتمی ثبوت نہیں مل سکا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ آپ کا انتقال مختلف شخصیات سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ۸۰ اور ۸۵ سال کی عمر کے درمیان ہوا، چنانچہ آپ کے والد سید سراج الدین کی وفات ۱۲۷۰ھ ہجری (۱۸۵۴ء) میں ہوئی، نیز آپ کے صاحبزادے سید محی الدین کی پیدائش ۱۸۷۸ء اور وفات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔

آپ کا سلسلۂ نسب سید شمس الدین ابن سید سراج الدین (آپ کی وفات ۱۲۷۰ھ ہجری میں ہوئی) ابن سید حسیب الدین ابن سید معین الدین ابن سید عبداللہ عرف شیخ ابّن (آپ امروہہ میں مدفون ہیں) ابن سید احمد (گنج رواں) ابن سید محمد ابن سید طیفور کرمانی ابن سید شہاب الدین کرمانی۔ اس طرح آپ کا سلسلہ (۴۸) نسلوں کے بعد حضرت امام حسینؓ سے جا ملتا ہے۔

آپ چھ بھائی اور دو بہنیں تھے۔ تاج الدین، جلال الدین، معز الدین، جمال الدین، سعید الدین، شمس الدین، حکیم النساء و شریف النساء۔

آپ کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، سیف الدین، افتخار الدین، نجم الدین، محی الدین، ہاجرہ بیگم و آمنہ بیگم۔ آپ کے صاحبزادے مولانا سید محی الدین صاحب (مجاز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ و مہتمم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی) پیدائش ۱۸۷۸ء وفات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ آپ مدرسہ منبع العلوم میں استاذ و مہتمم کی حیثیت سے رہے، چنانچہ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خانصاحبؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا فضل الرحمٰن، حضرت مولانا شمس الدین افغانی قاضی القضاۃ افغانستان جیسے علمائے کرام اور نابغۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب مرزا غالب (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء) حیات تھے اور یہ غالب کا آخری دور تھا۔ اسی لئے حافظ شمس الدین کی شاعری میں رنگ غالبؔ بہت نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر تابش مہدی اپنے مضمون میں فرماتے ہیں:

''ان کے بارے میں یہ تو نہ پتا چل سکا کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کب وفات پائی البتہ بعض قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے سخن وروں میں ہیں۔ اُن کا تعلق اس دور سے ہے، جو مرزا اسداللہ خاں غالب اور حکیم مومن خاں مومن کی شاعری سے گونج رہا تھا۔ ان کی شعریات ولفظیات اور شعر کے لہجہ واسلوب سے بھی اِس اندازے کی تصویب ہوتی ہے۔

غالب کے لہجے، اسلوب اور لفظیات کی چھاپ بہت واضح طور پر ملتی ہے۔

شریف اور سنجیدہ، شعراء اب اسٹیج پر آتے ہوئے گھبرانے لگے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا، جب شاعری شرفا و نجبا کی پہچان تھی۔ روزی روٹی سے نہیں جڑی تھی۔ لوگ صرف تسکینِ ذوق یا حسنِ ذوق کی نمائندگی اور اہل ذوق تک اس کی ترسیل کے لیے شاعری کرتے تھے۔ غمِ جاناں کی بھی باتیں ہوتی تھیں اور غمِ جہاں کی بھی۔ دونوں میں ایک حسین امتزاج ہوتا تھا۔ کسی معاشرے میں کسی کو شاعر تسلیم کرلیا گیا، گویا اس کی عظمت و شرافت کی شناخت قائم ہوگئی۔ حضرت شمس گلاؤٹھوی اُسی دور کے شاعر ہیں۔ اِسی میں وہ بڑی ذہانت و نظافت کے ساتھ قاری یا سامع پر دردِ دل بھی منکشف کردیتے تھے اور دردِ جہاں بھی مگر جو بات بھی کہتے تھے استعارے یا کنایے کے پردے میں کہتے تھے۔ شاعری خصوصاً غزل میں عریانی، پھکڑپن، اشتہار یا پروپگنڈا اہل علم و ادب کے ہاں سخت عیب تصور کیا جاتا تھا۔

جب ہم حضرت شمس گلاؤٹھوی کا کلام پڑھتے ہیں تو ان کی شعری مشق و ممارست کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مزاج وطبیعت کی طہارت و پاکیزگی کا بھی اور اس ستھرے، سنجیدہ اور ادب مزاج ماحول کا بھی، جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور شاعرانہ و سخن ورانہ زندگی بسر کی‘‘۔

آپ کی ایک غزل قارئین کے پیش خدمت ہے ۔

برقِ جمال یار سے آنکھ کوئی ملائے کیوں
خیرگیِ نگاہ کا روگ بھلا لگائے کیوں
جرم شکستِ عہد کا مست کے سر پہ آئے ، کیوں
جامِ الستِ بے خودی ، کوئی اسے پلائے کیوں
رکھتا ہے ناشناسِ قدر ، ظلم مری وفا کا نام
ایسے سے کہہ کے مدّعا ، بات کوئی بڑھائے کیوں
جب ہو نظر کا منتہا ، خوگرِ ظلم و جور ہی
پھر مرے دل کی آرزو، دل ہی میں رہ نہ جائے کیوں
خود کو ہلاک اِس لیے ہجر نصیب نے کیا
باقی رہے کسی کے سر ، روز کی ہائے ہائے کیوں
میرے نصیب میں نہیں جلوہ کسی کا دیکھنا
شام فراق جائے کیوں، صبحِ وصال آئے کیوں

چندسال قبل مدرسہ کے کتب خانہ میں جہاں سینکڑوں قدیم کتابیں موجود ہیں۔ میں نے کچھ نوادرات اور مخطوطات کے مطالعہ کا بیڑا اٹھایا۔ کچھ چیزیں ملیں تو میرا اشتیاق بڑھتا گیا اور تقریبا ایک سال کے عرصہ تک میں نے مختلف مراحل میں ڈھونڈنے کا

کام جاری رکھا۔اسی دوران مجھے حافظ سید شمس الدین صاحب (جو کہ رشتہ میں میرے دادا کے دادا ہوتے ہیں) کا تحریری کلام ملا جو چند اوراق پر مشتمل تھا۔اسی دوران دادا محترم مولانا سید حمید الدین اخترؔ کی ایک چھوٹی سی ڈائری ملی جس میں ایک سو پچاس سے زائد غزلیں موجود تھیں علاوہ ازیں والد محترم کی بھی ایک بیاض تقریباً ستّر صفحات پر مشتمل مجھے حاصل ہوئی۔ یہ تمام غیر مطبوعہ کلام تھا۔ گو کہ بوسیدگی کی وجہ سے اسے پڑھنے میں دشواری ہوئی لیکن الحمدللہ ٹائپنگ کا مرحلہ مکمل ہو گیا۔

اس وقت میرے پاس تین شعری مجموعے تیار ہیں جن میں حافظ سید شمس الدین، دادا محترم مولانا حمید الدین اخترؔ اور والد محترم مولانا سید نسیم الدین حامدؔ الحسینی کے کلام ہیں۔

اور اب الحمدللہ حافظ سید شمس الدین صاحب کا یہ کلام آپ قارئین کے سامنے جلد منظر عام پر آ رہا ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر ایک ادبی فریضہ تھا جس کے پہلے مرحلہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔

☆☆☆

سید ریاض الدین احمد ریاض

سابق مدیر اعلی مجلّہ (الصادق) سابق صدر شعبہ اردو صادق پبلک اسکول بھاولپور

سیدہ رخسانہ واسطی

زندگی کا زیادہ وقت درس و تدریس میں گزرا، کم عمری سے ہی بہت ذہین تھے، اس کی مثال گلاؤٹھی میں قیام کے دوران برادری کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے سے ملتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں منصور عاقل صاحب اور انڈیا میں نسیم صاحب سرفہرست ہیں۔ پبلک اسکول کے ہونہار شاگردوں میں عبدالستار لالیکا اور نادر عقیل موجودہ ڈپٹی کمشنر خان پور شامل ہیں۔ ریاض الدین صاحب نے کراچی کے تعلیمی ادارے پیپی ڈیل، عثمانیہ اسکول، ڈیسینٹ اسکول، عائشہ باوانی اور ہیکن ہاؤس میں معلم کے فرائض انجام دیئے۔ صادق پبلک اسکول بھاولپور میں سترہ سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریری مقابلوں، ڈراموں، بچوں میں مضمون نویسی اور خوشخطی کے مقابلوں کے لئے ایک ادبی سوسائٹی بنائی۔ بہترین معلم اور بہترین منتظم رہے۔

سید ریاض الدین احمد مرحوم محترم جناب حافظ سید شفیع الدین صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی مرحومہ نواب بانو کے دس برس کے بعد ان کے بیٹے راجہ بھاولپور میں پیدا ہوئے اور اپنے خاندان والوں کی آنکھوں کا نور بنے۔ عہد طفلی میں بہت لاڈ پیار کی شاہانہ زندگی گزاری۔ اپنے بزرگوں کے ہر دلعزیز رہے۔ ان کے چچا مرحوم رفیع الدین صاحب اور دوسرے چچا مرحوم نظام الدین کے بڑے لاڈلے تھے۔

والد صاحب چاہتے تھے کہ راجہ صاحب ڈاکٹر بنیں۔ ابتدائی اور اعلی ثانوی تعلیم SD اسکول بہاولپور میں حاصل کی پھر والد محترم نے بیٹے کو ڈاکٹر بنتا دیکھنے کی غرض سے علی گڑھ میں قیام کے دوران تمام سہولتیں مہیا کیں مگر راجہ صاحب ادبی ذوق کے مالک تھے، اس لئے سائنس کی طرف توجہ نہ دی اور اس دوران حالات زمانہ سے انکی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ آخر کار ناکامی کی صورت میں پاکستان آکر بہاولپور میں قیام پذیر ہوئے۔ دوران ملازمت وہاں رہ کر ادیب، عالم اور ادیب فاضل کیا، پھر ایس سی کالج بہاولپور سے گریجویشن کیا، اس دوران محکمہ چنگی میں محرر رہے۔ تمام زندگی رزقِ حلال کو ترجیح دی، اس وجہ سے جلد یہ ملازمت ترک کر دی۔ پھر محکمہ خوراک میں ملازمت اختیار کی مگر رشوت کی ملاوٹ سے بچنے کی وجہ سے علیحدگی اختیار کی۔ شاعری عہدِ جوانی سے کرتے تھے اور مشاعرے بھی کراتے، کچھ بننے کا جنون تھا۔

تمام مشکلات کا بہت عزم و ہمت سے مقابلہ کیا پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کراچی آئے اور انگریزی میں ایم اے کرنے کی غرض سے سال اول کا امتحان پاس کیا دوسرے سال کا معاشی قلت کی وجہ سے داخلہ نہ لے سکے مگر ہمت نہ ہاری۔ دوران ملازمت

سات بچوں کے ساتھ ایم اے اردو کیا۔ کراچی میں بھی رزق حلال کو ترجیح دی۔ پھر بھاولپور صادق پبلک اسکول میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے پرنسپل خان انور سکندر خان نے صدر شعبہ اردو بنا دیا۔ شاعری سے لگاؤ تھا، کافی غزلیں اور نظمیں لکھیں، خود دار بہت تھے، خوشامد بالکل پسند نہیں تھی، کبھی کبھی میں ان سے کہتی کہ دو ٹکے کے شاعر مشہور ہو رہے ہیں، آپ ٹی وی پر مشاعروں میں کیوں نہیں جاتے؟ مرحوم کہتے کہ لوگ مجھے تلاش کریں، میں لوگوں کے پیچھے نہیں دوڑوں گا۔ میں ٹوٹ سکتا ہوں، جھک نہیں سکتا۔ اردو، فارسی، انگریزی، سرائیکی اور پنجابی سمیت پانچ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ والد صاحب بہت پرخلوص مہمان نواز اور تیمار دار تھے۔ محلّہ اسلام نگر کا کوئی بچہ غلط کلام کرتا تو ناراض ہوتے، اگر کوئی بیمار ہوتا تو تیمارداری کرتے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ برادری سے تعلق کی بنیاد پر ہر عزیز، راجہ صاحب کے غریب خانے میں رہ سکتا تھا۔

کم مائیگی میں بھی دسترخوان وسیع تھا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ نہ جانے ہم کہاں کھو گئے ہیں۔ آج کے دور میں ہمارا فخر، غرور، تکبر رہ گیا ہے جبکہ یہ دنیا عارضی ہے، عاجزی اور انکساری اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے۔ پہلے ہمارے بزرگ رشتوں کے تعلق سے ملتے تھے مگر آج اسٹیٹس کے بھنور میں ایسے پھنسے ہیں کہ نئی نسل برادری کے تصور کو بھی بھولتی جا رہی ہے۔

والد صاحب کا انتقال ۲۷ ستمبر ۱۹۹۶ء بروز جمعہ المبارک ہوا اور اس طرح یہ سورج بھی غروب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ان کی اولاد میں سب سے بڑے بیٹے سید جاوید ریاض، جوان کی زندگی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے سوگوار چھوڑے۔ والد صاحب مرحوم کی آخری ایام کی بہت پسندیدہ غزل پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو پسند آئے گی۔

غزل

اگر محوِ خیال جلوۂ جاناں نہ ہو جائے
تو منزل طور کی میرا دلِ ویرانہ ہو جائے
نہ رکھ صیاد گلشن میں قفس برگشتہ قسمت کا
کہیں ایسا نہ ہو سارا چمن ویرانہ ہو جائے
ہوا کو بیر ہے مجھ سے، ہیں دشمن آندھیاں میری
جہاں پر آشیاں رکھ دوں وہیں ویرانہ ہو جائے
فقط اس آسرے پر رات کاٹی شمع نے رو کر
کہ شاید صبح تک زندہ میرا پروانہ ہو جائے
سحر تک شمع نے رو رو کر اشکوں سے لگن بھر دی

یہ مقصد تھا کہ غسلِ میتِ پروانہ ہوجائے
تیرے قربان جاؤں ، تو بنادے ایسا دیوانہ
جسے دیوانگی میں دیکھوں ، دیوانہ ہوجائے

☆☆☆

غزل

ذرے جو وہاں پہنچے تری راہ گزر سے
موسوم ہوئے چرخ پہ انجم سے قمر سے
دل سوز جہاں تاب محبت کے اثر سے
کچھ ایسا تعلق ہے مجھے برقِ شرر سے
ڈرتا ہوں نہ جل جائے کہیں پردۂ ہستی
اور عشق کی عفت پہ لگے داغ نظر سے
بو آہوں کی اور رنگ گلوں میں ہے بو سے
مفہومِ گلستاں ہے عنادل کی جگر سے
بادہ ہو صراحی بھی ہو ساقی بھی سبو بھی
میں جام کو چھولوں تو گھٹا جھوم کے برسے

☆☆☆

ندیم ماہرؔ

احمد اشفاق

دوحہ قطر کے شعری وادبی منظرنامے پر ندیم ماہرؔ کی شخصیت نہ صرف ایک جدید لب ولہجے کے باکمال شاعر کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے بلکہ ایک بہترین اور کامیاب ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بھی یہاں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہزاروں اشعار از بر اور ہر موضوع پر کوئی نہ کوئی لطیفہ یا کوئی ایسی بات جو ہر شخص کو متوجہ کرلے، یہ ان کا خاصہ ہے۔ ''انجمن محبان اردو ہند'' قطر جیسی فعال ادبی تنظیم کے نائب صدر اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے یوں تو عہدے کے اعتبار سے صدر ہیں مگر میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ روح رواں ہیں، قطر کی قدیم ترین تنظیم بزم اردو، قطر کے رکن اعزازی ہیں علاوہ ازیں دوحہ قطر کی دیگر ادبی ونیم ادبی، سماجی وملی اور دینی تنظیموں کے اجلاس میں بطور خاص شرکت ہی نہیں کرتے بلکہ بڑھ چڑھ کے حصہ بھی لیتے ہیں۔

ہندوستان کے تاریخی شہر'' گلاؤٹھی'' کے ایک علمی وادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب اپنے عہد کے ممتاز شاعر علامہ ناطقؔ گلاوٹھی سے ملتا ہے، دینی ودنیاوی علوم سے آراستہ ندیم ماہرؔ بلا کی ذہانت رکھتے ہیں۔ تہذیبی گھرانوں کا ورثہ اور ادبی صحبتوں کی بھرپور عکاسی انکی شخصیت اور شاعری کی اساس ہے جو جابجا انکی شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ شہرت کی خواہش سے بے نیاز رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ ادبی حلقوں میں بے حد سراہے جاتے ہیں، رسالوں سے لگاؤ کم اور کتابوں سے زیادہ ہے۔ ان کا رنگ سخن اوروں سے مختلف ہے، چونکہ ایک علمی وادبی گھرانے سے تعلق ہے اس لئے نہ زندگی میں اور نہ ہی فن شاعری میں کبھی بے راہ روی کا شکار ہوئے۔ ان کا ذوق قطر میں آنے سے قبل ہی پروان چڑھ چکا تھا، کسی ازم، تحریک یا شخص کے شعری کردار کا رنگ ان پر اثر انداز نہ ہوا۔ یہ میرا مشاہدہ بھی ہے کہ سب میں رہ کر ہمیشہ سب سے الگ سوچ وفکر کے مالک رہے ہیں اور اپنی زندگی اور شاعری میں self made رہے ہیں اور عملی زندگی میں پورے Commitment کے ساتھ جینے کا ہنر جانتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ہے۔

جہاں تک ان کے تعارف کا تعلق ہے ان کا پورا نام سید ندیم اختر، قلمی نام ندیم ماہرؔ، تعلیم فضیلت (دارالعلوم دیوبند) ایم۔ اے (دینیات) (علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)، وزارت داخلہ دوحہ، قطر (Ministry of Interior) میں مصروف عمل ہیں۔ ویسے ان کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۹۳ء میں مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں بحیثیت مدرس ہوا اور اپنے والد مولانا سید نسیم الدین جو اس وقت ناظم مدرسہ تھے کے ساتھ مدرسہ کے انتظامی امور میں رفتہ رفتہ دلچسپی لینی شروع کی اور ۱۹۹۵ء میں اپنے والد کے ارتحال کے بعد مدرسہ کا باقاعدہ انتظام سنبھالا۔ قدرتی صلاحیتوں سے مزین ندیم ماہرؔ کا پانچ سالہ دور بحیثیت صدر جمعیۃ علماء ضلع بلند شہر، مدرسہ سے نکلنے والے ماہنامہ ''میری رائے'' کی ادارت اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا شاہ ابرارالحق صاحب (خلیفہ اجل حضرت تھانویؒ) مولانا صدیق باندویؒ جیسے اکابرین نے ان کے دور میں گلاؤٹھی کا سفر کیا اور اسی دوران باضابطہ ایک تاریخی کلینڈر

شائع ہوا جس میں ادارہ کی ایک سو پندرہ سالہ تاریخ کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ بعد ازاں ۲۰۰۱ء میں دوحہ، قطر کا رخ کیا اور تب سے اب تک یہیں کے ہو رہے۔

ایک شعری مجموعہ ''دستکوں کے نشان'' کے خالق ہیں جو ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ ندیم ماہر اچھا خاصا تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ نظم وضبط کا عمدہ شعور ہے، انہوں نے اس سے قبل انجمن کے چیئرمین جناب حسن عبدالکریم چوگلے کی شخصیت، حیات و خدمات اور کارنامے پر مشتمل ''نقوش حیات'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دی ہے اور حال ہی میں میرا شعری مجموعہ ''دسترس'' شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب سے لے کر اشاعت تک کی ذمہ داری انہوں نے ہی بڑے ہی خوش اسلوبی سے نبھائی ہے۔ ان دنوں ادبی حوالے سے اپنی زرخیز سرزمین گلاوٹھی کی تاریخ پر مشتمل ایک کتاب اپنے عزیز جناب رضی الدین ہاشمی اور جناب نسیم الدین ہاشمی صاحبان کے ہمراہ ترتیب دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سالانہ ''عالمی مجلّہ دستاویز'' کی مجلس ادارت میں بھی شامل اور پیش پیش ہی نہیں بلکہ شعری حصہ کے مدیر بھی ہیں۔

ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں بحیثیت شاعر شرکت کی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کے مشاعروں میں شرکت کی۔ ۲۰۰۱ء قطر میں آمد کے بعد سے اب تک چھوٹے پروگراموں کے علاوہ عالمی مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے ۲۰۰۶ء اور ۲۰۱۴ء کے عالمی مشاعرے، بزم اردو قطر کے بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت اور اسکے علاوہ بحرین کے عالمی مشاعرے میں بھی شرکت کی ہے۔ نیز انجمن محبان اردو ہند کے لگاتار ۹ کل ہند مشاعروں میں اب تک بحیثیت شاعر نہ صرف شرکت کر چکے ہیں بلکہ دنیائے اردو ادب میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ہے۔ عربی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ انجمن ہی نہیں بلکہ یہاں ہونے والے بیشتر پروگراموں میں فی البدیہہ تقاریر کا ترجمہ اسٹیج پر ایسے کر دیتے ہیں کہ لوگ مبہوت رہ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے سے کافی تیاری کر کے آئے ہیں حالانکہ اسٹیج پر ان کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں عرب مہمان ہیں اور آپ کو ترجمہ کرنا ہے۔ اتنا سلیس ترجمہ ہوتا ہے کہ زبان پر رشک آنے لگتا ہے۔ دوحہ قطر میں مولانا رحمت اللہ ندوی (جو تقریباً دو درجن عربی کتابوں کے مصنف ہیں) کے ہمراہ وزارۃ الاوقاف (متحدہ عرب امارات) اور دارالقلم (بیروت) کی کتابوں کی ترتیب و تالیف و ترجمہ میں بھی حصہ لے چکے ہیں اور کئی معرکۃ الآراء کام اللہ نے ان سے لئے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے تین پشتوں کے غیر مطبوعہ کلام کو ترتیب دے رہے ہیں اور امید ہے کہ آنے والے چند سالوں میں انشاء اللہ یہ کلام منظر عام پر آجائیں گے۔

اردو زبان و ادب پر گہری نظر ہے، لب و لہجے میں وہ سلاست و روانی ہے کہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اپنی بھرپور آب و تاب سے رواں دواں نظر آتا ہے، خوش پوشاک و خوش گفتار ہیں، اپنی شیریں گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لینے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے، خوبصورت الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جن کا بخوبی استعمال کر کے اپنے مافی الضمیر کی برجستہ ادائیگی اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ زیر ترتیب کتاب ''تذکرہ سادات گلاوٹھی'' کو مقبولیت نصیب ہو اور تاریخ، علم اور ادبی دنیا میں اسے دوام حاصل ہو۔

☆☆☆

پانچواں باب

نامور شخصیات

منشی سید مہربان علی

منشی سید مہربان علی

مولانا سید اصلح الحسینی

منشی سید مہربان علی صاحب (مرحوم) ہماری تاریخ کے ان عظیم لوگوں میں سرفہرست ہیں جنہوں نے تعلیمی، مذہبی اور سماجی میدانوں میں غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے کچلنے کی کوشش کی۔ سیاست، ملازمت، تجارت اور تعلیم کے دروازے بند کردیے گئے۔ علمی درس گاہیں، لائبریریاں تباہ کردی گئیں، ہزاروں اہل علم اور اہل دین کو پھانسی دے دی گئی تاکہ مسلمان جن سے انگریز نے حکومت چھینی تھی کمزور ہوتے جائیں اور برصغیر کی نظامت اور معاشرت کو مغربی طرز پر ڈھال دیا جائے۔

ایسے نامساعد حالات میں منشی جی مرحوم نے آج سے ۱۴۵ سال قبل ۱۸۶۷ء میں اپنی بنائی ہوئی عظیم الشان مسجد میں ایک دینی درس گاہ قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تاکہ قرب وجوار کی بستیاں علمی فیض سے مستفید ہوسکیں۔ اس درس گاہ کی عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ بانی دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی نہج پر قائم فرمایا اور مولانا عبداللہ صاحب انصاریؒ کو مدرس اور اپنے فرزند حضرت مولانا محمد احمد صاحب کو برائے حصول علم اس مدرسہ میں داخل فرمایا۔ جن اکابر نے اس مدرسہ سے فیض حاصل کیا، ان میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا فخر الدین صاحبؒ، سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحب، سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

منشی مہربان علی کے محل کا بیرونی دروازہ

کالی ندی کا پل

اور مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ عربیہ منبع العلوم کے قیام کے بعد اس کے پہلے صدر مدرس مولانا قاسم نانوتویؒ کے داماد پیر جی عبداللہ تھے اور مولانا قاسمی کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحب نے اسی مدرسہ میں اپنی تعلیم کی ابتداء کی تھی اور صوفی محمد حسن صاحب سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

پیر جی عبداللہ صاحب ان کے صاحبزادادے محمد میاں منصور (جو بعد میں ریشمی رومال کی سازش کے انکشاف کے نتیجہ میں کابل ہجرت کر گئے تھے۔اور مولانا محمد قاسم کے صاحبزادے حافظ محمد احمد، منشی مہربان علی کے مکان پر جو محل کہلاتا تھا قیام پذیر رہے۔ مدرسہ منبع العلوم کے قیام کے سلسلہ میں جن دوسرے بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا ان میں خاندان پلولیہ کے جداعلی حاجی فدا علی اور ان کے صاحبزادے محمد حسین نفیس، خاندان مقبولیان کے بزرگ حیات اللہ اور قاضی فیض اللہ وغیرہ شامل تھے۔

☆☆☆

وصیت نامہ منشی سید مہربان علی

ایک نادرونایاب دستاویز

بعد حمد خالق ومخلوق کہ جس کے ارشاد کــن فیـکــون کا ظہور کائنات ہے۔اور نعت لاتعداد سرورِ کائنات جناب رسول مقبول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین،جنکی شان میں لـولاك لـمـا خـلـقـت الافلاك نازل ہے۔اور درود نامحدود اوپر آل واصحاب ان کے۔

یہ ہیچ کارہ کمترین خلائق سید مہربان علی خلف سید قاسم علی ابن سید فرحت علی حسنی الحسینی بیان طراز ہے'' کہ اگر ہر موئے تن میرا زبان ہوجاوے تو مجھ سے شکرِ نعمائی الٰہی ادا نہیں ہوسکتا۔ظاہر ہے کہ اوس رب قدیر نے تھوڑے سے زمانہ میں کیسے کیسے کام کہ جو باعثِ رفاہِ عام کے ہیں اپنے امدادِ یدِ قدرت سے بسعی ایں بیمقدار کے انجام کرائے۔خدایا تیرا کروڑ کروڑ شکر ہے۔اس قصبہ میں عرصہ تین سو برس کی تعمیر کی ہوئی ایک مسجد جو بلفظ بڑی مسجد مشہور تھی واقع تھی اور وہ اس قدر کہنہ ہوگئی تھی کہ اس کے گرنے کا احتمال تھا۔خداوندِ تعالی غریقِ رحمت فرماوے سید ولایت علی ولد سید غلام سرور مرحوم جس نے مجھکو ایک روز یہہ مشورت دی کہ اگر جامع مسجد جدید تعمیر ہوجاوے تو نہایت درجہ کا ثواب ہے۔چونکہ میرے خیال میں ایک امرِ اہم اور اپنی استطاعت سے زیادہ کام معلوم ہوا۔لہذا اوسوقت جواب نہ دیا مگر درگاہِ خداوندی میں ملتجی ہوا کہ خدایا یہہ تیرا کام ہے تو اپنی مدد سے اس کام کو انجام کرادے اور بفحوائے ''السـعـی منی والاتـمـام من الله ، بنامِ خدا بعد شہید کرا کے پہلی مسجد کے کارِ تعمیر مسجدِ جامع شروع کرادیا۔قربان ہوں اوسکی شانِ غفاری کے کہ عرصہ چار سال میں جامع مسجد تعمیر ہوگئی کہ جسکی شان اوسکے دیکھنے سے عیاں ہے۔بعد تعمیر ہونے مسجد کے دل میں یوں خیال آیا کہ ایک مدرسہ کا بھی پہلوئے مسجد میں بغرضِ خیر دائمی ہونا ضرورت سے ہے چنانچہ بصرف تخمیناً مبلغ چار ہزار روپیہ مکان مدرسہ تعمیر کرایا گیا جو نہایت وسیع اور طلباء کے رہنے کو حجرے موجود ہیں اور عرصہ چار سال سے درس وتدریس علم عربی وفارسی وکلام مجید طلبائے بیرونی وقصبہ کا مدرسہ میں ہوتا ہے۔ہرگاہ بنائے مدرسہ شروع کی گئی تو ارادہ کرلیا تھا کہ پچاس روپیہ ماہوارے یعنی چھہ سو روپیہ سال کی جائداد خرچ مدرسہ کے واسطے خرید کیجاوے اور مال کار وہ جائداد دوام کے واسطے وقف رہے۔چنانچہ بتدریج وقتاً فوقتاً خریداری جائداد کی ہوتی رہی۔اور جس قدر آمدنی اوس جائداد کی ہوتی ہے وہ تنخواہ مدرسان وخوراک طلباء وغیرہ مدرسہ میں اب تک خرچ ہوتی ہے، لاکن تاحال وہ جائداد چھہ سو روپیہ کی آمدنی کی مقدار کو نہیں پہونچی، چوں حیاتِ مستعار کا اعتبار نہیں ہے اور بقول بزرگاں'' کہ کارِ امروز را بفردا گذاشتن کارِ خردمنداں نیست'' جو جائداد کہ بہ نیت خرچ مدرسہ خرید کی گئی اور خرید کیجاتی ہے اوسکی تکمیل کو عرصہ درکار ہے۔لہذا میں وصیت کرتا ہوں کہ پانچ بسوہ موضع کتوری پرگنہ اگوتہ کہ جسکی آمدنی اس وقت مبلغ (۸۵۰) روپیہ سالانہ ہے واسطے خرچ مدرسہ دوام کے واسطے وقف رہے،اور پچاس دیگر آمدنی مری جائداد سے شامل ہوکر جملہ (۶۰۰) روپیہ سالانہ

خرچ مدرسہ کے واسطے مقدر رہا۔میری ریاست کے کارپرداز مالگذاری پانچ بسوہ موضع کتوری جواس وقت دیجاتی ہے، بندوبست آئندہ میں مقرر ہو، دیگر آمدنی میری جائداد سے سرکار میں ادا کرتے رہیں، اور میرے وارثان کو جائدادِ موقوفہ سے کچھ تعلق نہ ہیگا۔نہ مجاز اوسکی تقسیم کا ہوگا اور تکملہ دستاویز وقف عنقریب پورا پورا کرادیا جاویگا۔اوراس وقت دینے رائے میں از روئے تجربہ وبرتاؤ واسطے خرچ کرنے (روپیہ) ماہواری جائداد موقوفہ اور چار روپیہ آمدنی دوکانات زیر جامع مسجد ودیگر امورات انتظامی مدرسہ سید محمد حسن خلف سید عنایت علی مرحوم امین معلوم ہوتے ہیں، لہذا سید محمد حسن مسطور واسطے خرچ کرنے رقم موقوفہ اور امورات انتظامی مدرسہ متولی مقرر ہو، متولی مذکور میرے مشورہ کے موافق یا دیگر اصحاب جو بطور کمیٹی کے آئندہ مقرر ہوں انتظام مدرسہ واخراجات میں ساعی رہیں، اور آغاز ماہ محرم الحرام ۱۲۹۸ ہجری قدسی سے عملدرامد اس کا ہوتارہے۔اور بابتہ ششماہی اول ۱۲۹۸ ہجری یعنی فصل خریف ۱۲۹۸ ہجری فصل کے مبلغ تین سو روپیہ متولی کو دیدیا جاوے اور تفصیلات خرچ کی اسطرح ہونی چاہئے:

جمیع آمدنی جائداد موقوفہ معہ کرایہ دوکانات

آمدنی پانچ بسوہ کتوری محال موقوفہ	۹۵۰ نقد
آمدنی کرایہ مکانات	۵۰ ماہواری

خرچ

تنخواہ مدرس اول عربی	۳۰ روپے
تنخواہ مدرس دوم	۱۵ روپے
تنخواہ مدرس کلام مجید	۴ روپے
خوراک کل طلبائے عربی ساکن بیرونی فی کس ڈھائی روپیہ	کل ساڑھے پچیس روپے
برائے خرچ روشنی مدرسہ ودیگر خرچ مثل خاکروب وغیرہ	ڈیڑھ روپیہ
تنخواہ مؤذن مسجد	ایک روپیہ تین آنے

چونکہ بمقابلہ ۹۵۰ ماہوار رقم آمدنی کے مبلغ ۵ ماہوار کا خرچ حسب تفصیلات مندرجہ صدر زائد ہوگیا لہذا مبلغ پانچ روپیہ ماہوار میرے پاس سے منجملہ مذکورہ کے واسطے شمول ساڑھے اٹھارہ خوراک طالب علموں میں اور دیا جایا کریگا اور متولی مذکور کا یہہ بیان ہے کہ میرا نفس پابندی ایک جگہ کو قبول نہیں کرتا لہذا میں اپنی تنخواہ اس آمدنی سے نہ لونگا، پس جو رقم کہ بابتہ چندہ کے دیگر اصحاب قصبہ یا بیرونی بنظرِ خیر دیتے ہیں اوس رقم میں سے متولی کو جو خواندگی فارسی کا ذمہ دار ہے اور امین ومہتمم مدرسہ ہے تنخواہ مقررہ حال ملتی رہے یا جو مناسبِ وقت ہو، باقی رقم چندہ سے جو رہے وہ دیگر اخراجاتِ ضروری مدرسہ میں خرچ ہوتا رہے، علاوہ بریں ماسوائے خرچ مذکورہ صدر فراہمی کتب یا فرش وغیرہ سامانِ مدرسہ میں ہی منجانب راقم امداد ہوتی رہے گی، فقط ایک نقل اسکی متولی کو دیجاوے اور ایک

میرے ہاں دفتر میں رہے۔فقط سید مہربان علی عفاعنہ بقلم خود۔

خدایا تو بہائی مسلمانوں کوتوفیق عطا کیجو کہ اس مدرسہ کی ترقی میں ساعی رہیں اور جوامر باعثِ ترقی اورانتظام مدرسہ کا ہو اوسمیں مشورتِ نیک دیتے رہیں،فقط سید مہربانعلی

گواہ — گواہ

عبدالمجید عفی اللہ عنہ — فضل اللہ ولد قاضی عنایت اللہ

مقبرہ منشی سید مہربان علی

نوٹ:

قارئین کی دلچسپی اورمعلومات کے لئے اورمنشی سید مہربان علی مرحوم کی خدمات کے اعتراف نیز انکے تقوے اورللّٰہیت کے ثبوت کے طور پران کا تحریر کردہ وصیت نامہ پیش کیا ہے جس میں مسلم امت کے لئے اُس دور میں تڑپ اور فی سبیل اللہ اپنے آپ کو وقف کردینے کا ایک سبق موجود ہے۔۱۹۸۶ء میں میرے سفر ہندوستان کے دوران مولانا سید نسیم الدین صاحب (ناظم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی) نے یہ نادرونایاب دستاویز کی کاپی مجھے عنایت کی تھی۔جوتقریباً ڈیڑھ سوسال پرانی ہے (واضح رہے کہ اُس زمانہ میں جواردو رائج تھی ہم نے اس کو برقرار رکھا ہے)

نسیم الدین ہاشمی

☆☆☆

شجرہ منشی مہربان علی

منشی مہربان علی ہمشیران الفت النساء زوجہ عطاء حسین و شریف النساء زوجہ علی حسین (۴۳) ولد قاسم علی (۴۲) ولد اہتمام علی (۴۱) ولد فضل علی (۴۰) ولد محمد طاہر (۳۹) ولد محمد صدیق (۳۸) ولد فتح الدین (۳۷) ولد سید محمد باقر (۳۶) ولد سید مداری (۳۵) ولد سید اکبر (۳۴) ولد سید تبارک یا سید مبارک (۳۳) ولد حسام الدین (۳۲) ولد عبداللہ (۳۱) ولد فتح اللہ (۳۰) ولد جمال الدین یا کمال الدین (۲۹) ولد سید احمد زیدی واسطی (۲۸) ولد شمس الدین (۲۷) ولد تاج الدین (۲۶) ولد سید حسین (۲۵) ولد اویس (۲۴) ولد فرید الدین (۲۳) ولد علاء الدین (۲۲) ولد سید عوض (۲۱) ولد سید ابوالفرح ثانی (۲۰) ولد ابوالفراس (۱۹) ولد سید ابو الفرح واسطی (۱۸) ولد سید داود (۱۷) ولد سید حسین واسطی (۱۶) ولد سید یحیٰی (۱۵) ولد سید زید ثالث (۱۴) ولد سید عمر (۱۳) ولد سید زید ثانی (۱۲) ولد سید علی (۱۱) ولد سید حسین عراقی (۱۰) ولد سید علی عراقی (۹) ولد سید حسین مدنی (۸) ولد سید علی (۷) ولد سید محمد اشرف (۶) ولد عیسیٰ ابو یحیٰی (۵) ولد زید شہید (۴) ولد علی اوسط زین العابدین (۳) ولد حضرت حسینؑ (۲) والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ (۱) زوجہ حضرت علی بنت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بشکریہ: سید نعیم احمد

☆☆☆

حافظ سید شفیع الدین

حافظ سید شفیع الدین (بابو جی)

رضی الدین ہاشمی

ہم سب انہیں ''بابو جی'' کہتے تھے، ہمارے بابو جی کو یہ لقب غالباً ان کی بہاولپور کی نوکری کے ابتدائی دور میں ملا تھا اور اس زمانے میں یہ لقب عزت اور ہر دلعزیزی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خاندان، محلّہ، قصبہ بلکہ پورا ضلع بلند شہر انہیں بابو جی کے نام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ پھولوں جیسا چہرہ، سر پر سلیقہ سے بندھا ہوا صافہ، شیروانی اور بید (چھڑی/عصا) بابو جی کی بیرونی شخصیت کے لازمی اجزاء تھے۔ وہ پان کھاتے تھے اور بہترین چائے پینے کے عادی تھے۔

بابو جی اعلیٰ درجہ کے سوشل ورکر (خادم خلق) تھے۔ انہوں نے تعلیم کے کاز کے لئے جو خدمات انجام دیں، چوتھی دہائی کے پُر آشوب دور میں جس طرح مسلمانوں کی رہنمائی اور ۱۹۴۷ء میں جس طرح بے گناہ مسلمانوں کا دفاع کیا، اس سے وہ گلاؤٹھی کے مضافات میں مسلمانوں کے ہیرو بن گئے۔

بابو جی انیسوں صدی کے آخری دہائی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کا سن ۱۸۹۳ء تھا لیکن تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں۔ ان کے والد سید شہاب الدین محلّہ حافظان سے تعلق رکھتے تھے اور بسلسلۂ ملازمت زیادہ تر قصبہ گلاؤٹھی سے باہر ہی رہتے تھے لیکن انکے بیوی بچے گلاؤٹھی ہی میں ان کے والد سید اکرام الدین کے پاس مقیم تھے۔ بابو جی کی ننھیال اُلدن میں تھی۔ انکی والدہ اُلدن کے مشہور خاندان ''حویلی'' سے تعلق رکھتی تھیں، بابو جی کو اپنی ننھیال کے عزیزوں سے بیحد محبت تھی۔

بابو جی کی ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی ہی میں ہوئی۔ قصبہ کے مشہور حافظ بہادر خان نے انہیں قرآن حفظ کرایا۔ انکے والد سید شہاب الدین کا چالیس سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا، اور زندگی کے معمول کے مطابق چلنے کی راہیں دفعتاً مسدود ہو گئیں۔ اس

طرح ۱۹۰۹ء میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر تین بھائیوں بابو جی، سید رفیع الدین اور سید نظام الدین اور ایک چچا سید ظہور الدین پر مشتمل یہ خاندان ریاست بھاولپور ہجرت کر گیا۔ اُس زمانہ میں گلاؤٹھی کے ایک بزرگ سید برکت اللہ صاحب ریاست کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے اُس خاندان کا جو وسائلِ حیات سے محرومی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا، آڑے وقت میں بڑا ساتھ دیا، نامساعد حالات کے باوجود جوانی میں بابو جی کے کردار اور امکانات نے سید برکت اللہ صاحب کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا مقدر انکے ساتھ کر دیا۔ ان ہی کی کوششوں سے بھاولپور کے چیف کورٹس میں بابو جی اور انکے بھائی سید رفیع الدین کو ملازمتیں مل گئیں۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور انکا شمار ریاست کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ انکی ذہانت، کارکردگی اور قابلیت کے پیش نظر ریاست کے چیف جسٹس سید سراج الدین نے بابو جی کو اپنا پیش کار مقرر کر دیا۔

تلاشِ معاش کے لئے بابو جی نے وطن چھوڑ دیا تھا لیکن جب فارغ البالی آئی تو وطن کی یاد آئی۔ ہر سال بہاولپور سے گلاؤٹھی کا سفر ہوتا اور جو کچھ پس انداز ہوتا اسے قصبہ میں لگا دیتے، یعنی قصبہ میں زمینیں خرید لیتے۔ اسد اللہ نام کے ایک راج مستری نے انہیں سمجھایا کہ وہ انکے لئے ایک اچھا مکان تعمیر کریں گے، اگر وہ ہر سال کچھ رقم اس مد میں اسے دے دیا کریں۔ بابو جی نے اتفاق کر لیا، پہلا مکان ۱۶ سال میں تعمیر ہوا اور اس کا نام ''شہاب منزل'' رکھا گیا۔ اس کے بعد بلند شہر روڈ کے دونوں طرف آمنے سامنے دو کوٹھیاں معرضِ وجود میں آئیں جن میں سے ایک کا نام ''رین بسیرا'' ہے، اس کوٹھی میں اب ''مفید عام انٹر کالج ہے، جس کے بانی حافظ سید شفیع الدین تھے۔ یہ کوٹھی انہوں نے مفید عام کے حوالہ کر دی تھی۔ دوسری کوٹھی مفید عام اسکول کے سامنے جی ٹی روڈ کے شمال میں ہے۔ بیج بھنڈار کے نام سے ہے اور سرکاری تصرف میں ہے۔

بھاولپور سے قبل از وقت پنشن لے کر جب وہ گلاؤٹھی پہنچے تو بس اسٹینڈ کے قریب ایک بستی ''شفیع پورہ'' کے نام سے بس چکی تھی، شہاب منزل اور بلند شہر روڈ پر دو کوٹھیوں کے علاوہ رین بسیرا کے ساتھ ۳۲ پکّی دکانیں اور ایک بڑی اراضی اب انکی تھی۔ قصبہ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر جن زمینوں پر آم کے پودے لگائے تھے، اب وہ جوان باغ بن چکے تھے۔

قصبہ کے اس نئے رئیس کے دماغ میں اس دولت اور جائیداد نے کوئی تکبر یا غرور پیدا نہیں کیا، بابو جی نے مادی وسائل کو صرف اخلاقی مقاصد اور معاشرے کی بہبود کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے وسائل کو تعلیم کے اعلیٰ کاز کے لئے استعمال کریں گے۔ علاقہ کے مکینوں کے لئے بہتری کے کام کریں گے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں انجمن رفیق الطلباء نام کی ایسوسی ایشن کا رجسٹریشن کرایا گیا اور اپنی کوٹھی رین بسیرا میں مفید عام مکتبہ اسلامیہ اور مفید عام اسکول کے نام سے تعلیمی اداروں کا آغاز ہوا۔ مفید عام آج تک انکی کوٹھی رین بسیرا اور اسکے کمپاؤنڈ میں ہے اور بابو جی کی قربانی کی یاد دلاتا ہے اور ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا، بقول کسے کہ

جہاں رہے گا وہیں روشنی لُٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

بابو جی کو لڑکیوں کی تعلیم سے بھی برابر کی دلچسپی تھی، چنانچہ لڑکیوں کے تعلیم کے لئے مفید عام انگلش گرلز اسکول اپنے ایک اور ذاتی مکان میں قائم کیا تھا جو بوجوہ نہ چل سکا اور اسے جلد ہی بند کر دینا پڑا۔

مفید عام اسکول اب مفید عام انٹر کالج بن چکا ہے اور قصبہ اور گردونواح کے مسلمان بچوں کے لئے ایک بڑی نعمت ہے ۔اس ادارہ کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے انہوں نے سرسید کی سنت کی پیروی کی ۔اپنا بہت کچھ دینے کے بعد قوم کے بچوں کے لئے انہوں نے اپنی جھولی پھیلائی۔

اکبرپور، مٹھے پور سے لے کر سینٹھ، ولایت نگر تک گلاؤٹھی کے قرب وجوار کے چالیس مسلم دیہات (جو چالیسہ کہلاتے ہیں) کے لوگ گواہ ہیں کہ قصبہ کا ایک رئیس کس طرح علم کی جوت (روشنی) جگانے کے لئے انکی بستیوں میں برسوں تک آبلہ پا ہوتا رہا۔

یہ صحیح ہے کہ بعض لوگوں نے انکی مخالفت کی لیکن وہ کسی کے مخالف نہیں تھے۔ انکا موقف بے شک سخت ہوتا تھا لیکن اپنے مخالفین کو ہمیشہ معاف کر دیا کرتے تھے۔ایک نوجوان نے بار بار انکی مخالفتِ بیجا کی لیکن بابو جی نے جب بھی ان کا ذکر کیا تو تعریف کی۔خاص طور پر انکے ایک کام کے لئے جو انہوں نے پاکستان جاکر کیا تھا، سراہتے تھے۔

بابو جی کو اپنے عزیزوں سے خاص طور پر ننھیال کے عزیزوں سے بہت محبت تھی، ان میں صلہ رحمی کا زبردست جذبہ تھا۔ بابو جی کے بھانجے بھائی عزیز احمد (جنہیں عزیز عالم کے نام سے جانا جاتا ہے) کے ثانوی مرحلہ کی تعلیم کی تکمیل میں کچھ رکاوٹ تھی، بابو جی کو معلوم ہوا تو فوراً اپنے پاس بلا لیا اور ان کا ہائی اسکول مکمل ہونے تک اپنے پاس رکھا۔

انگریزوں کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے تصفیہ کا وقت آیا ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرہ نے قصبہ کے مسلمانوں میں بھی جوش وخروش پیدا کر دیا۔ بابو جی نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کے ایک ادنیٰ سپاہی بن کر قوم کی خدمت کریں گے، خاندان کے بیشتر لوگوں کا تعلق ''جمعیۃ علمائے ہند'' سے تھا اور اس نسبت سے قصبہ میں کانگریس کا بڑا اثر ورسوخ تھا، بابو جی کے چچازاد بھائی مولانا سید حمید الدین پکّے کانگریسی تھے، وہ بابو جی کو مسلم لیگ میں آنے سے بار بار روکنے کی کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ پیرومرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تک کو گھر لے آئے لیکن فیصلہ اٹل تھا اور ٹل نہ سکا۔

یہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ نے پارلیمنٹ کا ٹکٹ نواب زادہ لیاقت علی خان کو دیا، ان کا مقابلہ کانگریس امیدوار محمد احمد کاظمی سے تھا۔ یوپی اسمبلی کی سیٹ پر مسلم لیگ کی جانب سے کنور عمار احمد خان رئیس دان پور امیدوار تھے۔حافظ صاحب نے تن من دھن سے مسلم لیگ کے لئے کام کیا، نواب زادہ صاحب، حافظ صاحب کے قائم کردہ مفید عام اسکول میں تشریف لائے اور نہایت کامیاب جلسہ کیا۔ دونوں امیدوار کامیاب ہوئے اور انکی کامیابی پر تاریخی جلوس نکالا گیا۔نواب زادہ صاحب نے بابو جی کے لئے نہ صرف شکریہ کا خط بھیجا بلکہ ان کا بھیجا ہوا ۷۵۰ روپئے کا ایک منی آرڈر بھی موصول ہوا جو الیکشن کے اخراجات کے سلسلہ میں تھا۔ یہ منی آرڈر شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گڑھ مکتیشور کے فساد کے متاثرین کے لئے حافظ صاحب نے بڑا کام کیا، انہوں نے قیامِ امن کمیٹیاں بنائیں اور امن جلوس نکالے، ریلیاں کیں اور تقریریں کر کے لوگوں کو پُرامن رکھنے کی کوشش کی۔

گلاؤٹھی اور نواحی بستیوں میں بڑی حد تک امن برقرار رکھنے میں حافظ صاحب کا کردار مرکزی تھا لیکن جب گلاؤٹھی سے چند میل دور دھولانے اور اس کے آس پاس مواضعات میں روز حملے ہونے لگے تو حافظ صاحب نے فیصلہ کیا کہ مدافعت کی جائے ، جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ جب مدافعت کرنے والے مسلمانوں کے خلاف انتظامیہ نے کاروائی کرنے کی کوشش کی تو حافظ صاحب نے چیف منسٹر کے سامنے کے انکی بے خوف وکالت کی اور انہیں سزا سے بچانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے فوراً بعد جب یو پی میں تنسیخِ زمینداری کا قانون پاس کیا گیا اور اس پر عمل درآمد ہوا تو بابو جی نے محسوس کیا کہ یہ قانون دراصل مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی انتقامی کاروائی ہے، ہمیشہ اس پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔

بابو جی پُر فکر اور عملی انسان تھے، وہ محبت کرنے والے، مدد کرنے والے اور ہر آدمی کا حق اس تک پہنچانے والے تھے ۔جس طرح اپنی اولاد کو تعلیم دلانا اپنا فرض سمجھتے تھے، اسی طرح اپنے پڑوسی کے بچوں کی تعلیم کا بھی خیال رکھتے تھے اور اس مد میں عملی اقدام کرتے تھے، ارادہ کے مضبوط تھے لیکن مزاج میں نرم روی اور اعتدال انکی شخصیت کا خاص عنصر تھا۔

بابو جی ہم سب کے محبوب تھے اور اپنی قوم کے غمخوار، عمر کے آخری مرحلہ میں وہ پاکستان آ گئے تھے لیکن انکی یادگاریں موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گی۔ کوئی کیوں اور کس طرح انہیں فراموش کرسکتا ہے۔ شاید شاعر نے اس موقعہ کے لئے ہی کہا تھا

زندگی ایسی جیو تم دشمنوں کو رشک ہو

موت ہو ایسی کہ دنیا دیر تک ماتم کرے

بابو جی نے علاقہ کے مسلمانوں کے لئے دیہات کوآپریٹیو سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد بھی رکھی، جس کے قیام کا مقصد چھوٹے کاشتکاروں کو قرضوں کی فراہمی اور پارٹر کی بنیاد (مال کے بدلے مال) پر ایک دوسرے کی مدد کا پہلو مدِ نظر تھا۔ کسانوں کو بیج اور کھاد وقت پر مہیا کرانا اور فصل کی خرید و فروخت میں مدد اس کے اغراض ومقاصد میں شامل تھے۔ یہ ادارہ بعدازاں Cooprative Bank کی شکل اختیار کر گیا اور آخر میں بابو جی نے ادارہ کی بہتری کے لئے اس کو حکومت کی سرپرستی میں دے دیا۔

آپ مفید عام اسکول کے مینیجر کے طور پر ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۶ء تک خدمات انجام دیتے رہے اور قصبہ کی سیاست سے تنگ آ کر اسکول کے اس وقت کے ہیڈ ماسٹر ابراہیم کو مینیجر مقرر کر کے خود کو انتظامی امور سے علیحدہ کر لیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کسٹوڈین کے مقدمات کی پریشانیوں میں گھِر گئے، اس زمانے میں وہ قصبہ کے بعض لوگوں کے شر اور فساد کا اور مقامی مخالفت کا شکار بنے لیکن وہ کسی کے مخالف نہ ہوئے۔ وہ اپنے مخالفین کو ہمیشہ معاف کر دیتے تھے، انتقام کی خُو اُن کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔

قصبہ میں سید فخر الحسن، سید ظفر احمد، سید حسن خورجوی، مولوی حمید الدین، ڈپٹی کلکٹر صادق علی کا شمار انکے بہی خواہوں اور دوستوں میں ہوتا تھا۔ مقدم فیضیاب اور علاقہ دار رحمت اللہ خان صاحب سے انکے دوستانہ مراسم تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد گو انہوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن علاقہ کے معروف سیاست دان بابو جی کی فہم وفراست اور سیاسی سوجھ بوجھ کے بے حد

معترف تھے۔شمیم عالم خان صوبائی اسمبلی کے وزیر اور M.L.A، ارتضی حسین جو بلند شہر سے یوپی اسمبلی کے ممبر تھے اور سعید احمد خان جو Constition Legislative Council کے ممبر تھے بابو جی کی رائے اور مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

بلند شہر کے کئی نوابوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے جن میں قابل ذکر نواب صاحب اورنگ آباد، نواب صاحب کنور عمار احمد خان دانپور، نواب صاحب سعید احمد خان آف چھتاری، نواب صاحب راجہ اکبر علی خان پنڈاول ہیں۔نواب صاحب پنڈاول کے صاحبزادہ رضا علی خان نے تو بار ہا راقم الحروف سے بابو جی کی ان خدمات کا ذکر بڑی احسان مندی کے جذبات کے ساتھ کیا جو اپنے والد اکبر علی خان کے لئے بابو جی نے سرانجام دی تھیں۔

ضلع کے کلکٹر (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) اور پولیس کے اعلی افسرانِ امن عامہ اور عوامی مسائل سے متعلق بابو جی کی رائے اور مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ان لوگوں میں قابل ذکر سید حامد علی صاحب تھے جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

منشی سید حفیظ اللہ جو بھائی فجنّ کے نام سے جانے جاتے تھے، انکے مختار اور منشی تھے۔آپ نہایت مہارت اور عمدگی سے اس آڑے وقت میں بابو جی کے مادی معاملات میں مدد کرتے رہے۔منشی حفیظ اللہ صاحب بابو جی کی پہلی اہلیہ عائشہ بیگم کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور انہوں نے پوری زندگی بابو جی کی خدمت میں گزار دی۔

بابو جی کے دستِ راست جناب ماسٹر بشیر احمد کے ذکر کے بغیر بابو جی کے سفر کی کہانی بڑی ادھوری ہے۔ماسٹر بشیر احمد جو انکے ہم زلف بھی تھے بابو جی کی فرمائش پر ریٹائرمنٹ کے بعد گلاؤٹھی آباد ہوگئے تھے۔انہوں نے جس طرح رات دن بابو جی کے قانونی امور پر انکی مدد کی اس کی مثال نہیں ملتی۔جس زمانہ میں بابو جی کسٹوڈین کے ۷۰ سے زیادہ مقدمات میں گھرے ہوئے تھے، بشیر احمد صاحب کی مدد سے بڑی عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے۔وہ نہ صرف ہم دونوں بھائیوں کے استاذِ محترم تھے بلکہ ہماری تربیت میں بھی ان کا کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انکی سادگی، انکی نگہبانی، انکی فراست۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بابو جی کے ہندوستان کے قیام کے آخری عشرے میں بابو جی کے چچازاد بھائی مولوی سید حمید الدین صاحب مرحوم اور ان کے صاحبزادگان نے جس طرح بابو جی کی خدمت کی اور خیال رکھا اس کے بابو جی ہمیشہ معترف تھے۔انہوں نے عم برداری کا حق ادا کردیا۔

بابو جی کی پہلی اہلیہ عائشہ بیگم جناب برکت علی اور محترم عزیز بانو کی چہیتی اور سگھڑ بیٹی تھیں۔اس کامیاب انسان کی کامیابیوں میں یقیناً ان کا بڑا دخل تھا۔انکی ہنرمندی، سلیقہ اور سگھڑمندی کے بابو جی ہمیشہ معترف رہے۔۱۹۴۶ء میں ان کا گلاؤٹھی میں انتقال ہوا۔

۱۹۴۸ء میں بابو جی نے ہاپوڑ کے مشہور سادات خاندان میں سید شرف الدین اور محترمہ حنیفہ خاتون کی بیٹی شاہجہاں بیگم سے عقدِ ثانی کرلیا، انہوں نے خدمت اور وفا شعاری کی وہ مثال قائم کی جسے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔

بابو جی بڑے خوش قسمت انسان تھے، دونوں بیویوں سے انکے ۶ بیٹے اور ۳ بیٹیاں پیدا ہوئیں اور ان کا یہ خاندان خوب پھلا پھولا۔

سب سے بڑے بیٹے ریاض الدین بھاولپور صادق اسکول میں شعبۂ اردو کے سربراہ تھے، انکی اولادیں سعودی عرب اور کینیڈا میں مقیم ہیں اور الحمدللہ سب تعلیم یافتہ اور اعلی عہدوں پر فائز ہیں۔ دوسرے بیٹے سید شمیم الدین احمد کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر رہے اور انکے صاحبزادے ہمایوں احمد نے وہیں سکونت اختیار کی اور اس وقت وہ وہاں کی ایک جانی پہچانی کاروباری شخصیت ہیں۔ تیسرے بیٹے سید فصیح الدین چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے، وہ امریکہ اور وینزویلا کے ممتاز اداروں میں اعلی عہدوں پر فائز رہے۔ انکے صاحبزادے داؤد یورپ کی ایک مشہور لا فرم کے مینیجنگ پارٹنر ہیں۔ چوتھے صاحبزادے سید رضی الدین جدہ (سعودی عرب) میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کے سربراہ ہیں، انکے صاحبزادے نیوجرسی امریکہ میں ایک حکومتی ادارہ سے منسلک ہیں۔ پانچویں صاحبزادے سید نسیم الدین بھی جدہ (سعودی عرب) میں مقیم ہیں اور ایک تجارتی فرم کے سربراہ ہیں اور انکے صاحبزادگان بھی معروف کمپنیوں سے منسلک ہیں جنہوں نے برطانیہ کی معروف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ چھٹے صاحبزادے سید وسیم الدین ہاشمی کراچی میں ایڈوکیٹ ہیں، اور کراچی ٹیکس بار کی ایک معروف شخصیت ہیں اور بیٹے شعبہ قانون میں مشہور لا فرم فخر الدین جی ابراہیم میں تربیت حاصل کر چکے ہیں اور اطہر سعید لا فرم سے منسلک ہیں۔

بابو جی کی سب سے بڑی بیٹی نواب بانو کی شادی بابو جی کے پھوپی زاد بھائی حافظ سید عبدالغنی سے ہوئی اور انکی اولاد اعلی تعلیم یافتہ اور اعلی عہدوں پر فائز رہی۔ ایک صاحبزادے عثمان غنی سندھ کے ایڈوکیٹ جنرل رہے ہیں، دوسری بیٹی رضیہ صاحبہ کی شادی سید حامد علی جعفری سے ہوئی اور انکی بھی سب اولادیں اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں حیثیت کی حامل رہی ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی فیروزہ جناب منسوب علی زیدی کی اہلیہ ہیں اور اسلام آباد میں ایک ماڈل اسکول انتہائی اعلی معیار کے ساتھ چلا رہی ہیں۔ انکے صاحبزادے بھی ایک معروف تعلیمی ادارہ سے منسلک ہیں اور وزارت خارجہ کے مشیر کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

بھاولپور کے طویل قیام کے دوران انکے بہترین دوستوں میں میر جمیل (سابق چیف جسٹس بھاولپور چیف کورٹ)، خان بہادر کرنل مقبول قریشی (وزیر داخلہ ریاست بھاولپور)، سردار ایوب ڈہر، حکیم ظہور احمد اور پروفیسر اقبال قابلِ ذکر ہیں۔

مختصر بیماری کے بعد ۴ اپریل ۱۹۸۳ء کو انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

شجرہ حافظ سید شفیع الدین

حافظ سید شفیع الدین برادران سید رفیع الدین و سید نظام الدین ہمشیرہ مہر بانو زوجہ پیر جی محمد شفیع (۴۱) ولد حافظ سید شہاب الدین (۴۰) ولد حافظ سید اکرام الدین (۳۹) ولد حافظ سید تاج الدین (۳۸) ولد حافظ سید سراج الدین (۳۷) ولد سید حسیب الدین (۳۶) ولد سید شہاب الدین (۳۵) ولد سید علاء الدین (۳۴) ولد سید معین الدین (۳۳) ولد سید ابوالعلی (۳۲) ولد سید ابوالکلام (۳۱) ولد سید ابوالقاسم (۳۰) ولد سید عبداللہ (۲۹) ولد سید احمد (۲۸) ولد سید محمد (۲۷) ولد سید ظیفور کرمانی (۲۶) ولد سید شہاب الدین کرمانی (۲۵) ولد امیر سید محمد (۲۴) ولد سید محمود کرمانی (۲۳) ولد سید احمد (۲۲) ولد عبدالخالق (۲۱) ولد سید محمد (۲۰) ولد سید زاہد (۱۹) ولد عبداللہ محمد (۱۸) ولد سید محمود (۱۷) ولد سید جنید (۱۶) ولد سید محمود (۱۵) ولد سید علی (۱۴) ولد سید معروف (۱۳) ولد ابوشکر عبدالعزیز (۱۲) ولد عبدالرحمان (۱۱) ولد عبداللہ (۱۰) ولد موسیٰ (۹) ولد ابراہیم ابن رضا (۸) ولد علی رضا (۷) ولد موسیٰ الکاظم (۶) ولد جعفر صادق (۵) ولد محمد جعفر الباقر (۴) ولد علی اوسط زین العابدین (۳) ولد حضرت حسینؓ (۲) والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ (۱) زوجہ حضرت علی بنت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بشکریہ: سید نعیم احمد

☆☆☆

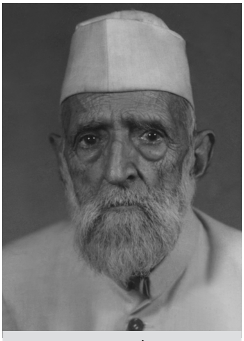
حافظ شفیع الدین

حافظ شفیع الدین: ایک روشن چراغ

پروفیسر عزیز احمد

انسانی تاریخ گواہ ہے قوموں کی تقدیریں رہنما بدلتے ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو، سماجی، سیاسی، معاشی، صنعتی، تعلیمی، ثقافتی یا صحافتی، بغیر رہنمائی کے بے جان رہتا ہے۔ ہر شعبہ میں کسی نہ کسی نہج سے کام تو جاری رہتا ہے لیکن جب تک رہنما نہ ہو کوئی غیر معمولی پیش رفت نہیں ہوتی۔ جیسے ہی رہنما سامنے آتا ہے شعبہ کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ چنانچہ یہی فارمولہ اس بستی پر بھی صادق آتا ہے جو یوپی کے ضلع بلند شہر میں واقع ہے اور میرٹھ۔ بلند شہر ہائی وے پر بلند شہر خاص سے جنوب کی طرف صرف پچیس کلو میٹر دور ہے۔ گلاؤٹھی سادات کا تاریخی قصبہ ہے جو اب ایک چھوٹے شہر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مغلیہ دور میں علم وتہذیب کا گہوارہ تھا لیکن اس دور کے زوال کے بعد بیسویں صدی کے وسط تک گلاؤٹھی اور اطراف کی مسلم آبادی تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہو گئی تھی۔ یہاں ایک قدیم مدرسہ اپنی بدلی ہوئی شکل میں اب بھی باقی تھا یعنی وہاں اب صرف دینی تعلیم ہو رہی تھی لیکن عام خاندانوں کے بچوں کے لئے جدید تعلیم کے راستے بالکل بند تھے۔ فطری طور پر لوگوں کو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنے کی آرزو تھی لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لوگ اگر چھوٹی موٹی کوششیں کرتے بھی تھے تو غیر موثر رہ جاتی تھیں۔ ان حالات میں ایک بزرگ جو انہی میں سے تھے اور ان سے بہت دور رہ رہے تھے ان کے درمیان لوٹ آئے اور تعلیمی شعبہ میں ان کے رہنما بن گئے۔ جلد ہی اپنی کوٹھی ''رین بسیرا'' میں ''مفیدِ عام'' کے نام سے ایک اسکول قائم کر دیا جو بعد میں ایک انٹر کالج بن گیا۔ یہ بزرگ دراصل حافظ شفیع الدین (مرحوم) تھے جو گلاؤٹھی کے ایک سید خاندان کے چشم وچراغ تھے اور جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وطن سے دور پنجاب کی ریاست بہاول پور میں بسلسلۂ ملازمت گزارا تھا ۱۹۴۴ء میں ریٹائر ہو کر گلاؤٹھی واپس آ گئے تھے اور اپنی باقی زندگی تعلیم کے کاز کے لئے وقف کر دی تھی۔

حافظ شفیع الدین، سید شہاب الدین کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ میرٹھ ضلع کے الدن (عربوں کی ایک اور تہذیب ساز بستی) کے ایک معروف خاندان سے جو حویلی والا خاندان کہلاتا تھا تعلق رکھتی تھیں۔ وہ حاجی عبدالرحیم کی بڑی صاحب زادی تھیں جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہوئی۔ (تذکرتاً حاجی عبدالرحیم کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی تھی) وہ میری والدہ کی سگی پھوپھی تھیں اور اس رشتہ سے حافظ صاحب میرے ماموں تھے۔

حافظ صاحب کی تعلیم گلاؤٹھی کے قدیم تاریخی مدرسہ منبع العلوم (جامع مسجد) میں ہوئی تھی، جو ابھی تک قدیم طرز پر تھا اور وہاں جملہ علوم متداولہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ وہ نہایت باصلاحیت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دو بھائی اور تھے۔ یہ تینوں بھائی ریاست بہاولپور میں سرکاری ملازمتوں پر تھے۔ حافظ صاحب خود ایک جج کی عدالت میں ریڈر تھے۔ اتنی دور ملازمت پر رہنے کے باوجود انھوں نے

اپنے وطن سے تعلق بنائے رکھا۔ یہاں ان کے چھ باغ، دو کوٹھیاں اور دوسری جائداد کے علاوہ قصبہ کے اندر ایک رہائشی مکان 'شہاب منزل' کے نام سے تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حافظ صاحب نے اسی مکان میں رہائش اختیار کی۔

حافظ صاحب کی شخصیت پر کشش تھی، میانہ قد، ہلکا پھلکا جسم، کتابی چہرہ، سرخ وسفید رنگ۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ قمیص، پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ سر پر صافہ باندھتے تھے اور گھر کے باہر بید (چھڑی/عصا) ہاتھ میں رکھتے تھے۔ لہجہ نرم، گفتگو معقول، معاملات میں راست بازی اور حق پسندی تھی۔ وہ ہمدرد اور دور اندیش، حلیم اور روادار، خوش پوش اور خوش طبع تھے۔ کم کھاتے تھے، کم بولتے تھے، کم سوتے تھے۔ قہقہہ نہیں لگاتے تھے، صرف مسکراتے تھے۔ زندگی کی سمجھ بوجھ بدرجہ اتم تھی۔ ذات پات اور مسلکی امتیازات سے بالاتر تھے۔ اقربا پروری اور انسان دوستی روزمرہ زندگی میں ان کے برتاؤ میں نمایاں رہی۔ ان کے اندر بڑا پن تھا لیکن ہمیشہ عام آدمی کی طرح رہے۔ انھوں نے عوام سے کبھی اپنے کو علیحدہ نہیں رکھا اور اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی عام لوگوں کے تئیں اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کیا۔ ان کے اندر قومی جذبہ غالب رہا۔ وہ قوم کی حالت کے بارے میں برابر سوچتے رہے۔ اس راستے میں انھوں نے زحمتیں بھی گوارہ کیں اور قربانیاں بھی دیں۔ قوم میں پھیلی ہوئی ناخواندگی انھیں بے حد تکلیف پہنچاتی تھی۔ یہ ان کی عملی طرز فکر کا ثبوت ہے کہ انھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی پہلی فرصت میں گلاؤٹھی میں 'مفیدِ عام' کی بنیاد ڈال دی جو اب انٹر کالج ہے اور جس کے توسط سے صرف اڑسٹھ سال کی مدت میں گلاؤٹھی اور اطراف کے چالیس پچاس دیہات میں تعلیم عام ہوگئی۔ جس طرح وہ اپنی بچوں کی تعلیم کے لئے کوشاں رہے اسی طرح انھوں نے قوم کے بچوں کی تعلیم کی فکر کی۔ ان کی حوصلے اور قربانی کا یہ زندہ ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنی پسندیدہ کوٹھی اور اس کے اطراف کی زمین اسکول کے اول دن سے اس کے لئے چھوڑ دی تھی۔ چنانچہ یہ کوٹھی اور زمین مفید عام کی ملکیت ہے اور رہے گی۔

میرا رشتہ ان سے میری ماں کی طرف سے تھا اور مزید تعلق کی شروعات میرے ایک مشکلاتی دور میں غیر معمولی ہمدردی سے ہوئی اور رفتہ رفتہ میرے لئے زبردست اثر پذیری اور ان کے لئے میرے اوپر زبردست اعتماد میں بدل گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں میری طبیعت پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا۔ آخری دور میں وہ میرے اوپر اتنا بھروسہ کرنے لگے تھے کہ تمام ذاتی معاملات اور باتیں مجھ سے کہہ دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی مشورہ بھی کرتے تھے۔ میرے والد کے انتقال کے وقت میری عمر صرف ساڑھے تین سال کی تھی اور میری بیوہ ماں جو حافظ صاحب کی حقیقی ماموں زاد بہن تھیں، نامساعد حالات میں اپنے پانچ بچوں کو پرورش کر رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے والد کے انتقال کے بعد جو عزیز ہم سے ملتے رہے ان میں حافظ صاحب کا نام سرِ فہرست تھا۔ سن 1943 میں مالی وجوہ سے تعلیم بند ہونے پر میں نے ایک سال دہلی جا کر ملازمت کی لیکن تعلیم کا راستہ نہیں نکلا۔ میں وہاں سے لوٹ آیا اور قریب کے ایک قصبے میں شوگر کین سوسائٹی میں لیجر کلرک کی حیثیت سے ایک سال مزید ملازمت کی۔ اس دوران ایک راستہ نکلا۔ مجھے ہائی اسکول کا امتحان دینا تھا اور حالت یہ تھی کہ سولہ سال کی عمر تک بھی میں انگریزی کی اے بی سی ڈی سے واقف نہیں تھا۔ اب دورانِ ملازمت اسی قصبے میں ایک انگریزی کوچنگ سینٹر کھلا اور میں نے فوراً اس میں داخلہ لے لیا۔ اسی دوران حافظ صاحب نے گلاؤٹھی میں مفیدِ عام شروع کر دیا تھا۔ انھیں کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ میں تعلیم کے لئے سرگرداں ہوں اور کوئی صورت بن نہیں

پا رہی۔ انھوں نے میری والدہ کو کسی کے ذریعہ کہلوایا کہ اگر عزیز پڑھنا چاہتا ہے تو اسے فوراً گلاؤٹھی بھیج دو۔ میں نے اپنے مقصد کے لئے اس اشارے کو غیبی مدد خیال کیا۔ والدہ نے حسبِ عادت فوراً اجازت دے دی۔ صرف یہ وعدہ لیا کہ میرے بھائی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ میں گلاؤٹھی چلا گیا۔ حافظ صاحب نے اپنے بھائی کا مکان جس میں صرف ان کی والدہ یعنی میری نانی رہتی تھیں، میری رہائش کے لئے منتخب کیا اور اسکول میں پرنسپل اور انگریزی کے استاد محمد میاں سے میرا تعارف کرا دیا۔ میں نے باقاعدہ داخلہ نہیں لیا، صرف ضرورت کے مطابق اسکول سے استفادہ کیا۔ اسی کی ضروت بھی تھی اور یہ سہولت غیر معمولی تھی۔ مجھے اجازت تھی میں حسب ضرورت کسی بھی کلاس میں بیٹھ سکتا تھا۔ اسطرح میں نے پہلی کلاس سے دسویں تک انگریزی کی تمام درسی کتابیں دو سال سے بہت پہلے ختم کرلیں کیونکہ دو سال کے آخر میں مجھے ہائی اسکول کا پرائیویٹ امتحان دینا تھا انگریزی کے علاوہ میں نے فارسی کی تیاری بھی مکمل کرلی۔ باقی مضامین اردو کے توسط سے تھے وہ میں نے خود پڑھ لئے۔ اس طرح میرے لئے اعلیٰ تعلیم کے امکانات مستحکم ہوگئے۔ حافظ صاحب کی سر پرستی میں میرے تین سال گلاؤٹھی میں گزرے۔ دو سال تعلیم میں صرف ہوئے اور تیسرا سال بسلسلئہ ملازمت گزرا۔ میں نے حصولِ تعلیم کے لئے جو وقت گزارا ہے، اس میں یہ تین سال بے حد اہم رہے ہیں۔ اس دوران میرے مقصد کے حصول میں زبردست پیش رفت ہوئی اور میری شخصیت سازی بھی ہوئی۔ میں نے انگریزی اور فارسی سیکھ لی اور ہائی اسکول کا امتحان سن ۱۹۴۷ء میں فرسٹ ڈویژن اور تین مضامین میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔ گلاؤٹھی کے یہ تین سال ایسے تھے جب میں پوری آزادی محسوس کرتا تھا۔ میرے دماغ پر نہ دقیانوسیت کا دباؤ تھا نہ کوئی غیر ضروری روک ٹوک۔ تعلیمی سہولت غیر معمولی تھی۔ مشفق استاد میسّر تھے، پڑھنے کے لئے وقت تھا، کتابوں کا ذخیرہ تھا، یکسوئی تھی، والی بال کھیلنے کے لئے اسکول کا اسپورٹس فیلڈ تھا، شطرنج کھیلنے کے لئے گھر میں بساط اور مہرے تھے اور یہ سب حافظ صاحب کی توجہ اور محبت کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔

میرے انگریزی کے استاد محمد میاں صاحب تھے۔ بی اے ایل ٹی۔ مجھے کلاس کے علاوہ گھر پر بھی وقت دیتے تھے۔ ان کی مہربانیاں ناقابل فراموش ہیں، دوسری بڑی سپورٹ حافظ صاحب کے بڑے بیٹے سید ریاض الدین تھے۔ انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور انگریزی بولنے کی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اردو اور انگریزی کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ دوسری کتابوں کے علاوہ ان کے پاس سیکسٹن بلیک لائبریری کے جاسوسی ناولوں کا ایک پورا بکس تھا جو میں نے بتدریج سارے پڑھ ڈالے۔ چونکہ ان کتابوں کا اسٹائل اور لفظیت کم وبیش یکساں ہوتے تھے اس لئے ان کے مطالعہ نے انگریزی تحریر کو سمجھنے کی میری صلاحیت کو بہت کم وقت میں بڑھا دیا تھا۔ ہائی اسکول کا انگریزی کورس پڑھانے میں محمد میاں صاحب کے ساتھ ریاض بھائی نے بھی میری بہت مدد کی تھی اور انھوں نے انگریزی بولنے کا حوصلہ بھی ایک حد تک پیدا کر دیا تھا۔ ریاض بھائی اپنی مرضی کے آدمی تھے۔ ان کا جب دل چاہتا مجھے پڑھاتے تھے لیکن میں ہمیشہ پڑھنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ بہر حال پڑھاتے روزانہ تھے۔ میرے ساتھ شطرنج کھیلنا پسند کرتے تھے۔ عام طور پر جب بھی وہ کسی اور کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے، لڑائی ہوتی تھی کیونکہ ان کی عادت چال واپس لینے کی تھی لیکن میں بخوشی چال واپس دے دیتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو ان کی غلط چال پر واپسی آفر کر دیتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ میں دنیا میں واحد شخص ہوں جس سے ریاض بھائی کبھی نہیں لڑے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ مجھ سے بہت نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔

اس طرح میرے دو سال اطمینان سے گزر گئے۔ان دو سالوں میں حافظ صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کے مشاہدے کا موقع ملا اور تیسرے سال میں بحیثیت لیڈران کے کارناموں کا شاہد رہا۔اس سال میں انھوں نے اپنے شہر اور اطراف میں فرقہ واریت میں امن اور ہم آہنگی کے لئے غیر معمولی کام کیا۔

حافظ شفیع الدین نے دو شادیاں کیں۔پہلی اہلیہ سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔بڑے بیٹے سید ریاض الدین ۱۹۴۷ء کے بعد بہاولپور چلے گئے تھے۔جہاں انھوں نے صادق ایجرٹن کالج میں تدریس کا کام کیا۔ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی منتقل ہوگئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔دوسرے بیٹے سید شمیم الدین تھے جو امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں نفسیات کے استاد کی حیثیت کی کام کرتے تھے اور وہیں ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔تیسرے سید فصیح الدین تھے۔آئرلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وینزویلا (جنوبی امریکہ) میں بس گئے تھے اور وہیں ایک کار حادثہ میں ان کی وفات ہوگئی۔بڑی بیٹی تقسیم سے پہلے ہی بہاولپور میں تھیں۔دوسری بیٹی شادی کے بعد شوہر کے ساتھ ترک وطن کرگئی تھیں۔دسمبر ۱۹۴۶ء میں بڑی اہلیہ کا انتقال ہوگیا اور وہ تنہا رہ گئے۔تنہائی سے مجبور ہوکر انھوں نے دوسری شادی کی جس سے ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔بیٹی اسلام آباد میں رہتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ اپنا اسکول چلاتی ہیں اور دو بیٹے سید رضی الدین ہاشمی اور سید نسیم الدین ہاشمی بسلسلۂ ملازمت اور کاروبار جدہ میں ہیں۔تیسرے بیٹے سید وسیم الدین ہاشمی کراچی میں ٹیکس کنسلٹنٹ شعبہ سے وابستہ ہیں۔

۱۹۴۷ء کا سال حافظ صاحب کے لئے کئی اعتبار سے بے حد سخت ثابت ہوا۔رفیقِ حیات طویل رفاقت کے بعد داغِ مفارقت دے گئیں۔ان کا خاندان تقسیم وطن سے پہلے ہی دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔اب اور تقسیم ہوگیا اور عزیزوں سے ملنے میں بھی پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔اس کے نتیجے میں وہ کم و بیش تنہا رہ گئے تھے۔میں تعلیم کے لئے علی گڑھ میں تھا۔کم مل پاتا تھا۔میرے اوپر جس قدر اعتماد وہ کرتے تھے اس کے پیش نظر میرا گلاؤٹھی سے دور ہو جانا بھی ایک بدقسمتی تھی۔حافظ صاحب اپنی باقی زندگی اپنے وطن میں گزارنا چاہتے تھے اور تنہائی کا احساس بڑھتا جارہا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح حافظ صاحب میں قوت فیصلہ کی کمی نہ تھی۔انھوں نے تنہائی کو شکست دینے کے لئے دوسری شادی کرلی اور حسبِ سابق اپنی اولاد کی پرورش اور دوسرے ذاتی اور سماجی مسائل میں مصروف ہوگئے۔اس طرح ان کی زندگی نارمل ہوگئی۔حافظ صاحب کا یہ عمل اس وقت بظاہر حیران کن تھا لیکن بعد میں دانشمندانہ ثابت ہوا۔

حافظ صاحب ایک سیاسی رہنما بھی تھے لیکن سیاست ان کی زندگی میں سماجی اصلاح کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی جس کے لئے وہ ہمیشہ زیادہ تر فعال رہے۔۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے تعلق سے فرقہ وارانہ فضا اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ لوگوں میں زبردست انتشار اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔اس دوران حافظ صاحب نے شہر اور اطراف میں امن قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔میٹنگیں کیں، ریلیاں نکالیں، تقریریں کیں اور انفرادی طور پر لوگوں کو سمجھایا۔ہندو اور مسلمان سب ان کی بات سنتے تھے۔میں اس دور میں ان کے ساتھ رہا اور ان کو پوری بے خوفی کے ساتھ یہ سب کام کرتے دیکھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس دور میں گلاؤٹھی اور اطراف میں تقریباً صد فیصد امن رہا تو اس میں حافظ صاحب کی موثر اور دانشمندانہ قیادت کا بڑا دخل تھا۔

اسی دوران اطراف میں ایک بڑے مسلم گاؤں پر دوسرے فرقے کے گاؤں والوں نے مسلح حملہ کردیا، گاؤں والوں نے

مؤثر مدافعت کی جس کے نتیجے میں کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے اور مرے بھی۔ دونوں طرف سے رپورٹیں ہوئیں، بات لکھنؤ تک پہنچی۔ یوپی کے وزیراعلیٰ پنڈت گوبند ولبھ پنتھ خود موقع پر آئے۔ حافظ صاحب بھی جو مسلم گاؤں والوں کی پیروی کر رہے تھے موجود تھے۔ دونوں طرف کے بزرگ سربراہ بھی آمنے سامنے تھے۔ حملہ آوروں کا الزام تھا کہ پہلے مسلمانوں نے ہمارے گاؤں پر چڑھائی کی اور ہمیں مارا۔ ایک بزرگ مسلمان نے حملہ آوروں کے بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہم بھی راجپوت ہیں اور تم بھی۔ ایک ہی خاندان کے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تم ہندو ہو اور ہم مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے لئے آجکل زمانہ خراب ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم ہمارے گاؤں آکر ہمارا حال پوچھتے۔ مصیبت کی گھڑی میں ہمارے ساتھ کھڑے ہوتے مگر الٹا تم ہمارے اوپر چڑھ آئے۔ نہ ہم اپنے نقصان سے خوش نہ تمہارے نقصان سے خوش لیکن تمھیں ایسا نہیں کرنا تھا۔'' پنتھ جی سن رہے تھے ۔ حافظ صاحب نے کہا ''پنتھ جی ،کیا آج کے حالات ایسے ہیں کہ مسلمان کسی دوسرے گاؤں پر چڑھ کر جانے کی بات سوچیں گے؟'' پنتھ جی نے کہا '' حافظ صاحب تو پھر آپ ہی بتایئے یہ مسئلہ حل کیسے ہو؟'' حافظ صاحب نے جواب دیا '' دونوں فریقوں سے پنچایت نامہ بھروایئے ،دستخط کرایئے ، مسئلہ ختم ہو جائے گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حافظ صاحب ایک روشن چراغ تھے۔ گورکی نے کہا تھا کہ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں: لکڑی کی طرح گر کر یا شمع کی طرح جل کر۔ حافظ صاحب نے شمع کی طرح جل کر ہی زندگی گزاری۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد خاص طور پر اپنی زندگی کا بیش تر وقت مفید عام اسکول قائم کرنے ،اس کا انتظام کرنے اور اسے بنانے سنوارنے میں صرف کیا اور علاقے میں بھائی چارگی کی فضا قائم رکھنے میں بڑا رول ادا کیا۔ ادارے سازی میں بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں انھیں گلاؤٹھی اور اطراف کے لوگوں سے بڑی توقعات تھیں لیکن کام شروع کرنے کے بعد متوقع تعاون نہ ملنے سے بیش تر بوجھ انھیں اکیلے ہی اٹھانا پڑا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جو لوگ ان کے ساتھ کام کر رہے تھے وہ معمولی باتوں پر بہانہ بنا کر ان کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ اس دور کا سماج زوال پذیر تھا۔ لوگوں کے اخلاق اور کردار کمزور ہو چکے تھے۔ خود غرضی کا ماحول تھا۔ سوشل کاموں کی طرف لوگوں کا رجحان کم تھا اور حوصلہ اس سے بھی کم۔ سمجھانے بجھانے سے ساتھ لگتے اور موقع پاتے ہی اپنی اصل پر لوٹ جاتے تھے۔ اس لئے سماجی مفاد کے کسی بھی منصوبہ ساز شخص کو قدم قدم پر غیر ضروری مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار اسکول کمیٹی کی میٹنگ میں ایک رکن اپنی بات منوانے پر بہت زور دے رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کمیٹی ان کی بات نہیں مان رہی تو انھوں نے طیش میں آکر کہا کہ میں نے اسکول کو اتنی بڑی رقم دی ہے اور میری بات نہیں مانی جا رہی ہے۔ حافظ صاحب نے وہ رقم جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ بعد کے سالوں میں میں نے ایک لڑکے کو حافظ صاحب کے مکان میں رہتے دیکھا۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ لڑکا اسکول کمیٹی کے اسی رکن کا تھا جو اپنا روپیہ لے کر میٹنگ سے باہر چلا گیا تھا اور اسکول کی انتظامیہ سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ اس کی بیوہ کی حافظ صاحب سے اس درخواست پر کہ لڑکا گاؤں میں پڑھ نہیں پائے گا آپ اس کا انتظام کر دیں حافظ صاحب نے لڑکے کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی اور اسے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔

ایک بار اسکول کی عمارت میں کسی نے آگ لگا دی۔ میں نے خود دیکھا کہ جو لوگ آگ بجھانے میں دل وجان سے لگے

ہوئے تھے ان میں حافظ صاحب بھی تھے۔ بہر حال انھوں نے صبر کیا اور اسکول کی عمارت کی بحالی کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اسکول کے مستحکم ہونے کے بعد ایسا دور بھی آیا جب انھوں نے بد دل ہو کر کمیٹی کا پورا انتظام کمیٹی پر چھوڑ دیا۔ گویا ایک طرح اسکول انتظامیہ سے سبکدوش ہو گئے۔

آج مفید عام ایک انٹر کالج ہے۔ گلاؤٹھی اور اطراف کے تمام مسلمان خاندان بغیر کسی تفریق اور امتیاز کے اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کی تاسیس کو اڑسٹھ سال گزر چکے ہیں اور وہ آج بھی اسی 'رین بسیرا' میں ہے جسے حافظ صاحب نے اوّل دن سے اسکول کے سپرد کر دیا تھا البتہ اب اس کے پہلو میں ایک مسجد کا اضافہ ہو گیا ہے جس کا نام ''مسجدِ شفیع'' ہے اور جسے ان کے فرزند سید رضی الدین ہاشمی نے تعمیر کرایا ہے۔

زندگی کے آخری دور میں جو نسبتاً ضعیفی کا دور تھا اپنے خاندان کو متحد کرنے کے لئے حافظ صاحب پاکستان منتقل ہو گئے لیکن وہاں زیادہ دن حیات نہ رہ سکے۔ اپنے وطن سے، اپنے شہر سے، اپنے باغات سے، اپنے میدان عمل اور اپنے اسکول سے بہت دور کراچی کے شہر میں وہ روشن چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا لیکن جو چراغ انھوں نے اپنے وطن میں 'مفیدِ عام' کی شکل میں روشن کیا تھا وہ اب بھی روشن ہے اور اس کی روشنی گزشتہ کی طرح آئندہ نسلوں کے دل و دماغ کو بھی رہتی دنیا تک منور کرتی رہے گی۔

☆☆☆

سید محمد تنظیم واسطی

سید محمد تنظیم واسطی

رہبر و رہنما

سید رضی الدین ہاشمی

گلاؤٹھی کے جن فرزندان نے قصبہ، برادری اور ملک کا نام روشن کیا اور عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں برادر سید محمد تنظیم واسطی کا نام سرفہرست ہے۔ برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے بالخصوص اور افغان، کشمیر اور بوسنیا کے مسلمانوں کے لئے بالعموم ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ گزشتہ ۳۵ سال میں ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۹۸۳ء میں چند دن لندن میں ان کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا۔ ۱۹۸۴ء میں لندن، اور ۱۹۸۵ء میں کراچی میں۔ ۱۹۸۶ء سے ۲۰۱۴ء تک سعودی عرب میں نہ صرف متعدد ملاقاتیں ہوئیں بلکہ ان کے کارناموں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ سعودی عرب میں ان کے بیشتر سفرا ایجنسی افغان پریس کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے طور پر ہوئے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ اخباروں کے دفاتر اور اسلامی تحریکوں کی اہم شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ WAMY کے ڈائریکٹر جنرل اور سابق مجلس شوریٰ کے رکن ڈاکٹر ابونصیف ان کے بڑے مداح رہے ہیں۔ مشہور صحافی اور ان کے بہترین دوست محمد علی صاحب متعدد بار جدہ میں ان سے ملاقاتیں کرتے۔ اسی طرح ان کے گھر والوں اور دوستوں سے لے کر اعلیٰ سماجی شخصیات سے ان کے قریبی تعلقات کا مشاہدہ اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

تنظیم بھائی کی پیدائش جودھپور کی ہے جہاں ان کے والد جناب سید شمیم واسطی بغرض ملازمت قیام پذیر تھے۔ سید محمد شمیم واسطی ریاست جودھپور میں کمشنر کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ان کے دو بھائی سید نسیم واسطی اور سید قسیم واسطی نے بھی کراچی کو اپنا وطن بنایا۔ والدہ ماجدہ محترمہ رضیہ واسطی سید فخر الحسن واسطی کی صاحبزادی تھیں۔ حافظ سید فخر الحسن گلاؤٹھی قصبہ کی نامی گرامی سماجی اور سیاسی شخصیت تھے۔ قیام پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے انہوں نے قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ان کی والدہ نے نامساعد حالات میں جس طرح اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی وہ ہمت و جرأت کی اعلیٰ مثال ہے۔

تنظیم بھائی نے کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا اور ۱۹۶۴ء میں مستقل لندن میں بودوباش اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان اور پاکستان سے ہزاروں لوگ نئے مستقبل کی تلاش میں یوروپ کا سفر کر رہے تھے۔ برطانیہ کے مختلف شہروں چھوٹی چھوٹی سماجی تنظیمیں علاقائی طور پر سرگرم عمل تھیں۔ انہوں نے برطانیہ پہنچتے ہی U.K Islamic Mission نامی ادارے کی تاسیس اور تنظیم میں کلیدی رول کردار ادا کیا اور اس ادارہ کے پہلے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ بعد ازاں اس ادارہ کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر، نائب صدر، سینئر نائب صدر اور صدر کے عہدوں پر فائز رہے۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد میں برطانیہ میں اسلامی تعلیمات کی

بہتر فہم اور اسلامی عقائد کا علاقائی وقومی سطح پر منظّم طور پر فعال ترویج کرنا تھا۔اگلے ۴۰ سال میں اس ادارے نے جس طرح لندن، برمنگھم اور دیگر بڑے شہروں میں برطانوی مسلمانوں کی جس طرح خدمت کی اس کی مثال ملنی بہت مشکل ہے۔اس سفر میں پروفیسر خورشید اور دیگر اکابرین ان کی اعلی صلاحیتوں کے معترف رہے ہیں۔جناب تنظیم واسطی صاحب کی شخصیت پر مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔دلائل کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو، ٹھنڈا مزاج اور اپنے ناقدین کی غیر ضروری تکرار سے اجتناب، دھیما لہجہ اور علمی گفتگو، انفرادی طور پر بھی انکے سید مودودی صاحب سے تعلقات اور شناسائی رہی ہے اور وہ ان کو اپنا مرشد سمجھتے تھے۔

جناب تنظیم واسطی کا جہاد افغانستان اور مجاہدین سے بڑا خصوصی تعلق رہا ہے۔انہی کی ہاتھوں ایجنسی افغان پریس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۳ء تک وہ اس کے مینیجنگ ڈائریکٹر رہے۔اس پریس ایجنسی نے لندن سے جہاد افغانستان میں ایک بڑا اہم کردار ادا کیا اور اسے تمام اسلامی دنیا میں زبردست پذیرائی بھی ملی۔اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد اسلامی ممالک کے سفر کیئے اور اسلامی عالمی شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں۔غالبًا اسلامی لٹریچر کو روسی ریاستوں میں مہیا کرانا ایک ایسی کاوش تھی جس نے مجاہدوں کی کامیابیوں میں اہم کردار ادا کیا۔

سید تنظیم واسطی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ایم ایڈ (Muslim Aid Uk) کا قیام ہے۔اس فلاحی ادارہ کے وہ ٹرسٹی بھی ہیں اور وائس چیئرمین کے طور پر کام کیا ہے۔یہ ادارہ ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا اور اس کے اغراض ومقاصد میں اسلامی ممالک میں ایسے ترقیاتی پروجیکٹ پر کام شروع کرنا یا ان کی مالی اعانت کرنا ہے جو غریبی دور کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔اس اعانت میں غریب ترین اسلامی آبادیوں میں ایمرجنسی امداد بھی شامل ہے۔اس ادارے کے پلیٹ فارم سے دنیا کے ۴۰ ممالک میں ملٹی ملین پاؤنڈ کی امداد فراہم کی گئی ہے۔بہت سے اداروں کو سالانہ مستقل بنیاد پر بھی مدد کی جاتی ہے اور اب یہ ادارہ ایک بے حد اہم اور فعال تنظیم کے طور کام کر رہا ہے۔

ایک اور ادارہ جو مسلم کونسل آف برٹین (Muslim Counsil of Britain) کے نام سے مشہور ہے، سید محمد تنظیم واسطی اس کی انتظامی کمیٹی کے رکن ہیں اور انٹرنیشنل افیئرز کمیٹی کے سربراہ بھی ہیں۔وہ مسلم سالی ڈیرٹی کمیٹی (MSC) کے بھی سکریٹری جنرل ہیں۔یہ سب ادارے دنیا بھر میں اور بالخصوص برطانیہ میں مسلمانوں کی سیاسی اور مالی امداد میں مصروف عمل ہیں اور اپنا کردار انجام دے رہے ہیں۔

جناب تنظیم واسطی کا مسلم سالی ڈیرٹی کمیٹی (MSC) سے ایک خصوصی تعلق رہا۔یہ ادارہ ۱۹۷۵ء میں قائم ہوا اور اس کے اغراض ومقاصد میں مسلم تنظیموں کی طرف سے ایک مشترکہ لائحۂ عمل تجویز کیا گیا تاکہ برطانوی حکومت، میڈیا اور بین الاقوامی اداروں UN , NTO, OIC اور مسلم حکومتوں کو اپنا متفقہ نقطۂ نظر پیش کیا جاسکے۔واسطی صاحب ابتدا سے ہی اس ادارہ کے سکریٹری جنرل کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

سید محمد تنظیم واسطی ایک اور اہم ادارے اسلامک کونسل آف یورپ کے مجلس عاملہ کے بھی ابتدائی اراکین میں سے

ہیں اور اسلامی کانفرنسوں، سیمناروں اور نمائشوں کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں۔ یہ ادارہ برطانوی مسلمانوں کی نمائندگی میں بڑا فعال کردار ادا کرتا رہا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کے مسائل کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتا رہا ہے۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ آپ ادارہ کے مندوب کی حیثیت سے برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، پاکستان، ترکی اور ملیشیا میں شرکت کر چکے ہیں۔ نیز آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں میں اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کے سربراہان اور وزرائے خارجہ کے اجلاسوں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اہم قراردادوں کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان تمام سلسلوں میں آپ نے عالمی سطح کے زعماء جن میں کئی سربراہان مملکت بھی شامل ہیں ملاقاتیں کیں، بلکہ کئی سے مستقل رابطہ میں رہتے ہیں۔ ان شخصیات میں سعودی مجلس شوریٰ کے ابونصیف، WAMY کے سابق سکریٹری جنرل، بوسنیا کے وزیراعظم شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو تنظیم بھائی کے متعلق یہ کہنا کچھ غلط نہیں۔ یہ خاتون محترمہ مہر واسطی صاحبہ ہیں۔ بھابی صاحبہ نہایت سگھڑ، منظّم، وفاشعار، نیک اور دیندار ہیں۔ تنظیم بھائی کی خدمات کے اس سفر میں وہ قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلتی رہیں۔ اپنے تین بیٹوں سلمان، عدنان اور فرحان اور بیٹی فرح کی بہترین تعلیم و تربیت کی اور ان بچوں کو ایک اچھا مسلمان بنایا اور آج بھی اپنے عظیم شوہر کی خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اجر دے اور خوش و خرم رکھے۔ آمین

☆☆☆

ہمارے شہداء

تحریر و تحقیق: مولانا اصلح الحسینی

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں گلاؤٹھی کے سادات کو ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ قصبہ سے جنوب کی جانب تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر ریاست مالاگڑھ (ضلع بلندشہر) تھی جس کے حکمران نواب ولی داد خان تھے جنہوں نے جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے علمِ بغاوت بلند کیا۔ سادات گلاؤٹھی نے انکا بھرپور ساتھ دیا۔ نواب ولی داد خان کو سازشی عناصر نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ آزادی کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ نواب ولی دادخان بھاگ کر روپوش ہوگئے۔ شعلہ بغاوت جب سرد پڑا تو باغیوں کی گرفتاری اور دار و رسن کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سینکڑوں لوگوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ سادات گلاؤٹھی میں کئی لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے جنگ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا تھا جس کی پاداش میں ان کی تمام زمینداریاں اور جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئی تھیں۔

۱۔ سب سے پہلے شہید خاندان پلولیہ کے ایک بزرگ شہید سید سرفراز علی تھے۔

۲۔ دوسرے شہید رحمت اللہ صاحب تھے جن کو تسلط کے بعد پھانسی دے دی گئی تھی۔ آپ کی بنائی ہوئی مسجد "محل والی مسجد" کے نام سے آج بھی قصبہ کے مغرب میں واقع ہے۔ آپ کا خاندان سالاری خاندان کے نام سے مشہور ہے۔

۳۔ تیسرے شہید عنایت اللہ تھے جن کو ۱۸ سال کی کم عمری میں بلندشہر میں پھانسی دی گئی۔ عنایت اللہ شہید جناب غلام غوث کے صاحبزادے اور ڈپٹی فیض الحسن، سابق وزیر اعظم و منصف اعلیٰ ریاست بہاولپور کے چھوٹے بھائی اور مولانا ابوالحسن ناطقؔ گلاوٹھوی کے چچا تھے۔

۴۔ پاکستان کے قیام کے بعد سادات گلاؤٹھی کے بیشتر گھرانے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہوگئے۔ انہی میں سے ایک گھرانہ جناب سید محمود واسطی صاحب کا ہے۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے سید خالد واسطی ہمارے چوتھے شہید ہیں جنہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنی بہادری کا لوہا منوایا اور ستارہ جرأت حاصل کیا۔ ۲۷ فروری ۱۹۷۰ء کو اپنے وطن عزیز کی خدمت کرتے ہوئے ایک فضائی حادثہ کا شکار ہوئے اور شہید کا درجہ پایا۔ بعد از شہادت حکومت پاکستان نے آپ کی شاندار خدمات کے عوض ستارہ بسالت عطا کیا۔

☆☆☆

شہید خالد واسطی

شہید خالد واسطی

ستارہ جرأت اور تمغہ بسالت حاصل کرنے والا خاندان کا پہلا مجاہد

رضی الدین ہاشمی

شہادت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں کہ خدا کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں۔ (بخاری و مسلم) نیز ایک اور حدیث میں ہے ''جو شخص خدا کی راہ میں زخمی کیا جائے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون جاری ہوگا، اس کے خون کا رنگ تو خون جیسا ہوگا لیکن اس کی بو مشک کی سی ہوگی۔ (بخاری و مسلم) ایک اور جگہ ارشاد ہے ''شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی بخشا جاتا ہے۔ نزع کے وقت اسے جنت میں اس کی رہائش گاہ دکھائی جاتی ہے۔ اسے عذاب قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ وہ بڑی گھبراہٹ (عذاب دوزخ) سے مامون رہے گا۔ اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ارشاد خداوندی ہے وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں''

دین کی عظمت اور ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے اپنی سب سے زیادہ قیمتی متاع یعنی جان عزیز کا نذرانہ پیش کر دینا کتنی بڑی سعادت ہے، اس کا بھلا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ شہید اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے ہم سب کو عزت کے ساتھ جینا سکھاتا ہے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن اہلیان گلاؤٹھی اور ہم پاکستانیوں کے لیے بڑے فخر کا دن ہے۔ اس دن اس قصبہ کے ایک سپوت فلائٹ لیفٹیننٹ خالد حسن واسطی نے اعلیٰ پائے کی مہارت اور جرأت کے صلے میں ستارہ جرأت حاصل کیا۔ ۵ ستمبر کو ان کے اپنے ولیمہ کے دن انہیں محاذ پر طلب کیا گیا۔ ۱۰ ستمبر تک وہ محاذ جنگ پر دشمن کے چھکے چھڑانے میں مصروف رہے۔ چند روز کے اندر انہوں نے دشمن کو پسپا کرنے اور اسے پاک سرزمین سے مار بھگانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پانچ شبینہ حربی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ اپنے بعض مشنوں کے دوران انہیں دشوار پہاڑی علاقوں پر انتہائی ناموافق موسمی حالات میں پرواز سے سابقہ پڑا جبکہ باقی مشن سطح زمین سے تین سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انجام دینے پڑے۔ وہ پُرخطر مشنوں میں شرکت کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے اور انہیں انتہائی چابکدستی اور پختگی عزم کے ساتھ انجام دیا۔ اپنی حربی سرگرمیوں کے دوران انہوں نے ہمیشہ نہایت درجہ جوش و ولولے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ دوران جنگ بے پناہ جرأت اور فرض سے والہانہ وابستگی کی بناء پر انہیں ستارہ جرأت عطا کیا گیا۔

خالد واسطی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ساتھ

سید خالد حسن واسطی مرحوم ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء کو میر پور خاص میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کا تعلق تحریک خلافت اور تحریک پاکستان سے رہا ہے۔ آپ کے والد جناب سید محمود حسن واسطی صاحب تحریک پاکستان کے ان گمنام سپاہیوں میں سے ہیں جو ہمیشہ شہرت اور نام ونمود سے دور بھاگتے رہے۔ وہ جماعت اسلامی کے انتہائی مخلص اور محنتی کارکن رہے ہیں۔ مولانا ابوعلیٰ مودودی مرحوم ان سے ایک خاص تعلق برتتے تھے اور اہم معاملات میں ان کی رائے کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ محمود واسطی صاحب کے والد بزرگوار حافظ سید فخر الحسن اور چچا سید محمد صالح مرحوم مسلم لیگ اور تحریک خلافت کے پرجوش اور سرگرم کارکن رہے ہیں۔

خالد واسطی مرحوم نے ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈی جی کالج کراچی سے ۱۹۵۷ء میں انٹر سائنس پاس کیا۔ تعلیم کے دوران ہی صحافت سے متعلق ہوئے اور روزنامہ انقلاب میں کام کیا۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان سے بھی کچھ پروگرام کیے۔

۱۹۵۷ء میں ان کو پاک فضائیہ میں مستقل کمیشن مل گیا جہاں ان کے اصلی جوہر کھلے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ترقی کر کے اسکواڈرن لیڈر کے عہدہ تک پہنچ گئے۔

پاک فضائیہ کے اس بہادر افسر نے ادائیگی فرض کے دوران شہادت کا رتبہ پا کر حیات جاوداں حاصل کر لی۔ ۲۷ فروری ۱۹۷۰ء کو وہ ایک فضائی حادثہ کا شکار ہو گئے۔ چکلالہ کے فوجی قبرستان میں گیارہ ساتھیوں سمیت انہیں پورے فوجی اعزازات کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ شہادت کے بعد ان کے لیے تمغہ بسالت کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمغہ ان کی اکلوتی بیٹی ڈیڑھ سالہ عالیہ واسطی نے اسکواڈرن لیڈر کی وردی پہن کر وصول کیا۔

اسکواڈرن لیڈر سید خالد واسطی مرحوم کا شمار پاک فضائیہ میں بہترین صلاحیت رکھنے والے روشن مستقبل کے مالک افسران میں ہوتا تھا۔ فرض شناسی کی بہترین صلاحیت کے باعث انہیں اپنی رجمنٹ میں ہمیشہ ایک اثاثہ سمجھا گیا۔

محمود حسن واسطی کا بچپن کا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا کہ وہ تحریک خلافت میں جان کی بازی لگا دیں لیکن ان کی جان نے شہید کا درجہ پا کر ان کو سرخرو کر دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جان دیگر است

☆☆☆

ڈاکٹر رئیس احمد

(ماہر طبیعیات، ماہر تعلیم، چیئرمین یو۔جی۔سی)

سید منصور عاقل

آپ ڈپٹی کلکٹر سید عبدالواسع کے دوسرے بیٹے اور نامور ماہر طبیعیات تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فزکس میں ایم ایس سی کیا۔ ۱۹۴۶ء میں پرنسٹن یونیورسٹی اسکالرشپ کے لیے تمام ہندوستان کے ہندو مسلمان امیدواروں میں مقابلہ کے بعد منتخب ہونے کا اعزاز حاصل کیا، چنانچہ امریکہ گئے اور مشہور سائنس داں پروفیسر آئن اسٹائن کی زیر نگرانی جو پرنسٹن یونیورسٹی میں استاذ تھے، ماسٹرز کیا۔ بعد میں انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فزکس کے ریڈر رہے پھر چیئرمین فزکس ڈیپارٹمنٹ ہوئے اور آخر میں فیکلٹی آف سائنس کے ڈین بن گئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک ڈائریکٹر این سی ای آر ٹی رہے۔ سرینگر انجینئرنگ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے آپ کو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر آف ایجوکیشن بنا کر ماریشس بھیجا گیا۔ آپ ہندوستان کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین بھی رہے۔ آپ کو ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا۔ آپ کی شاندار علمی خدمات کے پیش نظر حکومت ہندوستان نے آپ کو ''پدم بھوشن'' کے اعزاز سے نوازا۔ انتہائی مہمان نواز تھے، دسترخوان وسیع تھا اور ہر دل عزیز تھے۔ آپ نے مارچ ۱۹۹۰ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا اور وہیں اپنے والد اور والدہ کے ساتھ مدفون ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید نفیس احمد

پروفیسر ڈاکٹر سید نفیس احمد (مرحوم) تمغۂ امتیاز

(اسکالر، ماہر تعلیم، مصنف، جغرافیہ داں)

نسیم الدین ہاشمی

پروفیسر ڈاکٹر نفیس احمد کا شمار بستی کے ان عظیم لوگوں میں ہوتا ہے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ آپ ۱۹۱۱ء میں گلاؤٹھی کے سادات کے معروف تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے اور بحیثیت جغرافیہ دان عالمی شہرت حاصل کی۔ آپ کے والد ڈپٹی کلکٹر سید عبدالواسع قصبہ کے انتہائی باعزت لوگوں میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم پر خصوصی توجہ مرکوز کی اور تربیت بھی اس نہج پر کی کہ وہ نہ صرف گھرانے کے لئے بلکہ پوری برادری کے لئے قابلِ فخر ثابت ہوئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی جہاں وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک مقیم رہے۔ بی اے (آنرس) جغرافیہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پھر اسی ادارے سے ۱۹۳۵ء میں جغرافیہ میں فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن میں ماسٹرز کیا۔ مزید تعلیم لندن اسکول آف اکنومکس اینڈ پولیٹیکل سائنس میں حاصل کی۔

ملازمت کا آغاز ماسٹرز کے فوراً بعد مسلم یونیورسٹی میں ہی بحیثیت لیکچرار شروع کر دیا اور پانچ سال تک اسی ادارے سے منسلک رہے ۱۹۴۰ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ میں جغرافیہ کے استاد مقرر ہوئے اور اسی دوران کلکتہ یونیورسٹی میں پارٹ ٹائم لیکچرار مقرر ہوئے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں آپ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) تشریف لے آئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں جغرافیہ ڈپارٹمنٹ کی بنیاد رکھی اور بطور ریڈر کام شروع کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں آپ کی خدمات کو سراہا گیا اور آپ بحیثیت پروفیسر جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں آپ کو سائنس فیکلٹی کا ڈین بنایا گیا اور ۱۹۶۶ء تک آپ اسی عہدہ پر فائز رہے، غیر ملکی طلبہ کے ایڈوائزر کے طور پر آپ کی خدمات ساتھ ساتھ جاری رہیں اور جس کو خصوصی طور پر یونیورسٹی انتظامیہ سراہتی رہی۔

۱۹۶۶ء میں یو ایس نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے آپ کو سینئر وزیٹنگ سائنٹسٹ تعینات کیا جو بہت بڑا اعزاز تھا (۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء تک)۔ تعلیمی میدان میں آپ کی شاندار خدمات کے عوض ۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے آپ کو تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک آپ نے بحیثیت ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ ارتھ سائنسز (ارضیات) اسلام آباد یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔

آپ کی شادی محترمہ اختر جہاں احمد سے دورانِ ملازمت بنگال ہوئی۔ آپ خان بہادر امین الاسلام (مرحوم) کی

صاحبزادی تھیں جو ۱۹۲۲ء میں پہلے انسپکٹر جنرل بنگال مقرر ہوئے تھے۔ آپ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، بڑے صاحبزادے ندیم احمد نے بوسٹن یونیورسٹی امریکہ میں تعلیم حاصل کی اور ٹوکیو جاپان میں مشہور ملٹی نیشنل کمپنی (Schumergu) میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ آپ کے دوسرے صاحبزادے نوید احمد ہیں جنہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ساؤتھ کیرولینا سے ایم بی اے کیا۔ آپ کی صاحبزادی زلفیہ احمد معروف بینکر ہیں، آپ BCCI واشنگٹن سے بھی منسلک رہیں۔

۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد آپ اپنے خاندان کے ساتھ امریکہ منتقل ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں آپ ایک بار پھر ڈھاکہ واپس آ گئے اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جغرافیہ کے استاذ اور ماہر کی حیثیت سے آپ نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایڈوائزری خدمات جاری رکھیں اور اسی دوران آپ ہی کی کوششوں سے ''نیشنل جیوگرافک انسٹی ٹیوٹ آف بنگلہ دیش'' کا قیام عمل میں آیا۔ اپنے انتقال تک آپ اسی ادارے سے منسلک رہے۔

۳۱ مئی ۱۹۸۲ء کو ۷۱ سال کی عمر میں یہ علم کا آفتاب و ماہتاب غروب ہو گیا۔ جغرافیہ کے میدان میں آپ کی خدمات کا سلسلہ بے حد وسیع ہے جس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس میدان میں اگر آپ کی خدمات کا مختصر خاکہ بنایا جائے تو اسکی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

اعلیٰ اداروں کی رکنیت اور اعزازات:

☆ فیلو آف رائل جیوگرافیکل سوسائٹی لندن (۱۹۵۰ء سے)

☆ فیلو آف امریکن جیوگرافیکل سوسائٹی آف نیویارک (۱۹۵۳ء سے)

☆ نائب صدر پاکستان جیوگرافیکل ایسوسی ایشن لاہور (۱۹۵۰ء سے)

☆ فیلو آف کالج آف ایگریکلچر۔ کورنیل یونیورسٹی نیویارک (۱۹۶۰ء سے)

☆ صدر مشرقی پاکستان جیوگرافیکل سوسائٹی (۱۹۵۶ء سے)

☆ جولائی ۱۹۶۴ء میں بین الاقوامی جیوگرافیکل یونین کے ممبر منتخب ہوئے

☆ ۱۹۶۸ء میں ایفرو ایشین جیوگرافرس ایسوسی ایشن نئی دہلی کے ایگزیکٹیو ممبر منتخب ہوئے

حکومتی اداروں میں آپ کا رول:

☆ ممبر باؤنڈری کمیشن آف پاکستان

☆ ممبر نیشنل کمیٹی آف جیوڈسی اینڈ جیوفزکس آف پاکستان

☆ جوائنٹ ڈائریکٹر نیشنل اٹلس بورڈ حکومت پاکستان (۱۹۵۲ء میں تشکیل دیا گیا)

☆ ایڈوائزر گز ٹیری رائٹنگ کمیٹی گورنمنٹ آف ایسٹ پاکستان

☆ چیف ایڈوائزر اورینٹل جیوگرافر (ایک جرنل جو پوری دنیا سے ۱۹۵۷ء سے شائع ہو رہا ہے)

☆ ممبر بورڈ آف گورنر انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ ڈھاکہ (۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء)

☆ ایکٹنگ لائبریرین ڈھاکہ یونیورسٹی (۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء)

تصنیف/ریسرچ اور کتابیں:

☆ اکنامک جیوگرافی آف ایسٹ پاکستان (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۸ء)

☆ آکسفورڈ اسکول اٹلس برائے پاکستان (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۸ء)

☆ مسلمانوں کا جغرافیہ میں کنٹری بیوشن (لاہور ۱۹۴۷ء)

☆ پاکستان کی بنیاد (کلکتہ ۱۹۴۷ء)

☆ اکنامک ری سروسز آف یونین آف برما (۱۹۷۱ء)

☆ نیو اکنامک جیوگرافی آف بنگلہ دیش (وکاس، نئی دہلی ۱۹۷۶ء)

☆☆☆

ڈاکٹرظفرزیدی

ڈاکٹرظفرزیدی (مرحوم)

(پاکستان کے مایہ نازفرزند، سائنسدان، شیخ الجامعہ)

نسیم الدین ہاشمی

۷جنوری ۲۰۰۱ء اتوار کی صبح بھولے نہیں بھولتا جب ڈاکٹر ظفر حسنین زیدی، علم کا چراغ، عظیم سائنسدان، کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے عظیم فرزند اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔(اناللہ وانا الیہ راجعون) اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کے درجات بلند فرمائے۔(آمین)۔

آج ۱۳سال بعد بھی ظفر بھائی کو مرحوم کہتے ہوئے دلی تکلیف ہوتی ہے۔آپ کا مسکراتا ہوا پُر خلوص چہرہ سامنے آجاتا ہے لیکن موت برحق ہے، اس سے انکار کیسے ممکن ہے۔ بالآخر ہم سب کو وہیں جانا ہے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں اور اپنی شاندار شخصیت کی وجہ سے طویل عرصہ تک یاد رکھے جاتے ہیں، یقیناً ظفر بھائی ایسے ہی ایک شخص تھے۔

ظفر بھائی (مرحوم) سے گو ہماری رشتہ داری بھی تھی مگر میرا اُن سے زیادہ تعلق ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے توسط سے رہا۔ غالباً ۱۹۸۶ء مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں اور بھائی مبشر واسطی کشمیر روڈ پر واقع آپ کے مکان پر ملنے گئے اور ادارہ کا رکن بننے کی دعوت دی۔آپ غالباً پہلے شخص تھے جن کو قائل کرنے میں ہمیں خاصا وقت لگا، کئی نشستیں ہوئیں، ادارہ کا آئین مانگا گیا، اغراض ومقاصد پوچھے گئے، طویل بحثیں ہوئیں۔آپ کی دی ہوئی تجاویز شامل کرنے کا بالآخر وعدہ کیا گیا پھر کہیں جا کر شرکت ممکن ہوئی۔ظفر بھائی کا یہ خاصہ تھا کہ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے خوب جانچتے اور پرکھتے اور پھر دل وجان سے لگ جاتے اور یہی ہوا۔ ادارے میں آپ کی شمولیت کیا ہوئی کہ ادارہ کی قسمت بدل گئی۔ادارے کی تاریخ میں دو شخصیات ایک عثمان غنی راشد اور دوسرے ڈاکٹر ظفر زیدی (مرحومین) کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ادارے کو ترقی کی راہ میں گامزن کرنے اور مالی اعتبار سے مضبوط کرنے میں آپ دونوں حضرات کا کلیدی کردار تھا۔میں نے بحیثیت ایک ٹیم ممبر آپ دونوں کے ساتھ کوئی ۸سال کام کیا، بہت کچھ سیکھا، کاش ظفر بھائی اور عثمان بھائی آج زندہ ہوتے اور کاش میں ان سے کہہ سکتا کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے پر فخر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے احساسات آپ تک نہیں پہنچیں گے لیکن آپ کے لئے مغفرت کی دعا میں بہر حال کرتا رہوں گا۔

ڈاکٹرظفر زیدی ۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو بلندشہر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ۸سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور حیدرآباد کو مسکن بنایا۔آپ کے خاندان کا تعلق سیٹھہ ضلع بلندشہر (یوپی) سے ہے۔آپ کے والد کا اسمِ گرامی سید تہور علی زیدی اور والدہ کا نام مبارک النساء تھا۔ والد محترم ۱۹۱۱ء میں سیٹھہ میں پیدا ہوئے۔طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سند یافتہ تھے، بلندشہر میں مطب چلاتے تھے۔آپ کے دادا حکیم سید انوار الحق بھی اپنے وقت کے نامور طبیب تھے۔آپ کے والد نے ۲ شادیاں

کیں۔زوجۂ اول سے ظفر زیدی اور تین بیٹیاں نسیم، پروین اور مہ جبین ہیں (پروین صاحبہ کا ۱۹۹۸ء میں انتقال ہو چکا ہے)۔زوجۂ دوئم سے ۲ بیٹے آفتاب عالم اور فخر عالم بقید حیات ہیں۔

ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۲ مئی ۱۹۷۲ء کو ڈاکٹر شاہدہ سے شادی سے ہوا۔آپ کی تین بیٹیاں ہیں، صائمہ زیدی، سعدیہ زیدی اور سمیہ زیدی۔صائمہ زیدی نے نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے گریجویشن اور امریکہ سے Communication Design میں Ms کیا، وہ آج کل حبیب یونیورسٹی کراچی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔دوسری بیٹی سعدیہ زیدی نے انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنس سے B,es کیا ہے۔تیسری بیٹی سمیہ زیدی نے لاہور یونیورسٹی آف مینیجمنٹ سائنسز (LUMS) سے گریجویشن کیا اور لندن (یوکے) سے گورنینس میں ماسٹرز کیا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔۱۹۶۱ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے کیمسٹری میں B,sc Hons اور پھر اسی ادارے سے ۱۹۶۳ء میں M,se کیا۔ماسٹرز کرنے کے بعد آپ نے اسی ادارہ میں ۲ سال تک تدریس کے فرائض انجام دیئے اور پھر ۱۹۶۵ء میں مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے اور وہاں Leeds یونیورسٹی سے D,se اور پھر ۱۹۶۸ء میں اسی Leeds یونیورسٹی سے پروٹین کیمسٹری میں Ph,D کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۹ء میں پاکستان کے نامور سائنسداں پروفیسر سلیم الزماں صدیقی کے قائم کردہ سائنسی تحقیقی ادارہ PCSIR سے منسلک ہوئے اور ۱۹۷۳ء تک بطور سائنسداں و محقق خدمات انجام دیں۔ادارہ میں آپ کا بنیادی کام فارمولے وضع کرنا، سائنسی اور صنعتی منصوبوں پر تحقیق کو آخری شکل دینا۔پی ایچ ڈی اور ایم فِل کے طلبا اور طالبات کے کاموں کی نگرانی کرنا شامل تھا۔آپ کے شاگردوں کی طویل فہرست ہے۔سائنسی اور صنعتی منصوبوں پر آپ کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔۱۹۷۸ء میں آپ جامعہ کراچی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنے، بعدازاں ترقی پاکر ۱۹۸۲ء میں پروفیسر بنے۔

تحقیقی وتدریسی تصانیف (Research Publication):

پروٹین کیمسٹری کے شعبہ میں ڈاکٹر صاحب پاکستان کے صفِ اول کے سائنس دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔آپ نے جامعہ کراچی میں ۱۹۶۹ء میں کیمیاوی تجربات کے لئے لیبارٹریز قائم کیں۔Structural & Globular پروٹین آپ کی خصوصی دلچسپی کا شعبہ تھا جس میں آپ کی تحقیقات کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا۔بین الاقوامی شہرت کی سائنسی کتب میں جابجا آپ کی تحریروں کے اقتباسات ملتے ہیں، قومی، بین الاقوامی تحقیقاتی اداروں کے فنڈز سے چلنے والے متعدد تحقیقاتی منصوبوں میں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت Principal Investigator کی ہے۔ان اداروں میں Bethesda (امریکہ) کا صحت عامہ کا قومی ادارہ National Institue of Health بھی شامل ہے۔آپ نے Ph,D کرنے والے ۱۸ اور ایم فِل کرنے والے ۶ طلبا وطالبات کے تحقیقاتی کام کی نگرانی کی۔آپ تہران یونیورسٹی (ایران) اور لیما پرو (جنوبی امریکہ) کی سین مارکوس یونیورسٹی کے Ph,D پروگراموں کے لئے Research Co-Supervisor تھے اور پاکستان میں آپ نے Protein Structure Function Relationship پر ۶ بین الاقوامی کانفرسیں منعقد کرائیں۔آپ کی ۱۰ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔بین الاقوامی شہرت کی سائنسی کتابوں میں آپ کے ۱۸ ابواب شامل ہیں۔دنیا کے مختلف ممالک میں سائنسی تحقیقاتی

رسائل میں آپ کے ۱۰۸ تحقیقی مقالے مختلف زبانوں میں شائع ہوئے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننا:

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ بہترین استاذ، ماہر تعلیم اور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں آپ کی صلاحیتیں مسلمہ تھیں۔ انہی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے آپ کو ۲۵ جولائی ۱۹۹۷ء میں جامعہ کراچی کا وائس چانسلر مقرر کیا۔

جامعہ کے معاملات ایک طویل عرصہ سے پیچیدہ رہے ہیں۔ مسائل سے گھرے ہوئے اس ادارے میں آپ کی تقرری کسی چیلنج سے کم نہ تھی۔ کسی بھی شخص کے لئے ان مسائل سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ بحیثیت شیخ الجامعہ آپ کا دورانیہ صرف ساڑھے تین سال پر محیط ہے۔ اس دوران آپ نے اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کو اس مختصر سے مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس دور کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ جامعہ کے مالی مسائل کے حل میں خصوصی دلچسپی لی۔ فنڈ ریزنگ میں اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائے اور سعودی عرب اور دوسرے ممالک کے دورے کیئے۔

۲۔ جامعہ کے تمام تدریسی شعبوں، تحقیقی مراکز اور لائبریریوں میں ۱۵۰ کمپیوٹرز کی تنصیب کرائی اور انٹرنیٹ سے منسلک کیا۔ جامعہ کی تاریخ میں یہ ایک انقلاب تھا جو آپ کے دور میں ممکن ہوا۔

۳۔ اکاؤنٹس سسٹم و امتحاناتی کام کو کمپیوٹرائزڈ کرایا۔

۴۔ ٹرانسپورٹ کے مسائل حل کیئے۔

۵۔ جامعہ میں امن وامان کی صورتحال بہتر بنائی۔

۶۔ حکومت چین کے تعاون سے جامعہ کراچی میں لینگویج لیبارٹری کے قیام کے لئے فضا سازگار بنائی۔

۷۔ آئی بی اے و اسپیشل ایجوکیشن، فزیکل ہیلتھ اینڈ سائنس آڈیو ویژول جنیات، کمپیوٹر سائنس کے شعبہ میں بہتری پیدا کی۔

۸۔ طلبا میں بھائی چارے کے ماحول کو فروغ دیا۔

۹۔ جامعہ میں تحقیقی کام کی ہمت افزائی کی۔

جامعہ کی ترقی کے لئے آپ نے حقیقتاً رات دن ایک کردیا۔ ہردم یہی کوشش رہتی کہ جامعات کے معاملات کو کس طرح بہتر سے بہتر کیا جائے آپ کے دور میں جامعہ میں انتہائی تیز رفتاری سے کام ہوئے جن کو لوگ برسوں یاد رکھیں گے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کا دور ایک یادگار دور تھا۔

ممبرشپ (Membership)

۱۔ صدر پاکستان کیمیکل سوسائٹی

۲۔ صدر روٹری کلب آف کراچی کوسموپولیٹن

۳۔فیلو۔تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز TWAS اٹلی

۴۔ممبر۔فیلوشپ ایوارڈ کمیٹی TWAS اٹلی

۵۔فیلو۔پاکستان اکیڈمی آف سائنسز

۶۔بایوکیمیکل سوسائٹی۔انگلینڈ

۷۔بانی فیلو۔سوسائٹی برائے ترقی سائنس وٹیکنالوجی پاکستان

۸۔فیلو۔پروٹین سوسائٹی آف امریکہ

۹۔ممبر۔تعلیمی کمیٹی برائے علم حیاتیات، ذراتی حیاتیات

۱۰۔ممبر ایگزیکٹیو بورڈ۔اردو سائنس کالج (نامزد ممبر وزارت تعلیم)

۱۱۔ممبر اکیڈمک کونسل۔ہمدرد یونیورسٹی

انعامات،ایوارڈز

۱۔تمغۂ امتیاز سائنس سِول ایوارڈ	حکومت پاکستان	۱۹۸۹ء
۲۔ستارۂ امتیاز (قیمتی سائنسی تحقیقات)	حکومت پاکستان	۱۹۹۸ء
۳۔حیاتیاتی علوم کا پہلا انعام	وزارت تعلیم حکومت پاکستان	۱۹۸۸ء
۴۔سائنسی کتب کے مصنفین کا پہلا انعام	وزارت تعلیم حکومت پاکستان	۱۹۹۴ء/، ۱۹۸۸ء
۵۔روٹرین ایوارڈ	پاکستان	۱۹۹۶ء، ۱۹۹۵ء، ۱۹۸۹ء
۶۔خوارزمی پرائز انٹرنیشنل سائنس ایوارڈ	حکومت ایران	۱۹۹۲ء
۷۔پلاٹینیم جوبلی ایوارڈ گورنمنٹ کالج حیدرآباد	پاکستان	۱۹۹۵ء

جزوقتی پروفیسر (Visiting Professor)

۱۔سین مارکوس یونیورسٹی لیما (پیرو) جنوبی امریکہ	۱۹۹۵ء۱۹۹۴ء
۲۔تہران یونیورسٹی (ایران)	۱۹۹۰ء
۳۔تربیت مدرسین یونیورسٹی تہران (ایران)	۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء
۴۔توبنگن یونیورسٹی (جرمنی)	۱۹۸۱ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء
۵۔مارٹن سرائیڈ۔پلانگ انسٹی ٹیوٹ برائے بایوکیمسٹری	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۱ء
۶۔تجزیاتی کیمسٹری۔سندھ یونیورسٹی	۱۹۸۶ء، ۱۹۸۱ء
۷۔کیمسٹری ڈپارٹمنٹ بلوچستان یونیورسٹی آف کوئٹہ	۱۹۸۳ء، ۱۹۸۱ء

☆☆☆

ایک عالی دماغ کی موت

سید ضیاءالدین جامعی

انسانی زندگی سے زیادہ ناپائیدار کوئی شے نہیں، یہ ایک بلبلہ ہے جو نہ جانے کب پھوٹ جائے۔زندگی فانی ہے، اس فانی اور غیر یقینی زندگی کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔کبھی ہوس اقتدار میں مست ہوکر انسانوں کو مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی ہوس دولت میں مبتلا ہوکر بنی نوعِ انسان کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیتا ہے۔اگر بے ایمانی کرتا ہے تو ابلیس بھی اس سے پناہ مانگتا ہے اور اگر ایمانداری دکھاتا ہے تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

جب مرتا ہے تو صرف یادیں چھوڑ جاتا ہے۔یادیں انسان کا سرمایہ ہیں جو ساری عمر میں کماتا ہے۔ یہ سرمایہ اگر ایمانداری، انسان دوستی، خوش اخلاقی اور محبت پر مبنی ہو تو وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔انہی خوبیوں کو لئے ہوئے شیخ الجامعہ محترم ڈاکٹر ظفر حسنین زیدی ہم سے جدا ہوگئے، ہم انکی یادوں کو اٹھتے بیٹھتے یاد کرتے رہیں گے۔ڈاکٹر صاحب انتہائی سادہ، نرم گفتار، خوش اخلاق، متین، نہایت محنتی، عالی دماغ، مدبر، محقق اور ملک کے عظیم سائنسدان ہونے کے ساتھ ایک کامیاب استاذ اور ایک بہترین منتظم تھے۔

ڈاکٹر ظفر زیدی ۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو بلند شہر (یوپی) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہی ہوئی، ۱۹۶۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے کیمسٹری میں B.Sc(Hon) کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اسی یونیورسٹی سے M.Sc کیا۔اعلیٰ تعلیم آپ نے انگلینڈ کی Leeds یونیورسٹی سے حاصل کی۔ جہاں سے آپ نے D.Sc اور Ph.D کی ڈگری لی۔

اپنی عملی زندگی کا آغاز آپ نے گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے کیا ۶۵۔۱۹۶۳ء تک یہاں پڑھایا۔ ۷۳۔۱۹۶۹ء تک پی سی ایس آئی آر میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۹ء میں آپ نے کیمیکل سوسائٹی آف پاکستان کے جرنل کی بھی ادارت سنبھالی اور پروٹین کیمسٹری کے موضوع پر سات بین الاقوامی سیمینار بھی منعقد کئے۔آپ نے ۲۵ جولائی ۱۹۹۷ء کو شیخ الجامعہ کا چارج سنبھالا اور تادم آخر شیخ الجامعہ رہے۔اس مختصر مدت میں آپ نے جامعہ کراچی کی جو خدمت کی وہ کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی۔خاص طور پر جامعہ کراچی کے "سید نا برہان الدین انسٹی ٹیوٹ آف جنیٹکس، عمر پاشا انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنس، ڈاکٹر اے کیو خان انسٹی ٹیوٹ آف بائیوٹیکنالوجی، پنجوانی انسٹی ٹیوٹ آف مالیکولر میڈیسن اینڈ ڈرگ ڈیولپمینٹ، فیروز انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شادی ۱۲ مئی ۱۹۷۲ء کو ڈاکٹر شاہدہ سے ہوئی۔آپ کی تین بیٹیاں ہیں۔

آپ نے اپنی زندگی میں اتنے انعامات اور اعزازات حاصل کئے ہیں کہ اس کی تفصیل لکھنی شروع کی جائے تو کئی

صفحات درکار ہوں گے، آپ کی زندگی اور کارناموں پر اتنا کچھ لکھا جارہا ہے کہ آپ کے کارناموں کے نئے باب کھل رہے ہیں۔ ۶۰ سال ۱۰ ماہ کامیاب زندگی گزارنے والی شخصیت جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں آخر کار ۴ جنوری بروز جمعرات اپنے خالقِ حقیقی سے جاملی۔(اناللہ وانا الیہ راجعون) ایسی شخصیات مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالی آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ (آمین) آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا اصلح الحسینی نے پڑھائی۔ آپ کے انتقال سے تعلیمی میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ تو شاید مستقبل قریب میں یا آنے والے دور میں پورا ہو جائے مگر ہمارے ادارے اخوان السادات کے لئے جو نقصان عظیم ہوا ہے، وہ مدتوں پورا نہ ہو سکے گا۔ آپ کی برادری کے لئے خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

میرا خیال ہے کہ زیادہ مناسب ہوگا کہ میں ڈاکٹر صاحب کے بارے خود لکھنے کے بجائے مختلف شخصیات کے پیغامات یا تقریروں سے اقتباس اس کتاب کے لئے پیش کروں۔

آپ کی وفات پر آپ کی عظیم خدمات کو سراہتے ہوئے صدرِ پاکستان جناب رفیق تارڑ اور چیف ایگزیکیٹو جنرل پرویز مشرف نے آپ کی وفات کو ملک کا عظیم نقصان قرار دیا اور انکی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تعزیت کا اظہار کیا جبکہ صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ بذات خود انکی بیگم ڈاکٹر شاہدہ زیدی سے تعزیت کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔

گورنر سندھ محمد میاں سومرو، صوبائی وزیر صحت جنرل (ر) احسان احمد، وزیر مذہبی امور مولانا ولی رازی، خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران، کراچی کے ڈائریکٹر جنرل محمد رضا، انجمن ترقی اردو کے صدر آفتاب احمد خان، معتمد جمیل الدین عالی اور سرسید یونیورسٹی کے چانسلر ظل احمد نظامی نے اپنے الگ الگ پیغامات میں ڈاکٹر صاحب کی اچانک وفات کو قومی سانحہ قرار دیا اور کہا ہے کہ انکی بے مثال خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔

بقائی میڈیکل یونیورسٹی کی انتظامیہ اور بقائی فاؤنڈیشن کے اراکین، گورننگ باڈی کا غیر رسمی ہنگامی اجلاس زیر صدارت فریدالدین بقائی ہوا جس میں پروفیسر ڈاکٹر ظفر زیدی شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی کے سانحۂ ارتحال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انکی موت کو علم وتہذیب کا ستون گرنے کے مترادف قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب تعلیمی اداروں کے لئے شجر سایہ دار تھے۔

ڈاکٹر مسعود طاہر اپنے کالم میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ظفر زیدی نے میرٹ کی بنیاد پر اساتذہ کو ذمہ داریاں تفویض کی تھیں اور بیشتر وقت یونیورسٹی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے۔ انکے دور میں یونیورسٹی میں کئی نئے شعبے کھلے ، کئی انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں بننی شروع ہوئیں۔ کیمپس کو خوبصورت اور صاف ستھرا رکھنے کا انتظام ہوا، بجلی کے بحران کے خاتمے کے لئے اہم اقدام کیا گیا۔ وہ یونیورسٹی کے لئے باہر سے امدادی رقم لے کر آئے۔ اساتذہ میں تدریس وتحقیق کا زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کرنے کے لئے ''بہترین استاذ'' کے سالانہ ایوارڈ کا اجراء کیا گیا۔ وہ یونیورسٹی کا قیمتی اثاثہ تھے، زندگی انہیں مہلت دیتی تو وہ یونیورسٹی کی اور زیادہ خدمت کرتے۔ ڈاکٹر زیدی مرحوم کی نظر بحیثیت مجموعی یونیورسٹی کے تمام معاملات اور شعبوں پر رہتی تھی جسکی ایک مثال خود ہمارے شعبے یعنی ابلاغ عامہ کی ہے، اس شعبے کی کوششوں سے نواز شریف نے اپنے پہلے دورِ وزارتِ عظمی میں شعبے کو ایک کروڑ روپئے دینے کا اعلان کیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس رقم سے شعبے کی نئی عمارت تعمیر ہوگی اور اسے ایک انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا

جائے گا لیکن اس دور کے وائس چانسلر نے اس رقم کو دوسری مدات میں خرچ کرڈالا اور عمارت کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر ظفر زیدی وائس چانسلر بنے تو انہوں نے اس معاملے پر خصوصی توجہ دی، فنانسر ڈھونڈا اور عمارت کی تعمیر شروع کروائی جس کا بنفس نفیس خود جائزہ لیتے رہے اور اب جبکہ عمارت کی تعمیر آخری مراحل میں ہے ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے کئے ہوئے کام، انکے نام اور انکی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ موت برحق ہے، ہر آنے والے کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہے لیکن جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اپنے کاموں کے حوالے سے یاد رکھے جائیں گے اور ڈاکٹر زیدی مرحوم کا نام اور کام یقیناً ایسا ہے کہ برسوں تک زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے سوئم کے موقعہ پر جامعہ کراچی میں قرآن خوانی اور تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں تدریسی، غیر تدریسی اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تعزیتی اجلاس سے خطاب کے دوران بیشتر مقررین نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو عظیم انسان سائنسدان، محقق اور سماجی کارکن قرار دیا اور انکی اچانک موت پر دلی دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ارتفاق علی نے انہیں اپنا نہایت قابل اعتماد ساتھی قرار دیا۔ جامعہ کراچی کے سینئر پروفیسر قائم مقام وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی نے کہا کہ ہم اس بات پر حیران تھے کہ وہ جن بڑے منصوبوں کی نشاندہی کرتے تھے، وہ ہمارے نقطۂ نظر سے ناقابل عمل ہوتے لیکن وہ عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ سابق پرووائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی ایک مشن تھی جس میں اللہ تعالی نے انہیں کامیابی دی۔ وہ بہترین انسان، اعلی پائے کے سائنسدان اور سماجی کارکن تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کا ایک جدید ترین عملی تصور پیش کیا۔ نئے اور جدید موضوعات متعارف کرائے۔

پرویز صدیقی نے کہا کہ ظفر زیدی نے جامعہ کراچی کے لئے جان دے دی لیکن ہم نے انہیں سوائے ٹینشن کے کچھ نہیں دیا۔ ڈاکٹر شکیل فاروقی نے کہا کہ وہ ملک کے عظیم سائنسدان تھے۔ نیچرل پروڈکٹ میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ انہوں نے ملک میں سب سے پہلے کمپیوٹر لیب قائم کی۔ ڈاکٹر وقارالدین نے کہا پاکستان سائنس اکیڈمی نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں نائب صدر مقرر کیا۔

آپ کے انتقال پر تمام سیاسی، سماجی، اصلاحی، تعلیمی اور طلبہ تنظیموں کے علاوہ چاروں صوبوں کے حکام نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

کلمات تعزیت وعقیدت

ہم سب ہی کو موت سے ہم آغوش ہونا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جاملنا ہے مگر کم ہیں ایسے لوگ جن کے دنیا سے اٹھ جانے کو لوگ اتنا عظیم نقصان تصور کریں اور اتنا زیادہ سوگ منائیں۔ ڈاکٹر سید ظفر زیدی یقیناً ان ہی عظیم ہستیوں میں سے تھے جنکی موت کو اہل علم و دانش نے اتنا ہی بڑا نقصان قرار دیا اور اتنا ہی زیادہ سوگ منایا۔ صدر مملکت وچیف ایگزیکٹیو، وفاقی وصوبائی وزراء، ملکی جامعات وکالجز، تعلیمی اداروں کے اساتذہ، طلباء وطالبات، شعراء، ادباء، دانشور حضرات وسیاستداں سب ہی نے انکی موت کو

عظیم ملکی سانحہ اور علم و دانش کا عظیم نقصان قرار دیا۔

وزیر داخلہ لیفٹننٹ جنرل (ر) جناب معین الدین حیدر اور سابق گورنر جناب عظیم داؤد پوتا PECHS میں مسجد نور سے متصل میدان انکی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ موجودہ گورنر سندھ محمد میاں سومرو سوئم کی قرآن خوانی میں شرکت کے بعد اظہار افسوس کررہے تھے کہ وہ اندرون سندھ اہم سرکاری دورہ پر ہونے کے باعث ڈاکٹر صاحب کی تدفین میں شریک نہ ہوسکے۔ ڈائریکٹر جنرل رینجرز جنرل عبدالقادر بلوچ، متحدہ قومی موومنٹ کے آفتاب شیخ اور خالد بن ولید، جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر پروفیسر غفور احمد، جمعیت علمائے پاکستان کے محمد صدیقی راٹھور، سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر ڈاکٹر ارتفاق علی اور ڈاکٹر عبدالوہاب ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر منظور احمد، این ای ڈی یونیورسٹی کے وائس چانسلر انجینئر ابوالکلام، ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر عاصم حسین، قائداعظم اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر شریف المجاہد، آئی بی اے کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جاوید اشرف، ایرانی قونصل جنرل آقائے بختیاری، خانہ فرہنگ کے ڈائریکٹر جناب زین علی، ایران ایئر کے جنرل منیجر آقائے غلام پور، آئی جی سندھ جناب آفتاب نبی، سندھ انسٹی ٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلانٹیشن کے ڈائریکٹر انور نقوی، لیاقت نیشنل ہسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر معز الدین، ثانوی تعلیمی بورڈ کے کنٹرولر امتحانات سید جاوید افتخار، اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کے سکریٹری پروفیسر ظہیر پارس، انجمن اساتذہ جامعہ کراچی کے سکریٹری ڈاکٹر شکیل الرحمٰن فاروقی، آرٹس کونسل کے نائب صدر ایس ایچ ہاشمی، کمشنر کراچی شفیق الرحمٰن پراچہ، ایڈیشنل سکریٹری تعلیم پروفیسر انیس علوی، کالج پرنسپل ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر ہارون رشید، سپلا کے مرکزی صدر دیوان آفتاب احمد خان صاحب، سابق پرو وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، کراچی پریس کلب کے سکریٹری ولی رضوی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر اقبال پنہور، گورنر سندھ کے مشیر عبدالوہاب شیخ، ممتاز دانشور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد قیصر، ڈاکٹر ناصر الدین، پروفیسر ایمریٹس ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اسلم فرخی ودیگر ممتاز ماہرین تعلیم، سیاستدان اور دانشور ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ میں شریک تھے اور پوری فضا سوگوار تھی۔

استاذ الاساتذہ پروفیسر غلام مصطفیٰ خان، سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے صدر سید محبوب حسن واسطی کو اپنے تعزیتی خط میں تحریر فرمایا ''سید ظفر زیدی کی انتقال کی خبر منیر احمد سلمہ نے دی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے لئے فوراً ایصال ثواب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات خوب خوب بلند فرمائے اور سب عزیزوں کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔ صوبائی وزیر مذہبی امور جناب محمد ولی رازی ڈاکٹر سید ظفر زیدی کے گھر گئے اور اہل خانہ سے تعزیت کی اور فرمایا کہ ڈاکٹر ظفر زیدی کے انتقال سے ملک ایک ممتاز علمی شخصیت سے محروم ہوگیا ہے۔ خانہ فرہنگ کے سربراہ نے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے پاکستان ایک بڑے سائنس دان سے محروم ہوگیا ہے۔ متاع دانش کے عہدیداران نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی اچانک رحلت سے طلباء برادری اور اہل علم ایک شفیق و ہمدرد استاد اور ماہر تعلیم سے محروم ہوگئے ہیں۔ صوبائی وزیر صحت جناب احسان احمد نے کہا کہ ڈاکٹر سید ظفر زیدی کی شعبہ تعلیم میں تحقیقی و تعلیمی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ روزنامہ جنگ کراچی نے اپنے ادارتی کالم میں لکھا کہ ڈاکٹر زیدی ایک بڑے ماہر تعلیم ہی نہیں بہت نامور سائنس دان بھی تھے اور سائنس کے شعبہ میں انکی

خدمات، تدریس وتعلیم کے شعبہ سے کم نہیں تھیں۔ان کی انہی قابل قدر علمی خدمات کی بنا پر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔معروف سیاستدان مولانا نورانی نے کہا کہ ڈاکٹر ظفر زیدی کے انتقال سے علمی وادبی دنیا کو صدمہ پہنچا ہے۔انکی وفات قومی نقصان ہے۔چیئرمین اکادمی ادبیات جناب افتخار عارف نے کہا کہ ملک ایک عظیم استاد اور تعلیم داں سے محروم ہوگیا ہے۔انکی تعلیمی خدمات کو مدتوں تک یاد رکھا جائے گا۔انجمن ترقی اردو پاکستان کے نائب معتمد امراؤ طارق نے کہا کہ ڈاکٹر ظفر زیدی کی وفات سے علم کیمیاء کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور اسی انجمن کے اعزازی صدر جناب آفتاب احمد خان نے کہا کہ ڈاکٹر ظفر زیدی نے کیمیاء پر اعلی پایہ کی تحقیق کی۔شاہ تراب الحق قادری اور جناب حنیف طیب نے مطالبہ کیا کہ جامعہ کراچی میں ڈاکٹر ظفر زیدی نام سے چیئر قائم کی جائے۔پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کی چیئر پرسن غنوی بھٹو نے ڈاکٹر ظفر زیدی کی علمی صلاحیتوں اور شعبہ تعلیم وتدریس میں انکی گراں قدر خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔پرنسپل اسلامیہ لا کالج وڈین فیکلٹی آف لا، جامعہ کراچی نے کہا ہے کہ انکی وفات سے ملک ایک ماہر تعلیم وسائنسدان سے محروم ہوگیا ہے۔مرحوم نے تعلیم کی ترقی کے لئے اہم خدمات انجام دیں۔سابق شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر ارتفاق علی نے کہا کہ انکو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انکے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کی تکمیل اور جامعہ میں تحقیق کو فروغ دیا جائے۔ڈاکٹر سید ظفر زیدی تعلیمی امور کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں بھی ماہر تھے۔ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہ ڈاکٹر ظفر زیدی ابتداء ہی سے Mission Oriented انسان تھے۔انہوں نے یونیورسٹی کی بہتری کے لئے جو سوچا وہ کر دکھایا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد

سرزمینِ گلاؤٹھی کا ایک مایہ ناز فرزند

ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد

استاد نفسیات۔ پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ یونیورسٹی، شارلوٹاؤن، کینیڈا

سید ریاض الدین احمد

اس دورِ پُرفتن میں اخلاقِ محمدی کا وہ عکسِ جمیل جو پاکستان کے افقِ علم وشرافت پر ستارہ بن کر ابھرا، افق مغرب پر سورج بن کر جگمگایا اور عین نصف النہار پر پہنچا تھا کہ ایک دم غروب ہوگیا، جس کے سوگ میں کراچی کی آنکھیں اپنے اشک ہائے خونیں سے ہفتہ بھر تک اخبارات کے صفحے رنگتی رہیں۔ حیدرآباد اور لاہور کی آنکھیں بھی اشکبار ہوئیں، شارلو ٹاؤن کینیڈا بھی جی بھر کر رویا۔ اپنے، پرائے، دوست آشنا، سب ہی کا دل بھر آیا لیکن وطن اور اہل وطن جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔

وہ ۱۹۳۰ء میں ایک متوسط الحال شریف گھرانے میں پیدا ہوا، بیشتر ابتدائی تعلیم وتربیت یہیں ہوئی، اس کے آباء واجداد کا وطن گلاؤٹھی ضلع بلندشہر (یوپی۔ بھارت) تھا۔ ۱۹۴۳ء میں جب اس کے والد حافظ سید شفیع الدین صاحب جو ریاست بھاولپور کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) کے ریڈر تھے، ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ''وہ'' اپنی والدہ سیدہ عائشہ بیگم اور دوسرے اہل خاندان کے ساتھ آبائی وطن جانے کے لئے مجبور ہوگیا۔ میٹرک کا امتحان اس نے ۱۹۴۷ء میں مسلم ہائی اسکول بلندشہر سے فرسٹ ڈویژن میں ریاضی اور اردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں اسکی والدہ ماجدہ بعارضہ سرطان معدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس سانحہ کے فوراً بعد ملک کے سیاسی حالات اور سرزمین وطن کی کشش اور محبت اسے تقسیم ہند سے پہلے بہاولپور لے آئی۔ دو سال یہاں رہ کر ۱۹۴۹ء میں حصول تعلیم کی غرض سے کراچی چلا گیا۔ طالب علم کی حیثیت سے اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معلم کی حیثیت سے وہ ۱۹۶۱ء تک کراچی اور حیدرآباد رہا لیکن وطن عزیز سے اس کا تعلق استوار و پائندہ رہا۔ فرصت ملتے ہی وہ سیدھا گلاؤٹھی اور بھاولپور آتا اور اس کی گلیوں میں گھوم پھر کر اپنے عزیزوں، ہم سبق ساتھیوں اور دوستوں، آشناؤں کی صحبت سے اپنا دل شاد کر کے اور انکے دلوں کو اپنی بے مثال اور لافانی محبت سے گرما کر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے واپس چلا جاتا۔ ابھی وہ زیر تعلیم ہی تھا کہ اس کے والد صاحب نے اسے ہندوستان بلا کر ازدواج کے بندھن میں باندھ دیا تھا لیکن علم کے اس عاشق نے شادی کو حصول علم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا وہ واپس آ کر پورے انہماک کے ساتھ حصول علم میں مصروف ہوگیا تھا، یہ بات نہیں کہ اسے اپنی بیوی سے تعلق نہ تھا۔ نہیں اسے اُس رشتہ کے تقاضوں کا پورا پورا احترام تھا اور محبت تو گویا اس کے خمیر کا جزوِ اعظم تھی۔ وہ کسی بھی انسان سے محبت نہ کرنے پر قادر ہی نہیں تھا۔ لیکن علم اور اور اپنے مقاصد حیات سے بھی اسے عشق تھا اور اس صبر و وفا کی دیوی نے بھی حق ادا کر دیا۔ کبھی

اور کسی نہج پر اپنے کسی قول یا عمل سے اس نے اس کی راہ میں الجھن پیدا نہیں کی اور صبر و شکر کے ساتھ ہندوستان میں اپنے سسر اور ساس کے دامنِ شفقت میں مناسب وقت کی منتظر رہی۔ وہ چھٹیوں میں کچھ عرصہ کے لئے جاتا اور بیوی، باپ اور تمام اہل خاندان کی زندگیوں کو اپنی محبت اور شگفتہ مزاجی سے منور کر کے واپس لوٹ آتا۔

اس نے کراچی یونیورسٹی سے سائیکولوجی میں بی اے آنرز کا امتحان نہ صرف فرسٹ ڈویژن بلکہ آرٹس فیکلٹی میں فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اور اگلے سال ایم اے کے امتحان میں بھی اپنے ان اعزازات کو قائم رکھا۔ کراچی یونیورسٹی نے اس نوخیز عالم نفسیات کو اس کی اہلیت اور علمی قابلیت کی قدردانی کرتے ہوئے فیلو لیکچرار کے عہدہ پر فائز کر دیا اور یہ فنافی العلم نوجوان سب کچھ بھول کر قوم کے نوجوانوں کے ذہنوں میں علم کی شمعیں روشن کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اسے فنافی العلم کہا، اس کے ساتھی اور اس کے طالب علم میری گواہی دیں گے کہ وہ ایسا ہی تھا، وہ ایم اے نفسیات کی کلاس لیا کرتا تھا اور جب کلاس کو پڑھانا شروع کرتا تو سب کچھ بھول جاتا سوائے اپنے مضمون کے۔ پیریڈ اور پیریڈس کی گھنٹیاں اس کے لئے بے معنی ہوتیں اور وہ بے تکان اس وقت تک زیرِ تعلیم عنوان پر بحث جاری رکھتا جب تک کہ یا تو اسے خود یہ اطمینان ہو جاتا کہ اس نے عنوان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور مزید بتلانے اور سمجھانے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا، یا پھر طالب علم کسمسانے لگتے۔ ایک سال کراچی یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد یونیورسٹی نے اس کی خدمات حاصل کر لیں، یہاں نفسیات کے شعبہ کی پوری ذمہ داری اس کے نوجوان اور باہمت کاندھوں پر تھی اور وہ پورے جوش و انہماک کے ساتھ علم کی روشنی پھیلاتا رہا۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اسے اس پیشے سے عشق تھا، اس دوران اسے وطن عزیز کے محکمہ دفاع نے آئی ایس ایس بی کے لئے کیپٹن سائیکولوجسٹ کے عہدہ کی پیشکش کی اور حکومت امریکہ کی طرف سے طبی نفسیات کے ایک پاکستانی محقق کے ذریعہ طبی نفسیات میں مددگار محقق کی حیثیت سے اتنا معقول مشاہرہ پیش کیا گیا کہ کسی پاکستانی کے لئے اس تحریص کو نظرانداز کرنا بڑا مشکل کام تھا لیکن دونوں مواقع کو اس نے یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا کہ ''دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں، میرا پیشہ معلّمی اور صرف معلّمی ہی رہے گا''۔

اس کے شفیق اور قدردان استاد پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب جن کے نام سے پاکستانی علمی حلقوں سے تھوڑا سا تعلق رکھنے والے بھی ناواقف نہیں، اپنے اس شاگرد کے متعلق بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ''اسے زندگی میں مواقع کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں خود موقعے اسے تلاش کیا کریں گے''۔

چنانچہ حیدرآباد میں علم کی خدمت کرتے اسے ایک ہی سال گزرا تھا کہ فل برائٹ اسکالرشپ کمیٹی نے اسے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے منتخب کر لیا، اس کی رفیقۂ حیات اور اس کا واحد پیارا بیٹا جو ۱۹۶۰ء کے وسط میں پاکستان آ گئے تھے، بہاولپور میں مقیم تھے اور سال میں متعدد بار علم کے اس متوالے کے قرب اور دیدار سے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے، لیکن ایک ہی سال بعد ۱۹۶۱ء میں یہ پھر ایک طویل عرصہ کے لئے اس سے بچھڑ گئے، عروس علم کا یہ شیدائی وصل محبوب کے خیال میں مگن، شاداں و فرحاں دیار مغرب کو روانہ ہو گیا اور شکاگو یونیورسٹی پہنچ کر وظائف علم میں مصروف ہو گیا۔ اس کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا ''Shocked induced sex behaviour in rats'' فل برائٹ اسکالرشپ پہلے پہل دو سال کے لئے ملتا ہے۔ کامیاب کارکردگی

کی شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لئے بڑھا دیا جاتا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ زیر تجربہ سفید چوہے جنہیں اس نے خاص طریقہ پر اور خاص حالات میں پرورش کر کے تجربات کے لئے تیار کیا تھا، کسی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئے اور اسکی ڈیڑھ سال کی تیاری اور محنت ذرا سی دیر میں اکارت ہوگئی چنانچہ وظیفہ بند ہو گیا۔ اندازہ کیجئے کہ یہ موقع اس کے لئے کس قدر صبر آزما ہوگا۔ یہ اس حادثہ سے کافی حد تک متاثر اور دل برداشتہ تھا کہ اس کے Research Tutor نے اس کی صلاحیتوں اور اہلیت کی قدردانی کرتے ہوئے اسکی مدد کی۔ اس وقت انڈیانہ یونیورسٹی کے گیری کیمپس میں جو شکاگو سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے، سائیکالوجی کے شعبہ میں اسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی تھی، امریکہ میں Ph.D سے پہلے کسی شخص کے لئے یہ عہدہ حاصل کرنا ناممکن ہے، لیکن اس کے Research Tutor کے تعارفی خط پر اسے فوراً ملازمت مل گئی۔ چنانچہ اس نے اپنا تحقیقی کام اس طرح مکمل کیا کہ رہتا شکاگو میں تھا اور فرائض منصبی کی انجام دہی کے لئے وقت مقررہ پر گیری پہنچتا اور وہاں سے واپس آ کر اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہو جاتا، اس پر طرہ یہ کہ اس عرصہ میں بھی اپنی رفیقۂ حیات اور اعزواقرباء کے حقوق کی ادائیگی اور مالی امداد سے غافل نہیں رہا۔ ۱۹۶۶ء میں اس نے شکاگو یونیورسٹی سے Ph.D کی ڈگری حاصل کی اور اس کے ساتھ اسے انڈیانا یونیورسٹی میں Associate Professor بنا دیا گیا۔

۱۹۶۶ء میں یہ پاکستان واپس آیا، کچھ عرصہ اپنے عزیزوں کے پاس رہا جن سے اسے واقعی عشق تھا اور بالآخر اپنے پیارے اکلوتے بیٹے اور بیوی کو ساتھ لے کر امریکہ سدھار گیا، اس لئے کہ اس کا ملک، اس کا پیارا ملک اسکی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا۔

اس کی ذاتی ضروریات نہیں، وہ تو بہت مختصر تھیں، دوسروں کی ضروریات جنہیں وہ اپنی ضرورتیں سمجھتا تھا، والدین کی ضروریات جو اپنا سب کچھ ہندوستان میں ختم کر کے چھوڑ کے اس کے اصرار پر ۱۹۷۰ء میں پاکستان چلے آئے تھے اور جن کے لئے ہر آسائش زندگی مہیا کرانا، اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ انکی ہر بڑی اور چھوٹی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ بہن بھائیوں کی ضروریات، جنکی ذرا سی پریشانی اور دکھ تکلیف سے اس کا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ دوستوں کی ضروریات جنہیں یہ اپنی طالب علمی کے زمانہ سے اپنا کیمرہ اور شوق کی چیزیں بیچ بیچ کر پوری کرتا چلا آیا تھا، آشناؤں کی ضروریات، بے استطاعت اور بے سہارا اغیار کی ضروریات، یہ سب اس کی اپنی اور شدید ضرورتیں تھیں اور انہیں وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں پورا کئے بغیر اسے کل نہ پڑتی تھی اور کیونکہ اس کا پیارا وطن اسکی یہ ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ اپنی رفیقۂ حیات اور بچے کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے باوجود کہ اسے اپنے وطن اور اپنے مذہب سے انتہائی عشق تھا، اتنا کہ اسے کسی طرح بھی یہ بات گوارہ نہ تھی کہ کسی پاکستانی اور کسی مسلمان کے قول وفعل سے ان پر حرف آئے۔

چنانچہ مذہبی فرائض وعبادات کی ادائیگی مسلم معاشرتی اور سماجی مقاصد کی تکمیل، اغیار کے درمیان مذہب ووطن کی عزت وحرمت کے تحفظ اور اہل ملک اور اہلِ قوم کے اقوال وافعال سے ان کی صحیح نمائندگی کے فرائض کی دیکھ بھال کے لئے اس نے شکاگو اور شارلوٹاؤن کینیڈا میں ملکی اور بین الاقوامی خطوط پر تنظیمیں قائم کیں اور اپنی علمی اور تعلیمی مصروفیات کے باوجود انکی صدارت

و نیابت کے فرائض انجام دے کر انہیں اس نہج پر پہنچادیا کہ امریکہ اور کینیڈا جیسے ممالک کے طول وعرض میں آج یہ تنظیمیں مؤثر وباوزن جماعتوں کی حیثیت سے ملک وملت کی نمائندگی کررہی ہیں۔

واپس جانے کے کچھ عرصہ بعد روز ویلٹ یونیورسٹی شکاگو نے اسکی خدمات حاصل کرلیں اور اسے اپنے پسندیدہ پیشہ میں ایک مستقل وممتاز مقام حاصل ہوگیا مگر علم کے اس متوالے کی علم کی پیاس بجھی نہیں اور اپنی پیشہ ورانہ اور سماجی وملی مصروفیات اور ان میں کمال انہماک کے باوجود اس نے اپنا علمی تحقیق کا شغل جاری رکھا اور نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی میڈیکل اسکول، یونیورسٹی آف شکاگو، سائنس ریسرچ ایسوسی ایشن شکاگو اور مائیکل ریس ہسپتال شکاگو جیسے بین الاقوامی اہمیت رکھنے والے اداروں کے زیر اہتمام نفسیات کے میدان میں متعدد دقیق اور وسیع تحقیقات کیں۔

قومیت اور شہریت کی چند قانونی پابندیوں اور مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۶۸ء میں یہ امریکہ چھوڑ کر کینیڈا چلا گیا اور یونیورسٹی آف پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ، شارلوٹاؤن صوبہ پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ کینیڈا کے شعبہ نفسیات سے بحیثیت Associate Professor منسلک ہوگیا جہاں عارضہ قلب کی شکل میں موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے ۹ ستمبر ۱۹۷۴ء کو اپنے محبوب پیشہ میں مشغولیت کے عالم میں طلباء کے ذہنوں کو شمعِ علم سے منور کرتے ہوئے کمرۂ جماعت میں آلیا۔ سرزمین گلاؤٹھی کا یہ مایۂ ناز فرزند بیس روز تک موت سے نبرد آزمائی کرنے کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے اپنی جواں سال بیوی اور نوخیز بیٹے کو، بوڑھے باپ کو، ایک بوڑھے بھائی کو جسے یہ اس کی اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھا، سارے بہن بھائیوں کو، عزیزوں اور دوستوں ہی کو نہیں، اغیار تک کو روتا دھوتا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گیا ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اس کے مرنے سے نہ معلوم کتنے دل ویران ہوگئے، کتنے گھروں کے چراغ بےنور ہوگئے۔ کتنوں کے دلوں کے زخم پر مرہم رکھنے والا نہ رہا، کتنوں کی ٹوٹی ہمت بندھانے والا نہ رہا۔ کتنی بیواؤں کا سہارا اٹھ گیا۔ کچھ پتہ نہیں، دل کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے، اپنوں اور پرایوں کے غم بانٹنے والی انکی احتیاج پوری کرنے کے مواقع کی متلاشی اور ڈھکے چھپے خاموشی سے خدمت کرنے والی، انسانیت کے دکھوں پر کڑھنے والی اور ایک متوازن ترین ذہن، کردار اور شخصیت کی مالک سدابہار شگفتہ اور پُرمزاح ہستی دنیا سے ناپید ہوگئی۔ آج اخلاق محمدی کا وہ عکس جمیل مٹ گیا جو کینیڈا سے پاکستان آتا تو جب تک اپنے ساتھ کام کرنے والے چپڑاسیوں تک سے نہ مل لیتا، اسے چین نہ آتا۔ آج وہ بےلوث اور سچا مشیر وندیم اور وفاشعار دوست اٹھ گیا کہ جو ایک مرتبہ اس سے مل لیا اسے کبھی بھلا نہ سکا۔ جو غیروں کے ساتھ بھی ایسا تھا کہ اپنے بھی کیا ہونگے، آج محبت ومروت ماتم کناں ہیں، اخلاق وکردار سر پیٹ رہے ہیں، انسانیت نوحہ گر ہے، وفاشعاری سینہ پیٹ رہی ہے اور خلوص غم سے سربزانو ہے کہ ان کا پیکرِ جمیل ناپید ہوگیا۔ قارئین یہ جذباتی باتیں اور مبالغہ آمیز شاعرانہ بیان نہیں، اظہار جذبات ہے اور جو لوگ زندگی میں کبھی ایک بار بھی اس سے ملے ہیں اس کی گواہی دیں گے۔

ہائے! ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد مرحوم ومغفور

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور عزیز ترین متاع اسکی کتابیں تھیں جن پر وہ اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ خرچ کیا

کرتا تھا اور جو اپنی تعداد، معیار، علمی اہمیت اور جدید ترین معلومات کا خزانہ ہونے کے اعتبار سے پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے شعبہ وار کتب خانہ (سیمینار) پر بھاری ہیں، یہ اس کی مادر علمی کراچی یونیورسٹی کو اس کی طرف سے آخری خراج محبت وعقیدت کے طور پر بطور عطیہ پیش کی جا رہی ہیں تا کہ اسکی طرف سے علمی فیض اس کے ان خاموش رفیقوں کے ذریعہ جاری رہے۔

☆

شمیم الدین احمد کے انتقال کے بعد آپ کی ذاتی کتابیں جن کی تعداد تقریباً بارہ سو ہے، جن میں بیشتر علم نفسیات کی قیمتی اور نادر کتابیں شامل تھیں جامعہ کراچی کو عطیہ کی گئیں۔ اس موقعہ پر لائبریرین جناب عثمانی صاحب کی جانب سے عطیہ کتب کے عنوان سے ایک تقریب منعقد ہوئی جس کا دعوت نامہ ناظرین کے لئے پیش ہے۔

تقریب عطیہ کتب

ڈاکٹر شمیم الدین مرحوم کے اہل خاندان کی طرف سے ۱۲۰۰ بارہ سو سے زائد کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کو پیش کیا جا رہا ہے، اس عطیہ کی افتتاحی تقریب زیر صدارت جناب ڈاکٹر احسان رشید شیخ الجامعہ کتب خانہ ہذا میں بروز ہفتہ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۷۶ء بوقت ساڑھے بارہ بجے منعقد ہوگی۔

ڈاکٹر شمیم الدین احمد مرحوم کے والد محترم جناب حافظ سید شفیع الدین اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس تقریب میں تشریف لا رہے ہیں، میں اس علمی تقریب میں جناب کی شرکت کا متمنی ہوں۔

محمد عادل عثمانی

لائبریرین جامعہ کراچی

☆☆☆

پروفیسر عزیز احمد

خودنوشت

پروفیسر عزیز احمد

میرا نام عزیز احمد ہے، شاعری میں عزیز احمد عزیزؔ استعمال کرتا ہوں۔ میری تاریخِ پیدائش ۲۴ جولائی ۱۹۲۹ء ہے۔ میں جس بستی میں پیدا ہوا تھا اس کا نام اُلدن ہے جو ضلع میرٹھ کے صدر مقام کے جنوب میں تقریباً چھتیس کلو میٹر کے فاصلے پر سراوہ کے قریب آباد ہے۔ یہ دونوں عربوں کی بستیاں ہیں جو التمش (۱۲۳۵ء۔۱۲۱۰ء) کے دور میں آباد ہوئیں اور اکبر اعظم کے دور حکومت میں پھولی پھلیں۔ التمش کے دور میں شاید یہاں کوئی جنگ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ایک بڑا قبرستان وجود میں آیا تھا جو آج بھی باقی ہے اور گورِغریباں کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ اکبرِ اعظم کے زمانے میں ایک عرب عالم قاضی عبدالملک اکبری کو ایک بڑا مدرسہ قائم کرنے کے لئے الدن کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس طرح سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں قاضی عبدالملک اکبری نے اس پرانی بستی کو ایک نئی اور خوبصورت بستی میں تبدیل کر دیا اور اس بستی کے مشرقی حصے میں قائم ایک مدرسہ کو ایک بڑے علمی مرکز میں تبدیل کر دیا جو ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ اسی دور میں قاضی عبدالملک اکبری کے ابنِ عم شیخ شمس الدین نے الدن سے بہت تھوڑے فاصلے پر سراوہ کی بستی کی بنیاد ڈالی۔ یہاں ایک روایت یہ مشہور رہی ہے کہ محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) کے دور میں افریقی سیاح ابنِ بطوطہ دہلی سے بجنور جاتے ہوئے الدن سے گزرا تھا اور مدرسہ میں کچھ وقت قیام بھی کیا تھا۔ ابن بطوطہ نے الدن کے مدرسہ کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس دور میں دہلی سے بجنور جانے کا راستہ یہی تھا لیکن میں نے خود ابنِ بطوطہ کا مکمل سفرنامہ نہیں پڑھا اس لئے میں اس کہانی کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ان دونوں بستیوں کے اطراف کبھی نہایت خوبصورت تھے۔ یہاں کی زمین اب بھی غیر معمولی طور پر زرخیز ہے اور خزاں کبھی نہیں آتی، اطراف میں اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تک بھی یہاں اعلیٰ درجہ کی شکارگاہیں تھیں۔ ہر طرف ہرن، نیل گائیں، خرگوش، مور، تیتر، بٹیر اور دوسرے انواع واقسام کے جانوروں اور پرندوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ موسمِ سرما میں قازوں اور مرغابیوں کی آمد بڑے زور شور سے ہوتی تھی، یہاں کے جنگلوں میں طرح طرح کے خودرو اور پھل دار درخت تھے اور مختلف النوع جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی تھیں جن سے لوگ بیماریوں کا علاج کر لیتے تھے یہاں کا پانی ہلکا اور میٹھا تھا اور اب بھی ہے۔ مزید برآں یہ علاقہ طرح طرح کے سانپوں کا بڑا مرکز تھا۔ بہرحال اب یہ سب باتیں برائے نام رہ گئی ہیں۔ ہر چیز بدل گئی ہے البتہ زمین اب بھی زرخیز ہے لیکن لوگوں کی خصوصیات بدل گئی ہیں۔ اب وہ لوگ جو کبھی یہاں رہتے تھے شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا بھر میں منتشر ہو گئے ہیں اور یہ دو بستیاں جو کبھی تعلیم، علم وادب اور

تہذیب کا گہوارہ تھیں اتنا بدل چکی ہیں کہ باور نہیں ہوتا۔ان بستیوں کے بارے میں اہم ترین بات اردو زبان سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حالانکہ اس بستی کے پیشتر وعرب تھے،عربی بولتے تھے اور فارسی کے سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے فارسی بھی سیکھتے اور استعمال کرتے تھے لیکن یہاں کافی تعداد اہلِ حرفہ کی تھی ،مسلم بھی اور غیر مسلم بھی اور وہ سب کھڑی بولی والے تھے۔مزید برآں اطراف میں ایسی بستیاں تھی جن کی اکثریت غیر مسلم تھی اور وہ سب کھڑی بولی والے تھے۔لہٰذا ان سب کی باہمی لسانی اثر اندازی کے نتیجے میں کھڑی بولی میں جو بے پناہ تبدیلیاں ہوئیں اور جو زبان بن سنور کر نکلی وہ اردو تھی۔

تعلیم:بستی کے دوسرے خاندانوں کی طرح میرا خاندان بھی ایک زوال پذیر چھوٹا زمیندار خاندان تھا۔۱۹۳۲ء میں جب میرے والد صاحب کا انتقال لولگ جانے کی وجہ سے دفعتاً ہوا تو میری عمر صرف ساڑھے تین سال کی تھی۔اس حادثہ کے بعد گھر کے حالات یکسر بدل گئے۔اس زمانے میں اطراف میں آباد لوگوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یوں بھی مشکل تھی اور بدلے ہوئے حالات میں تو میرے لئے تعلیم حاصل کرنا بظاہر ناممکن نظر آنے لگا۔چودہ سال کی عمر میں میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ۔اس طرح میری زندگی کے ایک بہت ہی دشوار گزار مرحلہ کا آغاز ہوا اور بالآخر ۱۹۵۴ء میں ، میں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے انگریزی میں ایم اے کرلیا اور دورانِ ملازمت سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد سے لسانِ انگریزی کی تدریس کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کرلیا۔میری باقاعدہ تعلیم بس اتنی ہی ہوئی۔

ملازمت: میرٹھ یونیورسٹی سے ملحق ایس ایس وی (پوسٹ گریجویٹ) کالج ہاپوڑ میں چھتیس سال انگریزی زبان و ادب کی تدریس کی۔انگریزی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ کا صدر رہا اور کالج کے کم وبیش تمام انتظامی منصبوں پر کام کیا حتی کہ پرنسپل بھی رہا۔حکومتِ ہند کے ڈیپوٹیشن پر کابل میں وزارتِ تعلیم کے تحت چھ سال تک تعلیمی اور تربیتی خدمات انجام دیں ۱۹۹۰ء میں اکسٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہوا۔

شادی: میری شادی 11 مئی ۱۹۵۷ء کو بہت سادہ طریقہ سے ہوئی۔میری عمر شادی کے وقت ۲۸ سال تھی اور بیوی کی عمر ۲۲ سال۔ہمارے پانچ بچے ہیں اور سب حیات ہیں۔ہماری ازدواجی زندگی بڑی حد تک خوشگوار اور پرسکون رہی ہے۔ہم نے اولاد کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں ایک دوسرے کے ساتھ صدفی صد تعاون کیا ہے۔قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نہ صرف ہم دونوں میاں بیوی کی زندگی میں پوری ہم آہنگی ہے بلکہ ہماری اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں اور ہمارے بچے بھی نہ صرف ہمارے ساتھ بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی بہت اچھے تعلقات بنا کر رکھتے ہیں۔میری اولاد میں ہر فرد کی علیحدہ فیملی ہے لیکن ان میں یکجائیت اور قربت کا رجحان بہت مضبوط ہے۔میرے خانوادے کا ہر فرد ''عزیز فیملی'' سے تعلق پر فخر کرتا ہے۔

میری فیملی لائف: پانچ بچوں کو پرورش کیا،ایک بیٹی اور چار بیٹے۔میری بیٹی اور دو بیٹے امریکہ میں بس گئے ہیں۔تیسرا بیٹا ایک بین الاقوامی ادارہ میں ملازم ہے۔وہ بھی زیادہ وقت ملک کے باہر ہی رہتا ہے۔صرف ایک بیٹا دہلی میں ہے۔ہم دونوں میاں بیوی ہاپوڑ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ہم ایک طرح کے سماجی کارکن ہیں اور سماج کی خدمت کرنے سے ہمیں بہت خوشی ہوتی

ہے۔ بیوی پڑوس کے بچوں کے لئے غیر رسمی کنڈر گارٹن چلاتی ہیں اور انھیں اردو اور قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ خود بھی قرآن کی تلاوت روزانہ صبح پابندی سے کرتی ہیں۔ اس طرح ایک مہینہ میں ایک قرآن ختم کرتی ہیں اور اگلے ایک مہینہ میں پورے قرآن کا اردو ترجمہ ختم کرتی ہیں۔ ان کے غیر رسمی کنڈر گارٹن کی وجہ سے پڑوس کے سبھی بچے آجاتے ہیں اور کچھ وقت کے بعد کل وقتی اسکولوں میں جانے لگتے ہیں۔ بچوں کو قرآن پہلے عربی میں پڑھاتی ہیں اور اس کے بعد قرآن کا ترجمہ پڑھاتی ہیں۔

معاش: میری معاش کا معاملہ زندگی بھر تعلیم سے جڑا رہا۔ چنانچہ میرا معاشی سفر ۱۹۴۳ء میں تعلیم بند ہو جانے پر شروع ہوا۔ میں نے اپنی پہلی ملازمت ایک سیلز مین کی حیثیت سے چودہ سال تین ماہ کی عمر میں دہلی میں شروع کی۔ جب تعلیم کی صورت نہیں نکلی تو ایک سال کے بعد گھر واپس آ گیا۔ دوسری ملازمت ایک لیجر کلرک کی حیثیت سے اپنی بستی کے قریب ایک قصبہ میں شروع کی۔ ایک سال پورا ہوتے ہوتے وہاں مجھے انگریزی کا ایک ٹیوٹر مل گیا اور میں نے اس سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی۔ اس دوران میرے ماموں سید حافظ شفیع الدین مرحوم نے گلاؤٹھی میں مفید عام اسکول کی بنیاد ڈال دی تھی۔ انھیں جب میرے پڑھنے کے غیر معمولی شوق کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے گلاؤٹھی بلا لیا۔ وہاں رہ کر میں نے ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول کا امتحان دیا اور اس کے فوراً بعد مجھے مفیدِ عام ہی میں ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ وہاں ایک سال پورا ہوتے ہوتے ۱۹۴۸ء میں ہاپوڑ میں ایس ایس وی انٹر کالج کھل گیا اور اس کے بانی بابو لکشمی نارائن صاحب کی رائے پر میں نے وہاں جا کر انٹر میں داخلہ لے لیا۔ میں دو سال تک گھر سے کالج سات میل پیدل جاتا تھا اور سات میل پیدل واپس آتا تھا۔ اس طرح روزانہ چودہ میل کا سفر پیدل چل کر طے کرتا تھا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ کے لئے گیا۔ وہاں میرے ایک طالب علم دوست نے ایک سینئر طالب علم سے تعارف کرا دیا اور کہا کہ یہ آپ کی داخلہ میں مدد کریں گے۔ سینئر طالب علم جو ممتاز ہاؤس کے سینئر فوڈ تھے۔ وہ مجھے شعبہ انگریزی کے صدر اور آفتاب ہال کے پرووسٹ پروفیسر محمود صاحب کی کوٹھی پر لے گئے اور ان سے میرا تعارف بہت اچھی طرح کرا دیا۔ محمود صاحب نے کہا: ''اگر پڑھنے آئے ہیں تو داخلہ لے لیجئے۔'' میں نے کہا: ''لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔ انھوں نے جواب دیا: ''تو پھر خیال چھوڑ دیجئے۔'' میں نے کہا: ''میں یہاں خیال چھوڑنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔'' اس پر انھوں نے کچھ دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غور سے دیکھا۔ پھر مسکرائے اور کہا کہ ''اچھا، پندرہ روز کے بعد میرے پاس آیئے۔'' میں واپس ممتاز ہاؤس آ گیا۔ پندرہ روز کے بعد میں پھر ان کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ باہر آئے، بیٹھے، مجھ سے کہا: ''آپ ابھی تک یہیں گھوم رہے ہیں؟'' میں نے مسکرا کر کہا: ''جی''۔ بولے: ''آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ممتاز ہاؤس میں''۔ پوچھا: ''وارڈن صاحب کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا: ''جی، ڈاکٹر خورشید الاسلام ہیں۔'' کہنے لگے بس اب آپ انہی سے مل لیجئے اور داخلہ لے لیجئے۔ میں ڈاکٹر خورشید الاسلام سے ملا اور تعلیم شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کے حصول کے عمل کی تفصیلات بہت ہیں۔ بہر حال چار سال بعد ایم اے انگریزی پورا ہونے پر بابو لکشمی نارائن صاحب کی دعوت پر اگست سن ۱۹۵۴ء میں ایس ایس وی ڈگری کالج ہاپوڑ میں انگریزی کے لکچرر کی ملازمت قبول کر لی اور چھتیس سال اسی کالج سے وابستہ رہا جو میرے دورانِ ملازمت میرٹھ یونی ورسٹی سے الحاق شدہ ایک بڑا پوسٹ گریجویٹ کالج بن گیا جس کے تمام شعبوں میں تقریباً ساڑھے سات ہزار طلبا زیر تعلیم

رہتے ہیں ۔ ۱۹۹۰ء میں میرا ریٹائرمنٹ ہوا اور مجھے پینشن ملنے لگی لیکن زندگی کے بیشتر حصے میں تعلیم اور معاش کا ساتھ رہا اور اب صرف تعلیم سے سروکار ہے اور معاش کی طرف سے بے نیازی حاصل ہے۔

سفر: ملک کے اندر اور باہر کافی سفر کئے۔ایک حج اور دو عمرے بھی کئے۔کابل میں فیملی کے ساتھ چھ سال قیام پذیر رہا ۔امریکہ کے پانچ سفر کئے اور وہاں قیام کی مدت اب تک دو سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ایک ایک بار ایران اور پاکستان کا سفر بھی کیا تھا۔باہر کے ممالک میں قیام کی مجموعی مدت ساڑھے آٹھ سال ہے۔

سوشل ورک: کالج کی خدمت کے دوران بھی سوشل ورک کرتا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد تو خاص طور پر یہی سب کرتا ہوں۔اس سے میرے دل میں بے حد اطمینان اور خوشی کا احساس رہتا ہے۔

ادبی مشاغل: مجھے خاصی کم عمر میں ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہمیشہ رہی اور اب بھی ہے۔ادب کی تدریس میرے پیشے میں بھی شامل رہی۔ میں نے افسانے بھی لکھے۔اخباروں میں مضامین بھی لکھے۔ایک زمانے میں چار سال تک روزنامہ الجمعیۃ اور روزنامہ نئی دنیا کا نامہ نگار بھی رہا۔انگریزی میں وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین بھی لکھے جو کتابی شکل میں بھی چھپے ۔شاعری دیر سے شروع ہوئی لیکن ابھی میرا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا البتہ غزلیں اور نظمیں معیاری جریدوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

میرے محسن مشفق اور احباب: میری ابتدائی زندگی کا سفر بہت کٹھن تھا۔خاص طور پر تعلیم کے حصول کے راستے میں جو دشواریاں تھیں ان کو آسان بنانے میں جن بزرگوں کا رول رہا ہے ان میں سب سے پہلے میرے ماموں سید حافظ شفیع الدین مرحوم بانی مفید عام انٹر کالج گلاؤٹھی کی ہمدردیاں تھیں جن کی وجہ سے مجھے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔دوسرے نمبر پر بابو لکشمی نارائن بانی ایس ایس وی پوسٹ گریجویٹ کالج ہاپوڑ جنھوں نے میرے انٹر کے دو سال پورے کرنے میں مدد کی اور ایم اے کرنے کے بعد مجھے کالج میں ملازمت کی پیش کش کی جسے میں نے قبول کر لیا اور چھتیس سال کالج کی خدمت کی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر محمود مرحوم نے جو انگریزی شعبہ کے چیرمین اور آفتاب ہال کے پرووسٹ تھے نہ صرف میرے داخلے میں مدد کی بلکہ پورے چار سال میری سرپرستی کی اور جناب مختار حامد علی مرحوم ریڈر شعبہ انگریزی جنھوں نے میرا غیر معمولی ساتھ دیا اتنی مہربانیاں کیں کہ میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔احباب میں خلیل الرحمٰن اعظمی ،انجم اعظمی ،علی حماد عباسی اور جاوید کمال کی رفاقت میری زندگی کا بہترین اور ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ میری زندگی اور شخصیت پر ان سب کا نہایت گہرا اثر ہے۔میں ان کی بے پناہ قدر کرتا ہوں اور ان کا شکر گزار رہتا ہوں۔

☆☆☆

سید ظفر الدین احمدؒ

نسیم الدین ہاشمی

ہماری برادری کی ممتاز شخصیتوں میں ایک نمایاں نام چچا سید ظفر الدین احمد کا ہے۔رشتہ میں وہ اگر چہ میرے والد محترم کے چچا تھے لیکن ہم سب بہن بھائی ان کو چچا ہی کہتے تھے۔ہم ایک ہی پردادا حافظ سید سراج الدین مرحوم کی اولاد ہیں۔آپ سے میرا اصل تعلق ۱۹۸۵ء میں ادارہ اخوان السادات کی تنظیم نو کے دوران ہوا۔آپ ہماری برادری کے ان چند حضرات میں شامل ہیں جنہوں نے دل وجان سے خاندان اور برادری کے لئے غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

آپ ۱۹۱۱ء میں گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے،آپ کے والد کا نام حافظ سید شریف الدین اور دادا کا نام حافظ سید سعید الدین تھا۔۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ اسکول بلند شہر سے ہائی اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ آ گئے اور پھر یہیں سے بی ایس سی اور ایم ایس سی (۱۹۳۸ء) کیا۔۱۹۳۹ء میں اسی ادارہ سے ٹیچرس ٹریننگ (BT) کی سند حاصل کی۔۱۹۶۲ء سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم ایڈ کیا۔

ملازمت کا آغاز ۱۹۴۰ء میں مسلم اسکول بلند شہر سے کیا۔ایک سال ملازمت کے بعد ۱۹۴۱ء میں آپ افغانستان چلے گئے، جہاں ۱۹۴۴ء تک حبیبیہ کالج کابل میں استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔۱۹۴۵ء میں کابل یونیورسٹی میں جغرافیہ کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ مقرر ہوئے۔حکومت افغانستان نے آپ کی شاندار تعلیمی خدمات کے عوض آپ کو مشیر تعلیم (Education Advisor) مقرر کیا۔۱۹۵۱ء تک افغانستان میں خدمات انجام دینے کے بعد اسی سال پاکستان واپس آ گئے اور جھنگ پنجاب میں (MB) ایم بی ہائی اسکول سے منسلک ہوئے۔۱۹۵۲ء میں مسلم ہائی اسکول نواب شاہ میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیئے۔۱۹۵۷ء میں آپ حیدرآباد آ گئے اور ۱۹۶۲ء تک گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔اسی سال آپ اسلامیہ کالج سکھر کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۲ء تک آپ نے وی ایم پبلک اسکول کراچی میں پرنسپل کے فرائض انجام دیئے۔۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک آپ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیر کے پرنسپل رہے اور اسی سال ریٹائر ہوئے۔

تعلیم اور تدریس کے میدان میں آپکی خدمات مسلمہ ہیں،آپکے کئی ہزار شاگرد ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۔ Human Physiology — اردو میں سندھ بورڈ کے لئے

۲۔ Hygein — اردو میں سندھ بورڈ کے لئے

۳۔ World Geography — فارسی میں کابل یونیورسٹی کے لئے

۴۔ Geography of Afghanistan — فارسی میں کابل یونیورسٹی کے لئے

۵۔ Human Physiology منافع الاعضاء

۶۔ اصولِ صحت Firs Aid

اس کے علاوہ آپ نے بے شمار دینی کتابیں لکھیں جن کی کل تعداد ۳۰ سے زیادہ ہے، ان کتابوں کے مختلف موضوعات ہیں جیسے ایمان، جہاد، بدعت، اخلاق، پردہ، قرآن سائنس کی روشنی میں، الصلوۃ، تصوف، انسان اور کائنات اور زیارتِ قبور، اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام وغیرہ۔ آپ کا سب سے شاندار اور تاریخی کام جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا وہ گلاؤٹھی کے خاندانوں کے شجرات ہیں۔ کراچی آنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں آپ نے شجروں پر کام شروع کیا اور گھر گھر جا کر کوائف جمع کئے اور بالآخر ۱۹۷۶ء میں اس کام کو مکمل کیا۔ یہ شجرات ۴۰ بڑے صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کام کو مکمل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع سے استفادہ کیا گیا، اُن میں:

الف۔ غلام اہل بیت فارسی کی کتاب جو ۱۰۰ سال پہلے لکھی گئی۔

ب۔ ''تذکرۃ الاقرباء وشجرۃ الاولیاء'' ۱۵۰ سال قبل لکھی گئی فارسی تالیف از سید محمد حسینی واسطی

ج۔ سادات امروہہ (امروہہ کے زیدی خاندان کے شجرات)

د۔ مولانا اصلح الحسینی کی شجرات پر تحقیق اور معلومات سے استفادہ

ھ۔ ڈاکٹر یاسمین خان پی ایچ ڈی کی کتاب سادات بارہ ۔

و۔ گڑھ مکتیشور کے صدیقی خاندانوں کا شجرہ (یہ شجرہ عبدالغنی صاحب سابق منیجر مسلم ہائی اسکول بلند شہر سے حاصل ہوا۔

ز۔ اولاد شاہ ابّن امروہہ (یہ شجرہ لاہور سے حاصل ہوا)

ح۔ تحقیق سادات، بھائی قطب الدین سے امام علی رضا کا شاہ محمود مالا مال کا شجرہ

ط۔ خاندان کے ہر شخص سے ملاقات کی۔

ادارہ اخوان السادات سے آپ کی وابستگی شروع سے رہی۔ آپ ادارہ کے بانی ارکان میں سے تھے، ادارہ کے موجودہ آئین کو بنانے میں اور ادارہ کو باقاعدہ رجسٹرڈ کرانے میں آپ کا بنیادی کردار رہا ہے۔ (ادارہ کے آئین کو ۱۹۶۲ء میں رجسٹرڈ کرایا گیا، اس کمیٹی میں ظفر الدین احمد، سید احمد اور مولانا اصلح الحسینی اور مولانا سید نظام الدین شامل تھے)۔

ادارہ کی تنظیم نو کے بعد خصوصی دلچسپی جاری رکھی، میں شکر گزار ہوں کہ جب بھی مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہوئی، آپ نے ہمیشہ میری اور ادارہ کی مدد فرمائی۔ میری درخواست پر آپ نے تین مضامین ''تذکرہ شجرات کا'' ''حسب نسب اسلام کی روشنی میں'' ''تاریخ گلاؤٹھی'' جیسے نادر مضامین لکھ کر ہماری موجودہ کتاب کو وقار بخشا۔

۱۸ دسمبر ۲۰۰۳ء بانوے (۹۲) سال کی عمر میں آپ خالق حقیقی سے جا ملے اور کراچی میں مدفون ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

☆☆☆

پروفیسر قاضی سید محمد احمد

از: نسیم الدین ہاشمی

تعلیمی میدان میں جن اہل علم شخصیات کے باعث قصبہ گلاؤٹھی کو شہرت حاصل ہوئی اور جن لوگوں پر اہل قصبہ فخر کر سکتے ہیں ان میں ایک نام پروفیسر قاضی محمد احمد مرحوم کا بھی ہے۔ قاضی محمد احمد ۳۰ جولائی ۱۹۳۳ء کو گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے قاضی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ قاضی عبدالنعیم مرحوم کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ قاضی عبدالسلام مرحوم اور قاضی اسلام مرحوم آپ کے بڑے بھائی تھے، والد کا انتقال کم عمری میں ہونے کے باعث آپ کی پرورش اور تعلیم کے حصول میں آپ کے بڑے بھائی قاضی عبدالسلام نے اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقہ سے نبھایا۔ تینوں بھائیوں کی آپسی محبت اور اتحاد مثالی تھا۔

ابتدائی تعلیم مفید عام اسکول میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں بی ایس سی آنرز اور ۱۹۵۵ء میں ایم ایس سی کیا۔ ۱۹۵۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی میں آپ کا تقرر بحیثیت لیکچرار جغرافیہ ہو گیا۔ آپ کی شاندار خدمات کے باعث یونیورسٹی انتظامیہ نے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو شعبۂ جغرافیہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنے وقت کے مشہور جغرافیہ دان پروفیسر محمد شریف کی سربراہی میں Agriculture Geography میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال ریڈر مقرر ہوئے اور ۱۹۸۳ء میں پروفیسر تعینات ہوئے۔ اپنے شاندار تدریسی کیرئیر کے ساتھ آپ نے بحیثیت پروکٹر، پرووسٹ، ڈین فیکلٹی اور ڈین آف اسٹوڈنٹ کے عہدوں پر طویل عرصہ تک خدمات انجام دیں۔ بحیثیت جغرافیہ داں آپ نے ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں شعبہ جغرافیہ کی سلیکشن کمیٹی کی تشکیل میں مدد کی۔ آپ نے طویل عرصہ تک جامعہ میں بحیثیت Controler of Examination خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۹۹۳ء میں جامعہ سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی ۵ سال تک بلا معاوضہ اپنی خدمات جاری رکھیں جو آپ کی جامعہ سے محبت کا عملی ثبوت تھا۔

۱۹۷۵ء میں آپ کی شادی صوفیہ خاتون زیدی سے ہوئی۔ آپ بھی جامعہ میں طویل عرصہ تک تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہیں۔ آپ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ قاضی صاحب کے انتقال کے وقت تینوں بچے کم عمر تھے، ان کی پرورش اور تعلیم کی تمام ذمہ داریاں آپ نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے پوری کیں۔ آپ کی بڑی صاحبزادی نازیہ احمد بھی تعلیم کے شعبہ سے وابستہ رہیں اور جدہ (سعودی عرب) کے مشہور برٹش اسکول (Jeddah Prep) میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی رہیں ہیں اور آج کل اوٹاوہ کنیڈا میں اپنے شوہر اور چار بچوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ دوسرے صاحبزادے قاضی سعد احمد سڈنی آسٹریلیا میں مقیم ہیں اور تیسرے صاحبزادے مقیم امریکہ ہیں۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۸ء کو قاضی محمد احمد کا انتقال دہلی کے پنت اسپتال میں ہوا۔ آپ کو جامعہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائے (آمین)

(بشکریہ محترمہ صوفیہ قاضی)

☆☆☆

ڈاکٹر سید مبین اختر

خودنوشت

ڈاکٹر سید مبین اختر

سوال: ڈاکٹر صاحب اپنے خاندانی پس منظر اور ہجرت کے بارے میں بتائیے؟

ڈاکٹر مبین اختر: بتاریخ ۲ جنوری ۱۹۳۳ء میں میری پیدائش سکندر آباد، بلند شہر یوپی میں ہوئی۔ میں ابھی ایک سال کا تھا کہ والدین لاہور آ گئے۔ والد صاحب نے بی کام (B.Com) آگرہ سے کیا تھا پنجاب کوآپریٹو بینک میں آڈیٹر تعینات ہو گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے رجسٹر ڈ اکاؤنٹینٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا جو کہ اس زمانے میں چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا متبادل تھا البتہ میری تمام تعلیم لاہور میں ہی ہوئی۔ سینئر کیمبرج سینٹ انتھونی ہائی سکول سے ۱۹۴۹ء میں کیا اور ایف ایس سی پری میڈیکل ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج (اب جامعہ) لاہور سے کیا۔ سینئر کیمبرج میں ایک وظیفہ ملا جو ایم بی بی ایس کے آخری سال تک چلا۔ ایف ایس سی میں پورے پنجاب میں دوسرے نمبر پر آیا البتہ میڈیکل کالج میں داخلے کے وقت اول نمبر پر تھا کیونکہ اس زمانے میں میڈیکل کالج اسلامیات کے نمبر نکال کر فہرست بناتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامیات اور اسلام سے میرا کتنا کم تعلق تھا۔

☆سوال: بتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے؟

ڈاکٹر مبین اختر: ابتدائی تعلیم ایسے اسکولوں میں ہوئی جہاں نہ صرف ذریعہ تعلیم انگریزی میں تھا بلکہ پڑھانے والے بھی انگریز تھے۔ اس سے پہلے والد صاحب ہمیں علی گڑھ لے گئے تھے کہ وہاں داخل کروا دیں مگر وہاں ان کو بچوں کا ہوسٹل پسند نہ آیا اور ہم واپس آ گئے، یعنی علیگ بنتے بنتے رہ گئے۔ جس اسکول میں پڑھائی پہلی جماعت سے سینئر کیمبرج تک کی اس کا نام تھا سینٹ اینتھنی ہائی سکول۔

☆سوال: کالج میں کون سے مضامین کا انتخاب کیا؟

ڈاکٹر مبین اختر: ایف ایس سی کے بعد لنگ ایڈورڈ کالج (اب جامع) میں داخلہ لیا۔ وہاں بھی اکثر میرے نمبر بہت اچھے آئے مگر اساتذہ کے رویئے سے ہمیشہ پریشان رہا۔ پاکستان میں تقریباً تمام تعلیمی اداروں کی طرح وہاں کے اساتذہ بھی ڈانٹ ڈپٹ اور ذلیل کرنے میں ماہر تھے۔ یہ عزت نفس کو ٹھیس تو پہنچاتی ہی ہے خصوصاً جب کلاس میں لڑکیاں بھی موجود ہوں۔

سب اساتذہ میں یہ عادت ہوتی ہے کہ کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ جب امریکہ میں جا کر ٹریننگ کی تو ایک دفعہ ایک استاد ہمیں پڑھا رہے تھے، کسی نے ان سے ایک سوال پوچھا، جواب سن کر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ کہہ رہے تھے مجھے اس کا جواب معلوم نہیں، تم ذرا لائبریری میں دیکھو اور مجھے بھی بتانا۔ پاکستان میں تقریباً بیس سال بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے باوجود میں نے کسی استاد کے منہ سے یہ الفاظ نہیں سنے تھے۔

ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد ایک دفعہ میرا گزر کالج کی لائبریری سے ہوا (پہلے میں وہاں کبھی نہیں گیا تھا) تو معلوم ہوا کہ میڈیکل رسالے بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں وہ کیا پڑھائی ہوگی جس میں لائبریری اور جدید رسالوں کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایم بی بی ایس کے دوران کتابیں تو ہم نے خوب رٹ رکھی تھیں مگر عملی کام میں تقریباً صفر تھے۔ ہر پریکٹیکل امتحان میں سب طلباء کی چھپ چھپا کر اتنی مدد کی جاتی تھی کہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بل بوتے پر ہم جیسے ذہین اور زیادہ نمبر لینے والے بھی اس کے بغیر فیل ہو جاتے۔ یقیناً یہ سب کچھ پروفیسر صاحبان کے علم میں ہوگا مگر پھر بھی یہ تماشا چلتا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ایم بی بی ایس شاندار نمبروں سے پاس کرنے کے بعد بھی مجھے ملیریا بخار کے لیے بھی ادویات کا نسخہ لکھنا نہیں آتا تھا۔

☆سوال: آپ نے کس سن میں امریکہ کا سفر اختیار کیا؟

ڈاکٹر مبین اختر: میں جون ۱۹۶۲ء میں امریکہ گیا اور وہاں سینٹ لوئس، مسوری کے شہر میں ڈیکینس (Deaconess) ہسپتال میں تربیت شروع کی جو ایک سال جاری رہی۔ اس کے بعد اگلے سال اپسلانٹی، مشیگن (Ipsilanti, Michigan) میں سرکاری ہسپتال میں شعبہ ذہنی امراض میں تربیت شروع کی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ تین سال تک وہاں رہوں گا مگر ایک واقعہ نے مجھے وہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں نے وہ ملازمت چھوڑ دی اور سینٹ لوئس کے ذہنی امراض کے ہسپتال میں ملازمت و تربیت اختیار کر لی۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے زمانے میں کئی اسلامی تنظمیں بنیں اور میں تقریباً سب کے بنیادی ممبران میں شامل تھا یعنی مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن (MSA)، اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA)، اسلامک میڈیکل ایسویشن آف نارتھ امریکہ) (IMANA) وغیرہ۔

☆سوال: آپ نے کون سے مضمون میں کس سن میں ڈاکٹریٹ مکمل کیا؟۔

ڈاکٹر مبین اختر: امریکہ کی سب سے بڑی ڈگری جو طب کے شعبے میں ہوتی ہے وہ ہے American Diplomate of the Board یعنی امریکن بورڈ کی سند۔ یہ طب کے ہر شعبے میں ہوتی ہے کیونکہ میں طبی نفسیات (Psychiatry) میں تھا اس لیے میں نے حاصل کی American Board of Psychiatry & Neurology یعنی امریکن بورڈ کی سند برائے طبی نفسیات اور دماغی امراض۔ اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے پہلے کم از کم تین سال کی اسی شعبے میں تربیت، تعلیم و تجربہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں ۱۹۶۸ء میں اس امتحان میں شریک ہوا اور خدا کے فضل سے پہلی دفعہ میں ہی کامیابی حاصل کر لی حالانکہ پہلی دفعہ میں صرف چالیس فیصد ڈاکٹر کامیاب ہوتے ہیں۔

☆سوال: جرائد میں آپ کے مقالوں کی تعداد کتنی ہے؟

ڈاکٹر مبین اختر: ۱۹۷۹ء سے میں ایک رسالہ نکال رہا ہوں جو تمام پاکستان کے طبی نفسیات کے ماہرین کو اور دس ہزار دوسرے عام ڈاکٹروں کو بھیجا جاتا ہے۔ اس میں جدید تحقیق پر مضامین ہوتے ہیں اور پاکستان سے متعلق سیاسی و سماجی مضامین بھی۔ اس کے علاوہ تمام نفسیاتی امراض پر کتابچے تحریر کئے ہیں تاکہ مریضوں اور ان کے لواحقین کو مرض کی نوعیت سمجھ آ جائے اور علاج بہتر ہو سکے۔ جنسی مسائل پر دو کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ ایک اردو میں جس کا عنوان ہے ''نوجوانوں کے خصوصی مسائل۔ شادی سے پہلے۔ شادی کے بعد'' ایک انگریزی میں جس کا عنوان ہے "Sex Education for Muslims- Men and Women, Single or Married"

☆سوال: وطن واپس کب آئے اور کیوں؟

ڈاکٹر مبین اختر: امریکہ میں اس لیے گیا تھا کہ وہاں مستقل رہائش اختیار کرلونگا مگر دو تین ماہ میں یہ ارادہ ترک کر دیا اور جلد از جلد واپسی کا منصوبہ بنایا۔ جانے سے پہلے میں امریکہ کے بارے میں بہت حسین تصور رکھتا تھا مگر وہاں حالات دیکھ کر ایک نئی تصویر اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت خوشحال تھے (اور ہیں)، بڑی بڑی جامعات تھیں، بارہویں جماعت ہائی اسکول تک تعلیم ہی نہیں بلکہ گاڑی میں آنا جانا، کتابیں کاپیاں اور دوپہر کا کھانا بھی مفت ملتا تھا۔ چنانچہ تقریباً ہر فرد خواندہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا اور چند ماہ میں ہی اپنا مستقل رہنے کا ارادہ بدل کر جلد از جلد واپس آنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ جیسے ہی ۱۹۶۹ء میں مجھے امریکن بورڈ کی سند ملی میں واپس پاکستان آ گیا۔

☆سوال: وطن واپس آ کر پہلے کیا اہم کام انجام دیا؟

ڈاکٹر مبین اختر: ۱۹۶۹ء کے زمانے میں ماہرین ذہنی امراض کے لیے بہت کم سرکاری نوکریاں تھیں، یعنی نہ ہونے کے برابر۔ صرف فوج میں ان کو میجر لیا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ چند سال فوج میں ملازمت کر لیتے ہیں مگر دوسری طرف میں مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر نہ صرف صحیح معنوں میں اسلام سے متاثر ہوا بلکہ جماعت اسلامی سے بھی متاثر ہو گیا تھا اور اس میں شامل ہو کر پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا اور فیصلہ کیا کہ کراچی میں جا کر پرائیوٹ پریکٹس کروں اور ساتھ ساتھ فوراً جماعت کے ساتھ بھی کام شروع کر دونگا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

☆سوال: کراچی نفسیاتی ہسپتال کی پاکستان میں کل کتنی شاخیں قائم ہیں؟

ڈاکٹر مبین اختر: ناظم آباد نمبر ۳، میں ہماری سب سے بڑی شاخ ہے۔ یہاں ہم نے ایک پرانی عمارت گرا کر ایک پانچ منزلہ عمارت بنائی ہے۔ اس کے علاوہ ایک شاخ شمالی ناظم آباد میں ہے جہاں ہم نے مردانہ شعبہ قائم کیا ہے۔ قائد آباد میں السید سینٹر میں شعبہ بیرونی اور داخلہ دونوں قائم ہیں۔ منشیات کا ہسپتال رمپا پلازہ، ایم اے جناح روڈ پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ حیدر آباد میں لطیف آباد نمبر ۴ میں ایک ہسپتال قائم ہے۔ ہمارے ہسپتال میں تقریباً سوا سو مریض داخل رہتے ہیں اور دو سو کے قریب شعبہ بیرونی میں آ کر علاج کراتے ہیں۔ ہسپتال ۲۴ گھنٹے کھلا رہتا ہے اور مریض کسی وقت بھی آ کر علاج کروا سکتا ہے۔ شعبہ داخلہ میں جہاں ائرکنڈیشن پرائیویٹ کمرے ہیں وہاں سیمی پرائیویٹ، جنرل وارڈ اور ایک انتہائی کم خرچے والا رعایتی وارڈ بھی ہے۔ اسی طرح شعبہ بیرونی میں جہاں پوری فیس دے کر بھی لوگ علاج کرواتے ہیں مگر غریبوں کے لیے مشورہ فیس ان کی حیثیت کے مطابق لی جاتی ہے جس کا وہ خود بھی تعین کر سکتے ہیں۔

☆سوال: ڈاکٹر مبین اختر ٹرسٹ کس سن میں قائم کیا اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

ڈاکٹر مبین اختر: غالباً ۲۰۰۰ء میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ نادار مریضوں کی ادویات اور داخلے کے اخراجات، اس سے پورے کیے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم ایسے مریضوں کو شعبہ بیرونی میں مفت دیکھتے ہیں اور شعبہ داخلہ میں بہت کم رقم پر رعایتی شعبہ بھی قائم کیا ہے مگر پھر بھی ادویات خریدنے کے لیے اور ان مریضوں کے داخلے کے لیے جو رعایتی شعبے کے اخراجات بھی برداشت نہیں

کر سکتے ان کے لیے مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆سوال: آپ نے کون کون سے ممالک کے سفر اختیار کیے ہیں؟

ڈاکٹر مبین اختر: امریکہ میں تو میں سات سال مسلسل رہا، ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک اور وہیں سے ذہنی امراض میں اعلیٰ سند حاصل کی۔

چنانچہ ۱۹۶۸ء میں جب سالانہ اجتماع ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ نام بدل کر اسلامک میڈیکل ایسوسیشن رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد امریکن خفیہ پولیس کو چین آ گیا۔ بعد میں یہ اسلامک میڈیکل ایسوسیشن تقریباً تمام مسلم ممالک میں پھیل گئی اور وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی اسی نام سے تنظیمیں بنالیں۔ پھر ۱۹۸۲ء میں اورلینڈو، فلوریڈا، امریکہ (Overland, Florida-USA) میں ان سب تنظیموں کے نمائندوں کا اجلاس ہوا اور ایک بین الاقوامی تنظیم بنائی گئی جس کا نام تھا ''فیڈریشن آف اسلامک میڈیکل ایسوسیشنز'' (Federation of Islamic Medical Association) اس اجلاس میں مجھے اس تنظیم کا صدر منتخب کیا گیا جس کی مدت بھی تین سال تھی، اس کے بعد مجھے مرکزی کونسل کا چیئرمین منتخب کیا گیا اور اس کی مدت بھی تین سال تھی۔ اس تنظیم کی ہر سال کہیں نہ کہیں نشست ہوتی تھی اور مجھے اس میں جانا لازمی تھا۔ اس سلسلے مجھے کئی ممالک میں جانا پڑا یعنی برطانیہ، مصر، سوڈان، اردن اور ترکی۔ بھارت میں بھی ایک سائیکاٹرک کانفرنس میں شرکت کی اور تاج محل دیکھنے کا موقع ملا۔ یوکوہاما، جاپان میں عالمی تنظیم برائے دماغی امراض کی سالانہ کانفرنس میں تحقیق پر مبنی ایک مقالہ پڑھا اور ہیروشیما شہر کو دیکھنے کا موقع بھی ملا جہاں امریکیوں نے دوسری عالمی جنگ میں ایک ایٹم بم گرایا تھا۔

☆سوال: آپ کا انٹرویو کہاں کہاں شائع ہوا اور ٹیلیویژن پر کون کون سے پروگرامات میں حصہ لیا؟

ڈاکٹر مبین اختر: میرے انٹرویو کئی ملکی اور غیر ملکی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر شائع اور نشر ہو چکے ہیں۔

☆سوال: آپ نے اپنی کتب رائلٹی پر کیوں نہیں شائع کیں؟

ڈاکٹر مبین اختر: میں نے یہ کتابیں مالی منافع کی غرض سے نہیں لکھی تھیں بلکہ میں ان کے ذریعے عوام میں اس موضوع پر غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتا تھا کیونکہ ان کی وجہ سے نوجوان بھی پریشان ہیں اور شادی شدہ جوڑوں میں بھی مسائل ہیں۔

☆سوال: وہ کون سا کام ہے جس کے لیے آپ کوشاں ہیں۔

ڈاکٹر مبین اختر: کئی کام ہیں، ذہنی امراض کے شعبے میں ایک ایسا ادارہ یعنی کراچی نفسیاتی ہسپتال قائم کیا ہے جہاں غریب لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق فیس دینی پڑتی ہے اور جو بالکل نہیں دے سکتے وہ مفت دیکھے جاسکتے ہیں۔ ادویات پاکستانی کمپنیوں کی اور سستی دی جاتی ہیں اور اس کام کے لیے ماہرین ذہنی امراض (Psychiatrists) کے علاوہ MBBS ڈاکٹروں، ایم اے نفسیات اور سوشل ورک سے پاس افراد کو تربیت دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرا اہم کام ملک کی ترقی کا ہے۔ اس کے لیے اردو کا نفاذ بہت اہم ہے اور اسی طرح جماعت اسلامی کی ایماندار اور دیانتدار قیادت کا ملک میں کامیابی کے بعد اسلامی نظام کا قیام بھی ملک کے مسائل حل کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

☆سوال: زندگی نے آپ کو کیا دیا؟

ڈاکٹر مبین اختر: میرے دادا ان لوگوں میں شامل تھے جو انگریزوں کے ظلم کے بعد بالکل غریب ہو گئے تھے۔ میرے والد بتاتے ہیں

کہ کئی وقت کا کھانا بھی کبھی نہیں ہوتا تھا اور رات کو دیئے جلانے کے لیے تیل کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ میرے والد نے زندگی میں بہت جدوجہد کی۔ پہلے B.Com کیا، پھر چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ مگر ہم نو بھائی تھے اس لیے گھر میں فراوانی نہیں تھی، کھانا پینا اور رہنا سہنا مشکل سے ہوتا تھا، یہاں تک کے نہانے کے لیے، کپڑے دھونے کا صابن اور تولیہ کی جگہ کھدر کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا۔ مجھے والد نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی اور اللہ نے مجھے تعلیم میں ترقی دی۔ میں ڈاکٹر بنا اور پھر امریکہ میں ذہنی امراض کی اعلیٰ سند حاصل کی اور سات سال امریکہ میں رہنے کے بعد پاکستان آیا اور یہاں ذہنی امراض کے شعبے میں خوب ترقی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اسلامک میڈیکل ایسوسیشن، فیڈریشن اور اسلامک میڈیکل ایسوسیشن کا پہلا صدر اور چیئر مین بھی رہا اور اس تنظیم کو پاکستان اور باقی مسلم دنیا میں فعال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پھر ۲۰۰۵ء سے ملک میں اردو نفاذ کے لیے تحریک نفاذ اردو کی شکل میں کوشاں ہوں۔ ملک میں دیانتدار قیادت ملک کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ سیاسی جماعتوں میں صرف جماعت اسلامی ہے جس کے پاس دیانتدار ارکان کی ایک بڑی کھیپ موجود ہے۔ جماعت نے ۱۹۴۷ء سے ہی ثابت کیا ہے کہ جماعت کو جب بھی ذمہ داری دی جاتی ہے وہ کوئی خیانت یا بددیانتی نہیں کرتے۔ میں ۱۹۷۱ء سے اس جماعت کا فعال رکن ہوں اور کوشش اور خواہش ہے کہ کسی طرح عوام تک یہ پیغام پہنچ جائے کے صرف جماعت اسلامی کے لوگ ہی اس ملک کو بے ایمانی، رشوت اور تنزلی سے بچا سکتے ہیں۔

☆سوال: آپ کا پسندیدہ شاعر اور شعر کیا ہے؟

ڈاکٹر مبین اختر: صرف انگریزی میں تعلیم ہونے کی وجہ سے میں اردو سے بہت محروم رہا خصوصاً اردو کی شاعری سے جس کا مجھے بہت قلق ہے۔ انگریزی شاعری مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ مگر چند سال پہلے جب اردو میں دلچسپی لینی شروع کی تو علامہ اقبال کی شاعری سب سے زیادہ پسند آئی کیونکہ وہ تقریباً قرآن کی تشریح ہے اور ایک اعلیٰ مقصد ان کے پیش نظر ہے۔ ان کا جو شعر مجھے بہت پسند ہے:

جمال پادشاہی ہو یا ہو جمہوری تماشا
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

☆☆☆

سید تہور علی زیدی

طبیب وشاعر

ڈاکٹر مہ جبیں زیدی

یہ رب تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے ہمارے خاندان کو ظاہری علوم اور باطنی خزانوں سے مالا مال فرمایا۔ ہمارا خاندانی سلسلہ سادات بارہ سے ہے۔ سید ابوالفضل فرزند ابوالفرح واسطی ہمارے سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان کی اولاد بادشاہان ہند سے اپنی علمی فضیلت، باطنی بصیرت اور سیاسی تدبر کی بدولت اعلیٰ مناصب پر فائز رہی۔

ہمارے دادا انوار الحق کے والد سید فرزند علی کے بڑے بھائی سید ولایت علی کے انتقال پر سرسید احمد خان بسلسلہ تعزیت سینٹھہ تشریف لائے اور سید فرزند علی سے ان کے ایک بیٹے کو تعلیم کے لیے مانگا۔ سید فرزند علی نے کہا ''بھائی میں اپنا گوشت جہنم کی آگ میں نہیں ڈال سکتا البتہ چندہ آپ جو فرمائیں پیش کر سکتا ہوں۔'' سرسید احمد خان نے ہر چند باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریزی پڑھنے سے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن وہ اپنی جگہ قائم رہے۔

سید فرزند علی کے بھائی حکیم سید عبدالغفور صاحب چھوٹے محل والے اپنے عہد کے ممتاز طبیبوں میں سے تھے اور ان کا تعلق قلعہ دہلی سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ مستقل اپنے وطن سینٹھہ میں ہی قیام پذیر رہے۔ سید فرزند علی اپنے منجھلے بیٹے انوار الحق کو ان ہی کا شاگرد بنوانا چاہتے تھے تاکہ طبابت کا پیشہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ خاندان میں برقرار رہے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ اللہ کو میرا نام چلانا منظور نہیں نہ میرے اولاد ہوئی نہ جس کو شاگرد بنایا زندہ رہا، اگر آپ کی خواہش ہے کہ یہ حکیم بنے تو اپنے عزیز حکیم قاضی سید نور عالم کے پاس اجمیر بھیجے دیتا ہوں۔ حکیم سید نور عالم سے عزیز داری تھی۔ سکندر آباد بلند شہر کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی جاگیریں تھیں لیکن وہ اجمیر میں مطب کیا کرتے تھے۔ طبیب کامل تھے اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ حکیم انوار الحق نے نہ صرف ان سے طبی تعلیم حاصل کی بلکہ ان کی ذہانت اور ذکاوت سے بھی فیض یاب ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں بلند شہر میں مطب شروع کر دیا حکیم جی سینٹھہ والے کے نام سے شہرت حاصل کی۔

حکیم سید انوار الحق کے صاحبزادے اور میرے والد بزرگوار سید تہور علی زیدی ۱۹۱۱ء میں اپنے آبائی گھر موضع سینٹھہ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور اردو کی آغا رفیق بلند شہری مؤرخ اسلام کے والد مولوی احمد اللہ صاحب سے حاصل کی جو اپنے دور کے جید عالم تھے۔ عربی کی تعلیم مدرسہ قاسمیہ کالی مسجد اوپر کوٹ بلند شہر میں پائی ۱۹۳۲ء گورنمنٹ ہائی اسکول بلند شہر سے میٹرک پاس کرنے کے بعد طبیہ کالج علی گڑھ میں داخلہ لے لیا، وہاں حکیم عبداللطیف لکھنوی اور ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ جیسے فاضل اور شفیق اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ ڈی آئی ایم ایس کی سند حاصل کر کے واپس بلند شہر آ گئے اور اپنے والد حکیم سید انوار الحق کے زیر

سا یہ مطب شروع کر دیا۔ اچھی تشخیص اور دست شفاء، خوش اخلاقی اور انسانی ہمدردی کی بدولت جلد ہی ہر دلعزیز ہو گئے۔ نہ صرف شہر بلکہ مواضعات کے لوگ بلا تمیز مذہب زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے لگے۔

علی گڑھ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ سے والہانہ لگاؤ پیدا ہوا اور بلند شہر کے مسلمانوں کی صفوں میں تنظیم و اتحاد کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ سٹی مسلم لیگ کے معتمد کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ قائداعظم کی بلند شہر تشریف آوری پر ان کے جلوس کو تاریخی اور یادگاری بنانے میں پورے انہماک اور محنت شاقہ سے کام کیا جس کو دیکھ کر ہندوؤں کے دلوں پر قائد اعظم کی مہر ثبت ہوگئی کیونکہ ایسا عظیم اور منظم جلوس کبھی مذہبی تہواروں میں بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی کی نشست کے لیے حلقہ میرٹھ کمشنری سے نوابزادہ لیاقت علی خان کو نامزد کیا۔ ان کے مقابلہ میں بیرسٹر کاظمی کو کانگریس نے ٹکٹ دیا اور جمعیت العلماء ہند پوری شدومد سے انکی کامیابی کیلئے کوشاں تھی، ساتھ ہی دولت کی بھی کمی نہ تھی۔ اس الیکشن میں بلند شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا حامد بدایونی تشریف لائے تاکہ کانگریسی زعما کی تقریروں کے اثر کو زائل کیا جائے۔ ان حضرات کو بلند شہر کی صورت حال سے واقف کرانے اور مشوروں میں والد صاحب پیش پیش رہے۔ اس کے بعد صوبائی اسمبلی میں کنور عمار احمد خان کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب کرانے کے لیے قریہ قریہ سے ووٹوں کو حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں گڑھ مکتیشور کے نہان کے میلے میں اچانک ہندوؤں نے آکر مسلمان تاجروں کو لوٹا اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کیا اور قصبے کی آبادی میں بھی قیامت صغریٰ برپا کر دی۔ حد یہ کہ کانگریس کے صدر بابو نورالدین صاحب کے گھر کو بھی نہیں بخشا۔ اس سانحہ کی اطلاع ملتے ہی بلند شہر سے مجتبیٰ خان، مولوی فضل الرحمٰن وغیرہ کو ساتھ لے کر گڑھ مکتیشور پہنچے۔ شہداء کی تدفین کی، زخمیوں کو امداد اور باقی لوگوں کو صبر اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کی۔ اس واقعے سے نہ صرف بلند شہر بلکہ پوری کمشنری متاثر ہوئی۔ مسلمانوں کی مدد کرنے کے جرم میں اکیس باحیثیت افراد کو جیل کی صعوبت اٹھانا پڑی جن میں مجتبیٰ خان، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی علیم الدین خان ایڈوکیٹ شامل تھے۔ والد صاحب طبیب ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے۔ ۱۴ اگست کو پاکستان وجود میں آیا اور مسلمانوں نے پاکستان کے نعرے لگا کر اپنی خواہشات کا بلاخوف وخطر اظہار کیا۔

یہ خاندانی روایت ہے کہ نام و نمود، شان و شوکت، کبر و نخوت کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ سادگی، خدا ترسی، فیاضی اور اتباعِ شریعت کو شعار بنایا۔ موضع سینٹھہ میں حویلی جو (بڑا محل) مشہور ہوئی بنوائی جس کا صدر دروازہ اس قدر بلند تھا کہ ہاتھی مع ہودج کے اندر داخل ہوسکتا تھا۔ اس سے ملحق مسجد اور عیدگاہ کو پختہ کرایا لیکن ان پر نہ تعمیر وغیرہ کی کوئی عبارت کندہ ہے نہ کوئی ایسی بیاض چھوڑی جن سے ان اہم واقعات کا ذکر ہوتا۔ والد بزرگوار کی عادت میں بھی یہی باتیں موجود ہیں۔

۱۹۴۸ء میں حیدرآباد آئے اور مطب شروع کیا۔ ہندوستان میں جو سیاسی خدمات انجام دیں ان سے فائدہ حاصل کرنا تو درکنار، یہ دیکھتے ہوئے کہ اب سیاست جاہ پسندی اور مکر و فریب کا دوسرا نام ہے، سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ سندھ طبیہ کالج ۱۹۵۲ء جب موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اس کو اپنی آنریری خدمات دیں اور اچھے کالج کی سطح پر پہنچایا۔ آج کل بھی

اس کے آنریری پرنسپل ہیں۔طبی بورڈ پاکستان میں ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۶ء رکن کی حیثیت سے فن طب کی خدمت کی۔

شاعری کا جہاں تک تعلق ہے جس طرح ہمارے بزرگوں کا نمونہ کلام موجود نہیں' اسی طرح والد صاحب کی بیاض ''نمود صبح'' اگر شائع نہ کرائی جاتی تو آپ کی زندگی کا یہ پہلو گوشہ گمنامی کی نذر ہو جاتا۔آپ کی شاعری تصنع' قافیہ پیمائی اور بناوٹ سے پاک ہے۔صاف ستھرے خیالات ہیں۔محاسنِ شعری سے آراستہ لطیف و نفیس تصورات' پختگی اور برجستگی سلاست وخوش آہنگی سے مرصع الفاظ ومحاورات کا صحیح انتخاب ہے۔از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق پورا کلام تاثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ہر قاری اور سامع اپنے ذوق سلیم کے مطابق اس سے سرور حاصل کر سکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی ''زیدی صاحب ۔

تہہ دامانِ طوفاں ہی گہر ملتے ہیں اے زیدی
کوئی یہ بات پہنچا دے سبک سارانِ ساحل تک

مجھے زیدی صاحب کے یہاں کسی طوفان سے گزرے بغیر بے شمار گہر حاصل ہوئے۔آب دار خوش نما اور نگاہیں خیرہ کرنے والے گہر۔ان کی نعتوں اور غزلوں میں خلوص اور محبت کا نور ہے اور جذبات کا ایک ایسا تسلسل ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے''۔

بقول قمر جمیل ''زیدی صاحب کی شاعری ہماری تہذیب اور ہماری روایت کی آئینہ دار ہے۔اس تہذیب اور اس روایت کا مرکزی نکتہ عشق تھا۔زیدی صاحب کی شاعری اسی مرکزی نکتے کے اطراف گھومتی ہے۔عشق کے اظہار میں وہ رکھ رکھاؤ اور تہذیبی التزامات ہیں جنہوں نے اپنے کلام کو اور دلکش بنا دیا ہے ''نمود صبح'' آپ کی شاعری کا نمائندہ مجموعہ ہے۔آپ کی غزلوں میں اظہار کا بڑا سلیقہ ہے اور بے ہنری کے اس دور میں آپ کا کلام ایک روشن مثال ہے''۔

☆☆☆

سید عثمان غنی راشد

سید عثمان غنی راشد ایڈوکیٹ سے خصوصی ملاقات

سید صفدر علی/ سید خرم نظام

۵ دسمبر ۱۹۹۹ء یہ سید عثمان غنی راشد کے لئے نسبتا کم مصروف دن تھا۔لہذا ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ ان سے خصوصی ملاقات کی درخواست کی جائے اور ''رابطہ'' کے قارئین کے لئے ان سے ان کے نجی زندگی، عدالتی مصروفیات اوران کے خاندانی حالات سے متعلق بعض باتیں معلوم کی جائیں۔

سید عثمان غنی راشد ایسے باپ کے بیٹے ہیں جو قرآن مجید کے حافظ اور انتہائی نیک طبیعت، خدا ترس، کم سخن، کم آمیز، سیدھے سادے، سچے مسلمان تھے۔ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتیوں کی جو بعض صفات وخصوصیات بیان فرمائی ہیں ان میں سے اکثر کا ان کی زندگی میں مشاہدہ کیا جاسکتا تھا، یہی بات سید منصور عاقل کے والد حافظ قاضی سید حبیب اللہ (مرحوم) اور سید سیف الدین سیف کے والد حافظ سید حسام الدین احمد (مرحوم) اور بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔

وہ ایک ایسی ماں کے لائق سپوت ہیں جو بڑی مدبرہ، معاملہ فہم، بے ضرر، نیک طبیعت، خوش مزاج، بذلہ سنج اور عقل و دانش سے مالا مال خاتون تھیں۔ کیوں نہ ہوں آخر گلاؤٹھی کے سرسید حافظ سید شفیع الدین (مرحوم) کی دختر نیک اختر تھیں اور اپنے والد محترم سے عقل ودانش کا خوب خوب حصہ پایا تھا، سید عثمان غنی راشد کو باپ سے ورثہ میں خدا ترسی ملی اور ماں سے معاملہ فہمی، خوش مزاجی اور بذلہ سنجی۔

ادارہ اخوان السادات، گلاؤٹھی کے لئے سید عثمان غنی راشد کی عظیم خدمات ہیں۔وہ حقیقتاً ادارہ کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

۱۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۹۵ء کے ادارہ کے عام انتخابات میں تین سال کے لئے بلا مقابلہ صدر ادارہ منتخب ہوئے۔

۲۔ ادارہ کے سب سے زیادہ تاحیات ممبر بنائے۔ ان کے قریبی اعزہ میں کوئی ایسا فرد نہیں جو ادارہ کا تاحیات ممبر نہ ہو یہاں تک کہ ۱۰ اگست ۱۹۹۷ء کی مجلس منتظمہ کی ماہانہ نشست میں آپ نے اپنی چھ ماہ کی ننھی سی نواسی کو بھی تاحیات ممبر بنادیا۔

۳۔ اسی ماہانہ نشست میں آپ نے ایک ہی دن پندرہ تاحیات ممبر بنائے اور اس طرح گویا ۱۵,۰۰۰ روپے ادارہ میں جمع کرائے۔

۴۔ آج کل آپ ادارہ کی زکوۃ کمیٹی کے سربراہ ہیں۔ اس کمیٹی کا کام ادارہ کے متمول حضرات سے زکوۃ کی رقوم وصول کرنا اور ادارہ کے غریبوں محتاجوں، بیواؤں میں یہ رقم تقسیم کرنا ہے۔اس کمیٹی نے ۳۰ جون ۱۹۹۹ء کو ختم ہونے والے سال (یعنی گزشتہ سال کے رمضان المبارک کے مہینہ میں مبلغ ایک لاکھ چالیس ہزار) روپے ادارہ کے

مستحقین و بیواؤں میں تقسیم کئے، جن میں بڑی رقوم آپ کی اور آپ کے قریبی اعزہ کی تھیں۔

۵۔ آپ عرصہ تک برادری کے نئے شادی شدہ جوڑوں میں قرآن پاک کے تحائف پیش کرتے رہے ہیں۔

۶۔ وقتاً فوقتاً تقریب عید ملن میں آپ برادری میں مختلف قسم کے تحائف تقسیم کرتے ہیں۔

۷۔ ادارہ کو عطیات دینے والوں میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔ جولائی ۱۹۹۸ء کے اعداد وشمار کے مطابق آپ نے ادارہ کو مبلغ تین لاکھ چالیس ہزار روپے عطیات دیئے۔

۸۔ ادارہ اخوان السادات ایجوکیشنل ٹرسٹ کے قیام کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید ظفر زیدی کی طرح آپ کی مساعی بھی قابل تحسین ہیں۔ سادات برادری کی تعلیمی بہبود کا یہ منصوبہ جو نہ صرف موجودہ نسل بلکہ ان شاءاللہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی بیحد مفید ہوگا، توقع ہے کہ ضروری قانونی کاروائی کے بعد فروری ۲۰۰۰ء سے روبہ عمل ہو جائے گا۔

۹۔ اسکول، کالج و یونیورسٹی میں زیر تعلیم برادری کے بعض طلبہ و طالبات کو بہتر نتائج کی بنیاد پر اور برادری کے بعض لائق افراد کو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کی نمایاں قومی خدمات کی بنیاد پر آپ نقد انعامات دیتے رہے ہیں۔ جب کبھی ادارہ کو کوئی کام کرتے ہوئے فنڈز کی کمی محسوس ہوئی، یہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے صف اول میں ہوتے ہیں۔

۱۰۔ اپنے مرحوم والدین، اپنی اہلیہ کے مرحوم والدین، اپنے چھوٹے بھائی سید مظفر سلیم کی یاد میں آپ نے صحت و تعلیم کے فروغ کے لئے ادارہ میں میموریل فنڈز قائم کئے ہیں۔

ان کی انہی خدمات کے پیش نظر ان سے اس تفصیلی ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ اس ملاقات میں ان کی نجی زندگی اور ان کے خاندان وغیرہ کے حالات کے متعلق جو گفتگو ہوئی وہ سوال و جواب کی صورت میں ''رابطہ'' کے قارئین کے لئے پیش کی جارہی ہے۔

☆ سوال: عثمان صاحب اپنے کچھ خاندانی حالات بیان فرمائیں؟

جواب: میرے والد محترم کا اسم گرامی سید عبدالغنی اور والدہ محترمہ کا نام سیدہ نواب بانو تھا۔ یہ دونوں اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میرے والد پیشہ کے اعتبار سے اکاؤنٹینٹ تھے اور ریاست بہاولپور میں مقیم تھے، جہاں میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان میں حفظ قرآن مجید سے خصوصی شغف رہا ہے۔ میرے دادا، میرے نانا اور میرے والد سبھی حافظ قرآن تھے، مرحوم دادا بزرگوار کا نام حافظ سید رحمت علی اور نانا مرحوم کا نام حافظ سید شفیع الدین تھا۔ اسی طرح میرے دونوں تائے بھی حافظ قرآن مجید تھے، یعنی حافظ سید عبدالولی (سید منظور علی محترمہ خورشیدہ و محترمہ کوثر کے والد) اور حافظ سید عبدالعلی (پروفیسر سید عبدالحی طاہر کے والد) میرے چچا (سید اسد علی، سید زاہد علی، سید ارشد علی، سید راشد علی کے والد) سید عبدالمغنی بڑے خوش مزاج تھے، اپنی بذلہ سنجی سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے، میری تین پھوپیاں سیدہ مقبول فاطمہ، سیدہ محفوظ فاطمہ اور سیدہ کنیز فاطمہ تھیں۔

میرے دو ماموں سید ریاض الدین ریاض جو راجہ کے نام سے مشہور تھے۔ تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے اور اچھے شاعر تھے اور اسی طرح میرے دوسرے ماموں ڈاکٹر سید شمیم الدین جنہوں نے شکاگو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور پھر شکاگو یونیورسٹی، انڈیانا یونیورسٹی، نارتھ امریکہ اور کینیڈا کی مختلف جامعات میں تدریسی خدمات انجام دیں، اب اللہ کو پیار ہو چکے ہیں جبکہ

میرے ایک ماموں سید فصیح الدین وینزویلا (جنوبی امریکہ) میں، دوسرے ماموں سید رضی الدین دبئی میں، تیسرے ماموں سید نسیم الدین ہاشمی سعودی عرب میں اور چھوٹے ماموں سید وسیم الدین ہاشمی کراچی میں ایک اکاؤنٹنگ فرم ''ہاشمی ایسوسی ایٹس'' کے پروپرائیٹر ہیں۔

☆سوال: اپنے بہن بھائیوں کے متعلق کچھ بتائیں؟

جواب: میرے ایک چھوٹے بھائی سید مظفر سلیم ۱۹۵۵ء میں انتقال کر چکے ہیں، اب ہم چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ بہنیں سیدہ قمر شہناز (اہلیہ سید محمد احمد واسطی) سیدہ عذرا کمال (اہلیہ سید نصرت کمال جعفری) اور سیدہ نسرین زیدی (اہلیہ سید آفتاب عالم زیدی ووالدہ سید بدر عالم زیدی) اور بھائی پروفیسر سید عرفان رحمت، سید اظہار رحمت اور سید انجم پرویز ہیں۔ بھائی عرفان کالج پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ اظہار رحمت بھی تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے اور اب ریٹائرڈ ہیں۔

☆سوال: بیگم آمنہ نزہت (ملکہ) کے بارے میں کچھ بتائیں، اور اُن سے کیسے شادی ہوئی؟

جواب: ملکہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا تعلق حکیم اجمل خان دہلوی کے خاندان سے ہے۔ آپ کے دادا حکیم التماس حسین گوالیار کے شاہی حکیم تھے۔ ہم لوگ بھاولپور میں رہتے تھے۔ ملکہ ہمارے گھر سے کچھ فاصلہ پر میرے چھوٹے نانا سید نظام الدین مرحوم (برادر حافظ سید شفیع الدین ووالد ایڈوکیٹ سید آصف جمیل) کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ ہمارے بزرگوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس پڑوس کے رشتہ کو خاندان کے زیادہ مضبوط رشتوں کی شکل دے دی جائے۔ چنانچہ اس رشتہ کی سلسلہ جنبانی شروع ہوگئی اور یہ رشتہ ہوگیا۔ کچھ یہی جذبہ اس وقت کارفرما تھا جب میرے ہم زلف ایڈوکیٹ سید آصف جمیل کے لئے ملکہ کی بہن اطہر نزہت کے رشتہ کی سلسلہ جنبانی ہوئی اور وہ رشتہ طے پایا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں میری شادی ہوئی اور الحمدللہ ہماری ازدواجی زندگی انتہائی کامیاب ہے۔

☆سوال: اپنے بچوں کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بڑی نائلہ حماد ڈاکٹر ہے اور نیوجرسی امریکہ میں پریکٹس کرتی ہے۔ نائلہ کی شادی جولائی ۱۹۸۵ء کو محترم محمود واسطی صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید حماد واسطی سے ہوئی۔ دوسری بیٹی سیدہ انیلہ فواد ہے، کراچی یونیورسٹی سے انگلش میں ماسٹرز کیا اور کینیڈا کی ایک پروفیشنل فرم سے منسلک ہیں۔ انیلہ کی شادی عبدالقیوم صدیقی کے فرزند فواد صدیقی سے ہوئی۔ تیسری بیٹی عائشہ نعمان بی کام ایل ایل بی ہے۔ ان کی شادی نعمان ارشد سے جو نیوی میں ملازم ہیں ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ بیٹا سید عاطف عثمان نے ۱۹۹۴ء میں IBA سے ایم بی اے کیا۔ Angro Urea اور سٹی بینک میں کچھ عرصہ ملازمت کی، آج کل امریکہ میں نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی میں مزید تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔

☆سوال: کچھ اپنی عدالتی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

جواب: ۱۹۶۷ء میں پاکستان سپریم کورٹ میں بحیثیت ایڈوکیٹ میرا اندراج ہوا۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۰ء میں نے ملازمت کی اور مارچ ۱۹۸۰ء میں ایڈوکیٹ جنرل (سندھ) کے عہدہ سے مستعفی ہوا اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کردی اور بعض معرکۃ الآراء کیسوں میں

قانونی پیروی کی ۔جب سے اب تک پرائیویٹ پریکٹس کررہا ہوں اور بعض ممتاز قومی اداروں مثلا حبیب بینک، یونائٹڈ بینک اور PICIC وغیرہ کے پینل پر ہوں اور اپنے پیشہ میں اچھی شہرت کا مالک ہوں۔

یہ انٹرویوادارہ اخوان السادات کے سہ ماہی نیوز لیٹر ''رابطہ'' میں آج سے سولہ برس قبل شائع ہوا تھا

☆☆☆

ڈاکٹر شاہدہ زیدی

ڈاکٹر شاہدہ زیدی (سوانحی خاکہ)

نسیم الدین ہاشمی

سادات گلاؤٹھی اور سینٹھ میں بے شمار شخصیات ہیں جنہوں نے اپنی قابلیت، علم اور افکار سے شہرت اور احترام حاصل کیا، انہی میں سے ایک ممتاز شخصیت ڈاکٹر سید ظفر زیدی (مرحوم) کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر شاہدہ زیدی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کا تعلق بلند شہر (یوپی) انڈیا سے ہے۔ آپ کے والد محترم عبدالولی صدیقی نے میرٹھ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد انڈین پولیس سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے جن کو ۱۹۴۶ء میں بلند شہر میں ریزرو پولیس انسپکٹر تعینات کیا گیا۔ آپ کے دادا مولوی عبدالمغنی کا نام ان شخصیات میں شامل ہے جنہوں تقسیم سے پہلے اپنے علاقے میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے عملی جدوجہد کی اور ان مٹ نقوش چھوڑے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بلند شہر میں مسلم ہائی اسکول کی بنیاد رکھی، جس سے ہزاروں لوگ تقسیم سے قبل اور بعد میں مستفید ہوئے۔ یہ پہلا ادارہ تھا جس نے نہ صرف بلند شہر کے لئے بلکہ ضلع کی تمام بستیوں کے مسلمانوں کے لئے تعلیمی سہولت مہیا کی۔ محترم تہور علی زیدی، ڈاکٹر ظفر علی زیدی، ڈاکٹر سرفراز زیدی، ڈاکٹر سعید اختر زیدی، منصور عاقل اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید شمیم الدین اسی ادارے کے تعلیم یافتہ تھے۔ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے آج یہ ادارہ ڈگری کالج بن چکا ہے اور ڈھائی ہزار سے زائد طلبہ اس میں بیک وقت زیرِ تعلیم ہیں۔

ڈاکٹر شاہدہ زیدی ۷ فروری ۱۹۴۴ء کو اتر پردیش کے معروف شہر آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۹۴۹ء پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو مسکن بنایا۔ آپ کے والد نے اپنی چاروں بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم سینٹ جوزف کونوینٹ اسکول میں ہوئی۔ سینٹ جوزف کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور ۱۹۶۷ء میں DOW میڈیکل کالج سے MBBS کی ڈگری حاصل کی۔ میڈیکل کی تعلیم کے دوران آپ نے نہ صرف ایک ذہین طالبہ کے طور پر اپنا لوہا منوایا بلکہ کھیل کے میدان میں بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مسلسل پانچ سال کالج کی ایتھلیٹک چیمپین رہیں۔ تین سال ٹینس چیمپین کا اعزاز بھی آپ نے اپنے سر رکھا۔ نیشنل ایتھلیٹک چیمپین شپ میں ساؤتھ زون کی نمائندگی کی۔ نیشنل چیمپین شپ میں کوارٹر فائنل تک رسائی حاصل کی۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۳ء تک ۱۶ سال جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر (JPMC) جس کا شمار پاکستان کے اعلیٰ ترین اداروں میں ہوتا ہے، سے منسلک رہیں، اس دوران آپ نے Obstetrics & Gynaecology (امور متعلقہ وضع حمل اور علم امراضِ نسواں) میں Specialization کیا اور ۱۹۷۲ء میں CPSP (کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز۔ پاکستان) سے فیلو شپ حاصل کی۔ یہاں آپ نے اپنی Clinic کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ JPMC کے پوسٹ گریجویٹ اور سندھ

میڈیکل کالج (SMC) کے انڈر گریجویٹ طالب علموں کی تدریس اور ٹریننگ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کالج آف فزیشن اور سرجنز (CPSP) میں جو بلاشبہ پاکستان کا اعلیٰ ترین میڈیکل تربیتی ادارہ ہے، آپ کی انتظامی اور تعلیمی خدمات مسلمہ ہیں، کالج کونسل کی دو مرتبہ آپ رکن منتخب ہوئیں۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۱ء تک مسلسل فیلوشپ امتحان کی نگراں رہیں۔

۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء Journal of College of Physicians and Surgeons, Pakistan کی بانی ایڈیٹر بھی رہی ہیں۔ ۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۰ء کالج کی بلیٹن کی ایڈیٹر رہیں۔

میڈیکل فیلڈ میں آپ کی خصوصی دلچسپی (Safe Motherhood) (SM) اور (RH) (Reproductive Health) میں ہے۔ ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۰ء تک بارہ سال کالج آف فزیشن اینڈ سرجنز پاکستان میں آپ نے طالب علموں کی کثیر تعداد کو اس میدان میں خصوصی تربیت فراہم کی۔ ۱۹۹۱ء میں آپ فیڈریشن آف Obstetrics & Gynaecology کی کو چیئر پرسن مقرر ہوئیں۔ اس دوران آپ نے ملک میں (SM) اور (RH) کی ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۵ء تک آپ اس ادارہ کی صدر رہیں۔ میٹرنل اور پیرینٹل ہیلتھ، فیملی پلاننگ، MCH، سروس ڈیلیوری اور ری پروڈکٹیو ہیلتھ (RH) جیسے موضوعات پر آپ چار کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ۱۹۷۹ء تک کراچی میں الٹراساؤنڈ (Ultrasound) کا کوئی ادارہ نہ تھا۔ یہ اعزاز صرف آپ کو حاصل ہوا جب آپ نے کراچی میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی، اور Pioneer کہلائیں۔ پانچ سال بعد آپ نے سونوگرافی (Sonography) کا پہلا تربیتی ادارہ قائم کیا۔ یہ پاکستان کی واحد تربیت گاہ تھی جو آج بھی کراچی میں کشمیر روڈ پر پی ای سی ایچ ایس میں قائم ہے۔ ۱۰۰۰ ہزار سے زائد ڈاکٹر اس ادارہ سے تربیت حاصل کر کے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ ادارہ میں قائم الٹراساؤنڈ کلینک کراچی کا اعلیٰ ترین جدید سہولتوں سے آراستہ کلینک ہے جو ۳۵ سال سے شہر کی خدمت کر رہا ہے۔ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے باعث آپ مختلف قومی اور بین الاقوامی سائنسی اداروں میں اعزازی عہدوں پر فائز رہیں جس کا مختصر احاطہ پیش خدمت ہے:

۱۔ ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف الٹراسونوگرافی اینڈ الٹراساؤنڈ کلینک کراچی۔

۲۔ ریجنل کوآرڈینیٹر ساؤتھ ایشیا FIGO

۳۔ ممبر سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی۔ انٹر گروتھ 21st سینچری۔ ایک بین الاقوامی پروجیکٹ جس کو بل گیٹس فاؤنڈیشن نے مالی مدد مہیا کی۔

۴۔ صدر ایسوسی ایشن آف مدرس اینڈ نیو بورن (AMAN) ایک NGO تنظیم جو ۲۰۰۷ء میں قائم ہوئی۔

۵۔ اعزازی ممبر۔ نیشنل کمیٹی برائے میٹرنل اینڈ نیونیٹل ہیلتھ (NCMNH) وزارت صحت پاکستان

۶۔ اعزازی ممبر مڈوائری ایسوسی ایشن آف پاکستان۔

۷۔ سابق صدر اور پیٹرن الٹراساؤنڈ سوسائٹی آف پاکستان

۸۔ ممبر ایڈوائزری کمیٹی ایشیا اوسینا فیڈریشن آف آبسٹیٹرک اینڈ گائناکولوجی (AOFOG)۔

۹۔ ممبر روٹری کلب کراچی۔

آپ کی تصانیف:

۱۔ Abdominal Ultrasound for Sonologist & Clinicians جولائی ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ Real Time Ultrasound in Obstetrics & Gynaecology ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔
۱۹۸۹ء میں نیشنل بک کونسل گورنمنٹ آف پاکستان نے اس کتاب کو اعزاز سے نوازا۔

۳۔ A Manual of Reprdutive Health Training in Pakistan ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔

میڈیکل فیلڈ میں آپ کی شاندار خدمات کو سراہتے ہوئے ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی نے ۱۲ اگست ۲۰۱۴ء کو Achievement Award Life سے نوازا۔

☆☆☆

جاوید اقبال

خودنوشت۔ جاوید اقبال

خاندان: میری پیدائش ۱۲ستمبر ۱۹۴۲ءکومشرقی پنجاب کے شہرانبالہ میں ہوئی۔والدصاحب کا نام نورالحسن تھا اور دادا کا نام دیوان احمد علی ۔میری دادی نے میرا نام انوارالحسن رکھا، البتہ والد صاحب جوشاعرمشرق علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے، اپنے نام میں اقبال کا اضافہ کیا اور میرا نام ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال کے نام پر رکھا اوراسی نام سے اب میری پہچان ہے۔میرے تین بھائی بدرالحسن، خالدحسن اور شوکت اقبال حیات ہیں۔ایک بھائی ضیاء الحسن کا انتقال ہو چکا ہے۔میری ایک ہی بہن انجم ہیں۔ان کی شادی والدصاحب کے تایازاد بھائی سید محمد طیب برنی مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر پروفیسر محمد عاقل برنی سے ہوئی ہے جو کراچی یونیورسٹی کے کمپیوٹرڈیپارٹمنٹ کے سربراہ رہ چکے ہیں اوراب سی بی ایم (CBM) سے منسلک ہیں۔

ہمارے خاندان کا تعلق بلندشہر کے قصبہ دھولانہ سے تھا اور وہاں میرے پردادا عبداللطیف نے گھر بھی تعمیر کیا تھا۔ان کی قبر بھی وہیں پر ہے۔میرے دادا احمد علی مشرقی پنجاب کی ایک ریاست ''بوریہ'' کے دیوان تھے،یعنی مالی اورانتظامی امور کے ذمہ دار تھے اوراسی مناسبت سے دیوان احمد علی کے نام سے جانے جاتے تھے۔دادا صاحب کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوااور بوریہ ہی میں دفنائے گئے،ان کے انتقال کے بعد ہمارے خاندان نے پہلے جگادھری اور پھرانبالہ میں سکونت اختیار کی،والدصاحب کی عمراس وقت صرف ۱۲سال تھی،لہٰذاان کی پرورش میرے تایا سید مقصود علی صاحب نے کی،والدصاحب نے انبالہ مسلم ہائی اسکول اور کالج سے تعلیم مکمل کر کے ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت اختیار کی۔میری والدہ محترمہ کا نام نفیس فاطمہ تھا اور وہ مقیم سراوہ (ہاپوڑ) ضلع میرٹھ کے زمیندار حافظ غنی اکبر کی بیٹی تھیں۔

ہجرت: والدصاحب کا تبادلہ لکھنؤ ہوا جو ہمارے لئے اجنبی شہر تھا۔پاکستان بننے کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں ہم راولپنڈی آ گئے۔انبالہ سے بھی باقی خاندان ہجرت کر کے راولپنڈی آ گیا۔البتہ ایک تایا سید داؤد علی جو پولیس میں تھے، جھنگ جا کر آباد ہوئے ۱۹۵۲ء کے بعد آہستہ آہستہ سب لوگ کراچی آ گئے اوراس شہر کو اپنا گھر بنالیا۔میرے ایک تایا مرحوم سید امراؤعلی اور دو پھوپیوں کا خاندان ہندوستان سے نہیں آیا اور یہ لوگ اب بھی سیٹھ گلاؤٹھی ضلع بلندشہر اور علی گڑھ میں آباد ہیں۔

تعلیم: پاکستان آنے کے وقت میری عمر پانچ سال تھی۔تعلیم کا آغاز پہلے عربک مسلم ہائی اسکول اور پھر سینٹ پیٹرک اسکول مری روڈ راولپنڈی سے ہوا۔کراچی آنے کے بعد گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول میں داخلہ لیا،اسی اسکول سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک پاس کیا اور اس کے بعد سندھ مسلم کالج سے ۱۹۶۱ء میں بی کام پاس کیا۔ ۱۹۶۲ء میں لندن چلا گیا اور وہاں سے چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اکاؤنٹس (CIMA) کے امتحانات پاس کئے۔ پہلے ایسوسی ایٹ اور پھر ۱۹۷۵ء میں فیلوشپ کی سند عطا ہوئی۔اس کے علاوہ پاکستان کے انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ مینجمنٹ اکاؤنٹس کی طرف سے بھی فیلوشپ مل چکی ہے۔لندن میں قیام اور تعلیم کے

دوران میرے ماموں حافظ سید مسرور الحسن صاحب کی معاونت اور رہبری بہت مددگار ثابت ہوئی، حافظ صاحب لندن میں پاکستانیوں میں بہت مقبول ہیں۔

شادی اور فیملی: ۱۹۶۹ء میں میری شادی محترمہ نشاط ناظم دختر جناب سید محمد جمیل مرحوم سے ہوئی، میری بیوی کے بڑے بھائی صاحب سید محمد کفیل مرحوم تھے جو خاندان میں بہت مقبول تھے۔اس کے علاوہ اخوان السادات کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ان کے چھوٹے بھائی میجر سید محمد شکیل اور سید محمد وکیل ہیں، جو حبیب گروپ کے ساتھ بحیثیت فائننس ڈائریکٹر منسلک ہیں۔ ہندوستان میں ان کا خاندان شکوہ آباد ضلع آگرہ میں آباد تھا۔اگرچہ ان کا تعلق خاص گلاؤٹھی ضلع بلند شہر سے ہے۔

ہمارے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ بڑے بیٹے عاصم نے مانچسٹر سے ایم ایس فائننس کی ڈگری حاصل کی ہے، جب کہ معتصم اور نعیم نے آئی بی اے کراچی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔بیٹی عفت نے انٹرس ویلی اسکول کراچی سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈگری حاصل کی ہے۔سب بچوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں جو ہمارے لئے باعث مسرت ہیں۔عاصم دبئی میں قیام پذیر ہیں، وہ اسٹنڈرڈ چارٹرڈ بینک میں کریڈٹ پالیسی منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔دوسرے بیٹے معتصم بھی اسی بینک میں سنگاپور میں ہیں اور آج کل ایم ڈی ٹرانزیکشن بنکنگ کے عہدے پر ہیں۔چھوٹے بیٹے نعیم کراچی میں ہمارے ساتھ ہیں اور پاک کویتا انوسٹمنٹ کمپنی میں بحیثیت V.P کام کررہے ہیں۔بیٹی عفت کے شوہر ہمایوں نے لندن سے چارٹرڈ اکاؤنٹس کیا ہے اور وہ E&Y ٹورنٹو میں بحیثیت پارٹنر کام کررہے ہیں۔

ملازمت: لندن سے تعلیم مکمل کر کے واپس آنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی میں بحیثیت اکاؤنٹنٹ ملازمت کی اور کراچی اور جہلم فیکٹری اور ہیڈ آفس میں کام کیا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹورازم ڈیولپمینٹ کارپوریشن میں بحیثیت منیجر اکاؤنٹس کام شروع کیا۔ ۱۹۷۳ء میں بھائی کفیل صاحب تنزانیہ چلے گئے اور مجھے بھی تنزانیہ ٹورسٹ کارپوریشن میں چیف اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ ۱۹۷۷ء میں اس کارپوریشن کو ورلڈ بینک کی طرف سے قرضہ ملا اور اس کے حساب کتاب کے لئے میرا انتخاب بطور فائننس ڈائریکٹر کے ہوا۔ یہ پروگرام ۱۹۸۵ء تک چلا۔اس کے مکمل ہونے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ پاکستان واپس چلے جائیں۔

پاکستان واپس آکر پہلے پرل کانٹینینٹل ہوٹل کراچی میں فائنانشیل کنٹرولر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۶ء میں فلپس الیکٹرکل کمپنی میں گروپ فائننس منیجر کے عہدے پر کام شروع کیا۔ ۱۹۸۹ء میں میری ترقی بحیثیت فائننس ڈائریکٹر کے ہوگئی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ کسی پاکستانی کو یہ اعزاز حاصل ہوا اور نہ اس سے پہلے ہمیشہ ہالینڈ کے باشندے اس عہدے پر فائز ہوتے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں میری ترقی بحیثیت منیجنگ ڈائریکٹر اور چیئرمین بورڈ کے عہدے پر ہوگئی۔ ۲۰۰۱ء میں کمپنی سے ریٹائرمنٹ ہوگیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد پہلے ایک پرائیویٹ کمپنی (Azfam Technologies) میں بحیثیت ڈائریکٹر کام کیا، پھر ۲۰۰۴ء میں KPMG آڈیٹر کی ایک پرانی کمپنی (FORMER CO) ٹی ایچ کے ایسوسی ایٹس کے ساتھ بحیثیت CEO اور ڈائریکٹر کے عہدے پر کام شروع کیا جہاں میں اب تک کام کررہا ہوں۔

بورڈ ڈائریکٹر: پہلے تنزانیہ میں ٹورسٹ کارپوریشن کے مختلف بورڈز پر بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دیں۔ پاکستان میں فلپس کمپنی

کے بورڈ ز کے علاوہ کراچی اسٹاک ایکسچینج (KSE)۔ Wyeith فارماسیوٹیکل،کریسنٹ اسٹیل کے بورڈز پر بحیثیت Non Executive ڈائریکٹر کے کام کیا۔اب میں ڈائریکٹر THK بورڈ کے علاوہ سامبا بینک پاکستان (SAMBA BANK) اور فرینچ کمپنی Sanofi Aventis فارماسیوٹیکل کے بورڈز پر بحیثیت انڈیپنڈنٹ ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہاہوں۔

سماجی خدمات: تقریباً چھ سال مینجمنٹ ایسوسی ایشن آف پاکستان میں بحیثیت سیکریٹری، وائس پریسیڈنٹ اور پھر پریسیڈنٹ خدمات انجام دیں۔تین سال ICMA کی کونسل پر حکومت پاکستان کی طرف سے ممبر کونسل کے طور پر خدمات انجام دیں ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۸ء تک اپنے انسٹی ٹیوٹ CIMA لندن کے کراچی چیئر (Reprensetive) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۹ء میں فلپس کے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تعلیمی ٹرسٹ کی بنیاد رکھی جو پروفیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے نام سے رجسٹر ہوا ہے۔ میں اس کے ٹرسٹی (TRUSTEE) کی اور بورڈ گورنر کی حیثیت سے منسلک ہوں۔

ذاتی شوق: فارغ اوقات میں کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے ہے۔خاص طور پر اسلامی تاریخی کتابیں، خودنوشت سوانح حیات ،شعراء کا کلام، سفرنامے اور پولیٹیکل سائنس پر کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔اس کے علاوہ کھیلنے کا شوق بھی رہا۔کرکٹ، اسکوائش اور پیرا کی کے بعداب پچھلے سال سے ہفتہ میں کم ازکم دومرتبہ گولف کھیل رہاہوں۔میرے تینوں بیٹے بھی یہ کھیل شوق سے کھیلتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے زندگی کا سفر بہت اچھا گزرا اور دعا گوہوں کہ باقی وقت بھی خیر وعافیت اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ تمام ہو۔اخیر میں صرف یہ کہہ سکتاہوں۔

بہت آگے گئے   باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

۲۰ مارچ ۲۰۱۵ء

☆☆☆

سید محمد احمد واسطی

سید منصور عاقل

مبارک ہیں وہ لوگ جو بزرگوں کے اوصاف حمیدہ کو اپنی ذات اور شخصیت کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں اور خاندانی ورثہ کی پاسداری ان کی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ایسی ہی ایک مبارک ہستی سید محمد احمد واسطی تھے جنہوں نے اپنے والد بزرگوار سید محمود احمد واسطی کی رواداری ،ملنساری،اقرباء پروری،اخلاص ویگانگت اور محبت و بے لوثی جیسی تمام خوبیاں اپنائیں اور اپنی نرم وشیریں گفتاری سے ان میں اضافہ کیا۔سید محمد احمد واسطی انہی اوصاف کے سبب اعزہ میں بے حد مقبول تھے اور دل سے احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔انہوں نے اعلی تعلیم حاصل کی اور حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے لیکن اپنے مثالی اخلاق اور منکسر مزاجی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا،سماجی بہبود کے کاموں میں اس قدر دلچسپی لیتے کہ ان کی ایسی مصروفیات ان کی حد تک عبادت کا درجہ اختیار کر گئیں تھیں۔

۱۶ جون ۱۹۲۹ء کو گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے لیکن چونکہ والد اپنے روزگار کے سلسلے میں ریاست جودھپور میں مقیم تھے اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم جودھپور ہی میں ہوئی،قصبہ گلاؤٹھی آنا جانا کثرت سے رہا،یہی وجہ تھی کہ محمد احمد واسطی کو اپنے مولد ومنشاء گلاؤٹھی سے خاص لگاؤ تھا اور اپنے تمام بہن بھائیوں میں عزیز واقارب سے مراسم استوار رکھنے میں وہ سب سے زیادہ پیش پیش رہے۔۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے چنانچہ تعلیم کراچی میں ہی مکمل کی۔آپ کی شادی حافظ سید شفیع الدین کی نواسی سے ۹ جولائی ۱۹۸۱ء کو بہاولپور میں ہوئی۔آپ کے خسر حافظ سید عبدالغنی ان دنوں بہاولپور میں بسلسلۂ روزگار مقیم تھے۔

سید محمد احمد واسطی کا عہد طالب علمی نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں امتیازات سے بھرا پڑا ہے۔آپ نے کراچی یونیورسٹی سے بی اے آنرز کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی اور ۱۹۵۹ء میں کراچی ہی میں ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں وفاقی وزارت تجارت کے تحت ملازمت کا آغاز کیا اور بعد میں ملک کے اندر اور باہر اہم مناصب جلیلہ پر فائز رہے۔دنیا کے مختلف ممالک میں پاکستانی صنعتوں کی نمائش کے انتظام وانصرام کے منتظم اعلی رہے،اہم سرکاری خدمات کے سلسلہ میں ۱۹۶۷ء میں لندن ۱۹۷۱ء میں گھانا اور جدہ ۱۹۷۲ء میں بغداد (عراق) اور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک سات سال مسلسل دبئی میں پاکستان کے کمرشیل کونسلر رہے۔آپ ۱۹۸۵ء میں چین بھی گئے اور اس طرح بیرونی دنیا میں اپنے وطن عزیز پاکستان کا نام روشن کیا۔۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک سکریٹری کوٹن ایکسپورٹ کارپوریشن رہے۔آپ کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ پر تعینات کر دیا گیا،جہاں سے آپ ۱۹۸۹ء میں ساٹھ سال کی عمر پا کر ریٹائر ہوئے۔

آپ کو ابتداء سے کھیلوں سے خاص شغف رہا۔اسکول کے زمانے میں بھی اسکول کی ٹیم کے کپتان تھے اور ایل ایل بی کی

تعلیم کے دوران بھی ایس ایم لاء کالج کراچی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان رہے۔معاشرتی بہبود کے کاموں سے دلی لگاؤ تھا اور خدمت خلق کو عبادت سمجھتے تھے چنانچہ جب ان کی رہائش ملیر میں تھی تو آپ رفاہِ عام سوسائٹی کے پانچ سال تک چیئرمین رہے۔دوبار ادارہ اخوان السادات گلاوٹھی کے صدر رہے۔ان کے دور میں ادارہ نے سماجی بہبود کے متعدد قابل ذکر کام انجام دیئےلیکن آپ کی عمر نے مزید وفا نہ کی اور ۱۱ اگست ۱۹۹۶ء کو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

☆☆☆

ڈاکٹر شجاعت علی برنی

حارث نصیر

ڈاکٹر شجاعت علی برنیؒ نہ صرف میرے گہرے دوست، راز داں اور عزیز ساتھی تھے بلکہ آپ سے میری رشتہ داری بھی تھی۔ آپ کی والدہ میری والدہ کی خالہ تھیں۔ اس حساب سے آپ میرے ''ماموں'' بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بچپن سے ہی پڑھائی کا شوق تھا، آپ کا بچپن شہداد کوٹ، میر پور خاص میں گزرا جہاں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں آپ حیدر آباد سندھ منتقل ہوئے جہاں آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔

سب سے بڑے بھائی عشرت علی برنیؒ کا کراچی میں نوجوانی میں انتقال ہوا۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر صاحب تھے، تیسرے ڈاکٹر فرحت علی برنی تھے جبکہ سب سے چھوٹے بھائی راحت تھے، ان کا بھی انتقال کم عمری میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ سب کو غریق رحمت کرے، آمین۔ آپ کی دو بہنیں سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے والد سرکاری ملازم تھے، اس خاندان کا تعلق اوسط طبقے سے تھا۔ آپ کے والد کا مختلف شہروں میں ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا، معاشی طور پر کمزوری کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ڈاکٹر فرحت علی برنی جیسا ٹیلینٹ ہمارے پورے خاندان میں نہیں تھا۔ وہ بلا کے ذہین تھے، انہوں نے اپنے والدین کی بہت خدمت کی۔

ڈاکٹر شجاعت علی برنی نے ایم بی بی ایس کے بعد کراچی کے سول اسپتال میں ملازمت کی پھر انہیں ایک شپ میں ملازمت ملی جو آسٹریلیا لے جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو باہر جانے کا بہت شوق تھا، ان کے والد نے شروع میں اس کی مخالفت کی مگر بہر حال وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے شادی کے بعد امریکہ چلے گئے اور میڈیسن میں اعلیٰ تعلیم اور پی ایچ ڈی کی۔ آپ کے سب بچے وہیں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کو طائف کے ملٹری اسپتال میں اچھی آفر ہوئی، اس وقت یہ اسپتال نیا بنا تھا۔

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور رہنے والے شخص کے کیا نظریات اور خیالات ہوتے ہیں اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی جب پہلی مرتبہ طائف آئے تو بہت ماڈرن خیالات کے مالک تھے۔ کلین شیو اور ہیٹ پہنتے تھے۔ امریکہ اور سعودی عرب کے رہن سہن میں زمین و آسمان کا فرق ہے، چنانچہ یہاں آنے کے بعد انہیں واپس جانے کی فکر ہوئی، وہ واپس امریکہ جانے کی ضد کرتے رہتے تھے۔ ہر وقت انکی زبان سے یہ بات سنی جاتی تھی کہ میں اب جا رہا ہوں اور تب جا رہا ہوں۔

ڈاکٹر فرحت علی برنی آپ سے پہلے سعودی عرب آ گئے تھے، وہی آپ کو یہاں رہنے پر قائل کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ قائل ہو گئے۔ ایک عرصے تک طائف میں ملازمت کی، بعد ازاں وہاں آپ کی ملازمت ختم ہوئی تو اس زمانے میں جدہ میں الامل اسپتال نیا نیا بنا تھا، آپ کو اس میں ملازمت کی پیشکش ہوئی تو آپ نے فوراً قبول کر لی اور جدہ آ گئے اور اسپتال میں ڈائریکٹر

کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس دوران آپ کا بڑے افراد سے رابطہ ہوا۔ بعدازاں اس اسپتال کو نیشنلائز کیا گیا تو انکی تنخواہ کا مسئلہ پیش آیا، مجبوراً انہیں اسپتال چھوڑنا پڑا، ایک بار پھر آپکو طائف ملٹری اسپتال سے آفر ہوئی اور آپ پھر طائف چلے آئے۔

انہوں نے بڑی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ بحرہ گیا جہاں ان کا درس تھا،ان کی گاڑی میں قرآن شریف رکھا ہوتا تھا، جہاں ٹریفک سگنل پر گاڑی رکی وہاں قرآن شریف اٹھایا اور ایک سطر حفظ کرنا شروع کر دیا۔اس طرح انہوں نے مکمل قرآن مجید حفظ کیا تھا۔تہجد کے وقت اپنی اہلیہ کو قرآن پاک سنانے کا اہتمام فرماتے۔طائف آنے کے بعد ڈاکٹر شجاعت علی برنی ڈاکٹر اسرار احمد سے وابستہ ہوگئے۔ڈاکٹر اسرار نے اس زمانے میں امریکہ اور کینیڈا میں مقیم پاکستانیوں پر بہت کام کیا تھا۔ڈاکٹر شجاعت علی برنی بھی زمانہ طالب علمی میں ان کی کیسٹوں سے متاثر ہوئے اور طائف آنے کے بعد ان کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ڈاکٹر شجاعت علی برنی نہ صرف ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک اسلامی سے منسلک ہوگئے تھے بلکہ ان کے فعال کارکن بھی تھے۔انہوں نے ہی شروع شروع میں ڈاکٹر فرحت علی برنی کو بھی ان کے ساتھ وابستہ کرلیا تھا مگر پھر جب ڈاکٹر فرحت علی برنی جماعت سے منسلک ہوئے تو پھر انہوں نے ڈاکٹر شجاعت علی برنی کو بھی اس جانب مائل کرلیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی برنی مملکت میں ڈاکٹر اسرار احمد کے دائیں بازو تھے۔ڈاکٹر اسرار احمد سعودی عرب آتے تو ڈاکٹر شجاعت علی برنی کے گھر میں قیام فرماتے تھے۔ڈاکٹر اسرار کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی پروگرام منعقد کرائے، ڈاکٹر شجاعت برنی جب جماعت سے منسلک ہوئے تو ڈاکٹر اسرار احمد ان سے ناراض ہوئے۔وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد کو کیوں چھوڑا اور جماعت سے کیوں منسلک ہوئے اس پر ڈاکٹر صاحب نے کم ہی اظہار خیال کیا مگر میں سمجھتا ہوں کہ جماعت سے منسلک ہونے کی بنیادی وجہ لٹریچر کے علاوہ جماعت کا نظام تھا۔جماعت کے جمہوری کلچر سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جو خاص بات اکثر لوگوں کے علم میں نہیں وہ آپ کی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور قرابت داروں کی مدد تھی۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری گفتگو کا موضوع خاندان کے افراد بھی تھے۔ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان والوں کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے۔وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ فلاں رشتہ دار کا کیا حال ہے،اس کی کیسے مدد کی جائے،اس کا گزر بسر کیسے ہوتا ہوگا۔وہ ہمیشہ مجھ سے اس معاملے میں تبادلہ خیال کیا کرتے تھے کہ فلاں رشتہ دار کی کس طرح مدد کی جائے کہ اس کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور اس کی مدد بھی ہو جاے اور اسے یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ اس کی حالت کا ہمیں علم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں راز اور پردہ داری کی بڑی اہمت تھی۔خاص طور پر خاندان والوں میں،وہ بہت سے لوگوں کی مدد کرتے تھے مگر جن کی مدد کرتے تھے خود ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی مدد کرنے والا کون ہے۔یہی ہمارے درمیان موضوع گفتگو ہوتا تھا۔خاندان والوں کے بچوں کی فکر تھی کہ فلاں رشتہ دار کی حالت نازک ہے تو اس کے بچوں کی تعلیم تو متاثر نہیں ہو رہی اور اس کے سدِ باب کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔خاندان کے ہر گھر میں ان کی بڑی عزت تھی۔اس کی وجہ آپ کی خوش مزاجی تھی۔ڈاکٹر فرحت علی برنی کا مزاج مختلف تھا۔وہ نظم وضبط کے پابند تھے،وقت پر سونا،وقت پر جاگنا اور وقت پر آنا جانا مگر ڈاکٹر شجاعت برنی ان

سے مختلف تھے اس لئے رشتہ داران سے بے تکلف بھی تھے۔انہیں فجر سے پہلے بہر حال اٹھنا ہوتا تھا مگر رات گئے تک رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔آپ کی اپنی روٹین تھی مگر اپنی روٹین کی وجہ سے کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں،کم سولیں گے مگر رشتہ داروں کی دل جوئی ہو جائے گی۔

آپ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔آپ نے یہاں سے کتابوں کے ۴۰ کارٹون اسلام آباد منتقل کئے تھے۔جب ملازمت ختم ہوئی تو خاصے پریشان تھے۔مجھ سے کہتے تھے کہ میں واپس جانا چاہتا ہوں مگر میں ان سے کہتا کہ آپ کہیں نہیں جارہے۔عمر کے آخری سال ملازمت سے فارغ رہے جب کہ آپ کے مقامی لوگوں میں سے بااثر افراد سے تعلقات تھے،اس مشکل وقت میں بھی آپ نے اپنے تعلقات استعمال کرنے سے گریز کیا،آپ نے کبھی کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔دراصل وہ کسی کا احسان نہیں لینا چاہتے تھے۔اگر وہ صرف اشارہ کرتے تو ان کی ملازمت کا مسئلہ حل ہو جاتا۔اس آخری سال کے دوران ملازمت کے حوالے سے کافی فکرمند بھی تھے۔

جس دن ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا اس دن ہمارے ہاں مدینہ منورہ سے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔صبح نو بجے ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ کا میرے گھر فون آیا۔میرے بیٹے انس نے فون اٹھایا،وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔انس نے مجھے دفتر فون کیا اور بتایا کہ مسز برنی کا فون آیا تھا اور وہ بہت پریشان ہیں۔میں نے فوراً ان کے گھر فون کیا تو ان کی اہلیہ نے مجھے یہ اندوہناک خبر دی۔انہوں نے سب سے پہلے مجھے اطلاع دی تھی۔اس دن آپ حسب معمول اٹھے اور خادمہ سے کہا ناشتہ تیار کرو اور خود غسل خانے چلے گئے۔ابھی جا ہی رہے تھے کہ گر پڑے،جب اہلیہ نے اٹھایا تو اس دوران روح پرواز کر چکی تھی۔غالب گمان یہی تھا کہ آپ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہوگا۔فوری طور پر مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ طائف پہنچو۔

جب انتقال ہو گیا تو ان کی نعش اسپتال میں تھی۔اب اسپتال والوں کے اختیار میں تھا کہ وہ کہاں تدفین کراتے ہیں۔اس حوالے سے ہم بالکل بے بس تھے مگر میری کوشش تھی ان کی تدفین مکہ مکرمہ میں ہو جائے۔اس سے پہلے دو تین واقعات میں ہم نے کوشش کی تھی مگر ناکام ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے ہم نے ذرا سی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا کی۔ایک آدمی کا بندوبست ہو گیا جس نے مکہ مکرمہ میں جنت المعلیٰ میں تدفین کرانے میں ہماری مدد کی۔

جب تدفین ہو رہی تھی تو میں نے دیکھا ایک صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں۔میرے قریب جب آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا:

ڈاکٹر صاحب آپ کے کیا لگتے تھے۔

میں نے کہا ’’میرے ماموں تھے‘‘

میں نے ان سے پوچھا: آپ کے کیا لگتے ہیں؟

انہوں نے کہا......

میرے سب کچھ تھے

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھے، اور کہاں سے آئے تھے مگران صاحب نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ڈاکٹر صاحب میرے صرف ماموں، عزیز دوست اور رازدان ہی نہیں تھے۔ وہ میرے سب کچھ تھے۔

یوں ہم کو شجاعت علی مغموم کر گئے مرحوم ہوئے خود ، ہمیں محروم کر گئے
ہر دم یہ دعا کرتا ہے ان کے لئے حارثؔ اللہ بنائے انہیں فردوس کا وارث

☆☆☆

سید سیف الدین عرفان

سید سیف الدین عرفان۔ سیاسی، سماجی شخصیت

ندیم ماہر

گلاؤٹھی یوں تو شخصیات کی سرزمین رہی ہے اور یہاں کی نمائندگی ہر میدان میں رہی ہے، چنانچہ موجودہ سیاسی منظرنامے کی بات کریں تو ایک شخص کے ذکر کے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوتی اور وہ نام ہے سیف الدین عرفان۔

سید سیف الدین عرفان کی پیدائش ۱۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو گلاؤٹھی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام حکیم سید وجیہ الدین سالار اور آپ کی والدہ کا نام عائشہ خاتون تھا۔

عرفان صاحب کی تعلیم کا آغاز ڈی این اسکول گلاؤٹھی سے ہوا۔ بعد ازاں مزید تعلیم کی تکمیل کے لئے علیگڑھ کا رخ کیا۔ ہائی اسکول مسلم یونیورسٹی کے مشہور و معروف اسکول منٹو سرکل سے کیا اور انٹر میڈیٹ کے بعد بی ایس سی (جغرافیہ) یہیں سے پاس کی۔ یونیورسٹی میں قیام کے دوران آپ نے کئی صدور کا الیکشن لڑایا اور کیمپس کی عملی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ اس دور کی چند شخصیات جن میں مرکزی وزراء اعظم خان، عارف محمد خان نیز امتیاز محمد خان، افسر یو احمد جاوید حبیب، وسیم بھنڈی جیسے لوگوں کی صحبت نے اس پتھر کو ہیرا بنا دیا۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وکاس ٹیوبس پرائیویٹ لمیٹڈ (سکندرآباد) میں بحیثیت چیئر مین کام کیا۔ اسی دوران آپ کی شادی میرٹھ کی ایک معروف شخصیت اور صدر جمہوریہ ہند کے مشیر صحت جناب حکیم سید سیف الدین احمد (پدم شری ایوارڈ یافتہ) کی چھوٹی صاحبزادی تبسم سیف الدین سے ہوئی۔

سیاست چونکہ آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ گلاؤٹھی میں خاندانی ریاست اور علیگڑھ میں سیاسی ماحول نے اس پر دو آتشہ کام کیا اور عرفان صاحب نے بحیثیت سیاستداں باضابطہ اپنے کیریر کا آغاز کیا۔

چنانچہ آپ نے ۱۹۹۵ء میں نگر پالیکا پریشد کی چیئر مین شپ کا الیکشن لڑا اور قصبہ میں ایک طویل مدت کے بعد اتنی بھاری اکثریت (جس میں ہندو مسلمان سب برابر تھے) سے کامیاب ہوئے۔ آپ کے دور میں قصبہ میں بے تحاشہ ترقیات کے کام ہوئے، وہ اپنی مثال آپ تھے۔ چنانچہ ۲۰۰۱ء میں ایک بار پھر آپ پہلے سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے اور قصبہ نے آپ کے اوپر اعتماد کی مہر لگادی۔

آپ کے ذریعہ کئے گئے ترقیات کے کاموں، سیاسی سوجھ بوجھ اور کامیاب عوامی رابطہ کی گونج لکھنؤ پہنچی تو آپ کو حکومت اتر پردیش نے چیئر مین کونسل آف یوپی کا وائس چیئر مین منتخب کیا جو اس قصبہ کے ہی لئے نہیں بلکہ اہل علاقہ کے لئے باعث

فخر تھا۔ گو کہ آپ کا جھکاؤ ہمیشہ کانگریس پارٹی کی جانب رہا لیکن کسی بھی حکومت کا دور رہا ہو، ہمیشہ آپ ہر سیاسی پارٹی کے پروگرام میں آگے کی صف میں موجود رہے۔ آپ کے دور میں کانگریس ہی نہیں بلکہ تمام پارٹیوں کے ہر چھوٹے بڑے لیڈر کی قصبہ گلاؤٹھی میں آمد ہوئی، جن میں خاص طور پر سونیا گاندھی، راجیش پائلٹ، اجیت سنگھ، ملائم سنگھ یادو، سلمان خورشید، غلام نبی آزاد، مادھوراؤ سندھیا، موتی لال ووہرا کے علاوہ شیلا دکشت کے نام قابل ذکر ہیں۔

میرا ذاتی طور پر بڑا تعلق تھا۔ میں نے مرحوم کے ساتھ بہت سے اسفار کیئے اور عمرہ کا بھی ۱۹۹۹ء میں ایک سفر ان کے ہمراہ رہا۔ بڑی عجیب وغریب شخصیت اور ایک نہ بیان کیا جانے والا معمہ تھے۔ طبعاً بڑے مہمان نواز، خاموش رہ کر بات سنتے تھے ، سوچ کر جواب دیتے اور ہمیشہ بھرپور بولتے ورنہ خاموش رہتے۔ ہنس مکھ اتنے کہ اگروہ کوٹھی (جو کہ آپ کا قدیمی گھر ہے اور گلاؤٹھی کی ایک تاریخی عمارت ہے) میں موجود ہیں تو اتنی زور سے قہقہہ لگاتے تھے کہ دور دور تک لوگوں کو آپ کی موجودگی کا پتہ چل جاتا تھا ۔ صبح ہوتے ہی لوگوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا تھا، لوگ اپنے مسائل لے کر آتے اور اللہ نے آپ کو یہ صفت دی تھی کہ ہر آنے والے کو آپ توجہ سے سنتے اور اس کے مسائل اور پریشانی کا مداوا کرتے۔ آپ سو کر بھی نہیں اٹھتے تھے کہ لوگ آنا شروع ہو جاتے۔ کبھی کبھی آنے والوں کی تعداد پچاس ساٹھ سے بھی متجاوز ہو جاتی۔ حد تو یہ تھی کہ نگر پالیکا کا تقریباً اسٹاف یہیں آ جاتا۔

۲۰۰۹ء میں آپ کو کینسر کا عارضہ لاحق ہوا، آپ کا آپریشن ہوا لیکن طبیعت بگڑتی رہی اور لاکھ علاج کے باوجود موت جیت گئی اور تمام وسائل ہار گئے۔ ۱۲ مارچ ۲۰۱۰ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ عرفان صاحب نے بحیثیت سیاستداں قصبہ کا نام روشن کیا۔ دہلی ہو یا لکھنؤ ہر جگہ گلاؤٹھی کی شناخت قائم کی۔ آپ کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے سید نعمان الدین، سید سلمان الدین، سید عثمان الدین اور بیٹی شیما شامل ہیں۔

☆☆☆

احمد رشدی (مرحوم)

ہر صنف کے گیت میں کمال رکھنے والے

ایم اختر انجم

احمد رشدی کا تعلق قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (یوپی) بھارت سے تھا۔ ہونا تو یہ تھا کہ احمد رشدی اپنے خاندان کی روایات کے مطابق علم وادب میں اپنا مقام بناتے لیکن رشدی کو بچپن ہی سے گلوکاری کا شوق ہوا، جس نے اسے سُر کی دنیا کا فنکار بنادیا۔

احمد رشدی کی پیدائش حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ آپ نے اپنی فنکارانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز ریڈیو پاکستان کے بچوں کے پروگرام سے کیا۔ بچوں کے لئے احمد رشدی نے ایک گیت ''بندر روڈ سے کیماڑی'' ریکارڈ کرایا جو نہ صرف بچوں میں بلکہ بڑوں میں بھی بے حد مقبول ہوا اور آج تقریباً ۳۶ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس گانے کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

ریڈیو کے ساتھ ساتھ احمد رشدی کراچی اسٹیج پر بھی اپنی آواز کا جادو جگاتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں فلم ''کارنامہ'' کے ذریعہ احمد رشدی پہلی بار بحیثیت پلے بیک سنگر عوام کے سامنے آئے۔ دو سال بعد ۱۹۵۷ء میں ہدایت کار ہمایوں مرزا کی فلم ''آدمی'' ریلیز ہوئی اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی احمد رشدی فلم انڈسٹری میں اپنی جگہ بنا چکے تھے، جس کے بعد ان کے گانوں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور احمد رشدی کامیابیوں کی طرف رواں دواں ہوگئے ۱۹۶۱ء میں فلم ''سپیرن'' کے ایک گانے ''چاند سا مکھڑا گورا بدن'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ موسیقی کے چاہنے والوں میں احمد رشدی کے گائے ہوئے گانے ''گول گپے والا آیا'' نے اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

شروع میں احمد رشدی کے لئے یہ کہا گیا کہ رشدی تربیہ گانوں کے سوا کچھ نہیں گا سکتا، لیکن انہوں نے جب فلم ''آنچل'' کا المیہ گانا ''کسی چمن میں رہو تم'' اور ''فلم ''ایندھن'' میں ''بے کل رات بتائی'' گایا تو سب ہی نے اعتراف کرلیا کہ وہ ہر طرح کے گیت گانے میں کمال رکھتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ایسے چند ہی گلوکار ہیں جنہیں ہر طرح کے گانے میں مہارت حاصل ہے، ان میں ایک نام احمد رشدی مرحوم کا بھی شامل ہے۔ رشدی ہی پاکستان کے وہ واحد گلوکار تھے جنہیں اونچے اور نیچے سُروں میں گانے میں یکساں مہارت حاصل تھی۔

پاکستان کے مشہور ترین اداکار وحید مراد پر پکچرائز ہونے والے ۷۰ فیصد گانے رشدی نے گائے، وحید مراد پر پکچرائز ہونے والے احمد رشدی کے گانے زیادہ مقبول ہوئے۔ احمد رشدی نے بارہا یہ بات اپنے انٹرویو میں کہی کہ میں وہ گانے بڑی خوبی سے گاتا ہوں جو گانے وحید مراد پر فلمائے جاتے ہیں اور یہی بات مرحوم وحید مراد نے بھی کہی تھی کہ میں وہ گانے بڑی شوخی سے پکچرائز کراتا ہوں جو احمد رشدی میرے لئے گاتے ہیں۔ احمد رشدی اور وحید مراد کی محبت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو وحید مراد

نے احمد رشدی کے انتقال کے بعد کراچی میں اپنے پرستاروں سے ملاقات کے دوران کہے تھے۔وحید مراد نے کہا تھا کہ آج رشدی ہی نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ آج میری آواز بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔احمد رشدی کے انتقال کے سات ماہ بعد وحید مراد بھی احمد رشدی سے جا ملے۔

احمد رشدی نے اپنے ۲۸ سالہ فلمی دور میں ہزاروں گیت گائے،جن کا ذکر اس مختصر مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔المیہ، تربیہ اور مزاحیہ گیت غرض ہر قسم کے گیت گا کر احمد رشدی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہر فن مولا ہیں۔رشدی کو اداکاری کا بھی شوق تھا اور انہوں نے چند ایک فلموں میں اپنا یہ شوق پورا بھی کیا، رشدی نے فلمسازی کی بھی کوششیں کی لیکن وہ اس شعبہ میں ناکام رہے اس کی وجہ ان کے دوست نما دشمن تھے،جن کی وجہ سے وہ فلم شروع کرنے کے بعد اسے مکمل نہ کر سکے۔

احمد رشدی کو زندگی کے آخری دنوں میں ڈاکٹروں نے گانے سے منع کر دیا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ میں فنکار ہوں اور فنکار فن سے جدا نہیں رہ سکتا۔رشدی کو جب فلمسازوں نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تو وہ واپس کراچی آئے ان کی خواہش تھی وہ ایک اکیڈمی قائم کریں جس کے ذریعہ وہ فن کی غذا کے ساتھ ساتھ نئے گانے والوں کو بھی روشناس کرائیں،لیکن احمد رشدی کی یہ خواہش اس وقت ہمیشہ کے لئے خواب بن گئی جب ۱۱ اپریل ۱۹۸۳ء کو اپنے اہل خانہ اور لاکھوں مداحوں کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

سید سلیم شہزاد

سید سلیم شہزاد (مرحوم)۔ نامور صحافی

نسیم الدین ہاشمی

خاندان سادات گلاؤٹھی اور قرب وجوار کا شمار گو کہ تعداد کے اعتبار سے ایک چھوٹی برادری میں ہوتا ہے لیکن یہاں کے لوگوں نے ہر میدان میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ تعلیم کا شعبہ ہو یا علم وادب، صنعت وتجارت، قانون، طب یا صحافت ہر میدان میں آپ کو جوہر نایاب مل جائیں گے۔ ایسا ہی ایک نام پاکستان کے نامور صحافی سلیم شہزاد کا ہے۔

آپ ۱۹۷۰ء میں کراچی میں پیدا ہوئے، والد کا نام سید شمیم اختر اور دادا کا نام سید عبدالنعیم تھا۔ سید شمیم اختر (مرحوم) کا شمار انشورنس کے شعبہ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک طویل عرصہ تک امریکن لائف انشورنس سے منسلک رہے۔

سلیم شہزاد نے ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ ۱۹۹۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد انٹر فلو کمیونیکیشن پرائیویٹ لمیٹڈ سے عملی زندگی کا آغاز کیا، دوران ملازمت نوائے وقت، روزنامہ جسارت اور دوسرے اردو اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے جو بیحد مقبول ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں اسٹار ڈیلی انگلش ایوننگ نیوز پیپر جو ہیرالڈ پبلیکیشن (روزنامہ ڈان) کا ذیلی ادارہ ہے سے منسلک ہو گئے اور یہیں سے آپ کی ترقی کا سفر شروع ہوا۔

شہری سہولیات، پبلک ہیلتھ سروسز، کراچی الیکٹریکل کارپوریشن، پی آئی اے اور ٹریڈنگ کارپوریشن پر لکھے گئے مضامین پاکستان کے اخبارات اور رسائل تک ہی محدود نہ تھے۔ یوروپین اور ایشین میڈیا کے لئے بھی آپ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ آپ نے کئی سال ایشیا ٹائم (ہانگ کانگ) کے پاکستان کے لئے بیورو چیف کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ آپ اٹالین نیوز ایجنسی Adnkronos سے بھی منسلک رہے۔

نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی مداخلت سے خطہ میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، سیاسی تجزیئے، عوامی مسائل جیسے مضامین سے آپ کی توجہ کم اور دہشتگردی کے خلاف جنگ اور اس سے منسلک معاملات سے زیادہ ہو گئی اور یہی شاید آپ کی موت کا سبب بنی۔

۳۰ مئی ۲۰۱۱ء کو آپ کی پراسرار حالت میں موت واقع ہوئی۔ اس طرح ۴۰ سال کی کم عمر میں عین شباب میں پاکستان کا یہ نامور صحافی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بحیثیت Investigative Journalist آپ کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے (آمین) آپ نے بیوہ انیتہ سلیم اور تین بچوں فہد سلیم، رحمان سلیم اور آمنہ سلیم کو سوگوار چھوڑا۔

☆☆☆

سید محمد اقبال محمود۔معروف بینکر

نسیم الدین ہاشمی

اقبال محمود پاکستان کے ان چند قابل افسران میں شامل ہیں جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد بینکنگ کے شعبہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار سید محمد محمود (مرحوم) پولیس میں ملازم تھے۔آپ کے آباء واجداد کا تعلق الدن ضلع میرٹھ سے ہے۔حاجی ظہور علی آپ کے دادا اور ہندوپاک کے مشہور عالم دین مولانا بدر عالم میرٹھی آپ کے چچا تھے۔

ابتدائی تعلیم دہرہ دون (ہندوستان) میں حاصل کی۔فیض عام کالج میرٹھ سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی۔ایس ایم کالج کراچی سے ۱۹۴۹ء میں بی اے اور ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے ایم اے معاشیات میں کیا اور ۱۹۵۲ء میں ایل ایل بی اور ۱۹۵۳ء میں انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز سے تعلیم حاصل کرکے فیلو ممبر بنے۔

سینٹرل بینکنگ آفیسرز ٹریننگ اسکیم میں آل پاکستان بنیاد پر منتخب ہوئے اور دو سال تک نیشنل بنک آف پاکستان میں کمرشل بینکنگ کی تربیت حاصل کی۔اگست ۱۹۵۳ء میں بحثیت کلاس ون آفیسر ز اسٹیٹ بنک میں شمولیت اختیار کی، مارچ ۱۹۶۳ء تک بینک کے مختلف شعبہ جات، ایکسچینج کنٹرول، اکاؤنٹس، ایڈمنسٹریشن، ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور بینکنگ کنٹرول میں خدمات انجام دیں۔اسی دوران ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک آپ کو مشرقی پاکستان میں بھی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔۱۹۶۳ء میں آپ کو سلیکشن گریڈ ملا اور اسٹنٹ ڈائریکٹر بینکنگ کنٹرول مقرر ہوئے۔دسمبر ۱۹۶۴ء میں بحثیت ڈپٹی ڈائریکٹر بینکنگ کنٹرول سنٹرل ڈائریکٹریٹ ڈھاکہ مشرقی پاکستان تعینات ہوئے۔۱۹۶۶ء میں آپ کا تبادلہ ایک بار پھر سنٹرل ڈائریکٹریٹ کراچی میں ہوگیا۔

۱۹۶۸ء میں آپ کو IMF کی طرف سے تربیت کے لئے امریکہ بھیجا گیا، جہاں آپ نے مختلف مالیاتی امور میں تربیت حاصل کی۔آپ نے IBRD سے بھی خصوصی تربیت حاصل کی۔آپ ورلڈ بینک، کنٹرولر آف کرنسی آفس یو ایس اے ،فیڈرل ریزروبورڈ، فیڈرل ڈپوزٹ انشورنس اور فرسٹ نیشنل سٹی بینک سے بھی منسلک رہے۔

۱۹۷۳ء میں پرنسپل آفیسرز گریڈ میں پروموشن ملا اور سینئیر ڈپٹی ڈائریکٹر بینکنگ انسپکشن ڈیپارٹمنٹ مقرر ہوئے۔۱۹۷۵ء میں سنئیر پرنسپل آفیسرز گریڈ میں آپ کو ڈائریکٹر ٹریننگ ڈیپارٹمنٹ مقرر کیا گیا۔ستمبر ۱۹۷۶ء سے دسمبر ۱۹۷۷ء تک سنٹر بینک آف عمان مسقط میں خدمات انجام دیں۔۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۵ء تک اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مختلف ڈیپارٹمنٹ مثلاً ٹریننگ، آڈٹ، ایڈمنسٹریشن میں بحثیت ڈائریکٹر کام کیا۔۱۹۸۶ء میں سینئر ایگزیکٹیو ڈائریکٹر (Senior Executive Director) تقرر ہوا اور اسی عہدہ سے ۱۹۹۰ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

آج کل اپنے صاحبزادے ذوالقرنین (شہزاد) کے ساتھ مقیم امریکہ ہیں۔

☆☆☆

چھٹا باب

سفرنامہ

پاکستان بننے کے بعد کی گلاؤٹھی اور اس کے مکین

سید رضی الدین ہاشمی

گلاؤٹھی کا سفر آخری مرتبہ غالباً ۲۰۱۰ء میں ہوا۔خیال ہوا اس دفعہ کچھ یادداشتیں مرتب کی جائیں تاکہ تقسیم کے بعد گلاؤٹھی کے سادات خاندانوں کا حال احوال نہ صرف یہ کہ نئی نسل کو منتقل کیا جا سکے بلکہ اخوان السادات کے سینکڑوں خاندانوں کو ان کے آباء واجداد، ان کے آبائی وطن، ان کی اساس کے بارے میں معلومات فراہم کی جا سکیں۔ان کے گھر، محلے، رہن سہن، طرز رہائش اس زمانہ کے تہوار اور تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں یقیناً تجسس ہے۔ہم سب لوگوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے آپسی تعلقات، ان کی سوچ، تدبّر، فہم وفراست اور ان کے حسن اخلاق کے بارے میں جانیں۔بقول شاعر مشرق علامہ اقبالؒ ؎

وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

انہی سوچوں میں گم ہماری گاڑی دہلی سے غازی آباد ہوتے ہوئے ہاپوڑ میں داخل ہوگئی اور ہم جی ٹی روڈ پر آ گئے، وہی گرانٹ ٹرنک روڈ جو شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں بنائی تھی جو ۱۷۰۰ میل لمبی ہے، پشاور، گجرات، لاہور امرتسر، انبالہ سے میرٹھ، ہاپوڑ، آگرہ اور بنارس ہوتی ہوئی یہ سڑک کلکتہ تک جاتی ہے۔اس کا نیا نام ''شیر شاہ سوری مارگ'' ہے۔اسی کو رضا علی عابدی نے جرنیلی سڑک کہا ہے اور اپنے سفر کو کتابی شکل دے کر معلومات کا انمول خزانہ مہیا کیا ہے۔لیجئے ہم جی ٹی روڈ ہاپوڑ پرانے بس اڈے کے پاس پہنچ گئے۔ابھی ہماری گاڑی رکی ہی تھی کہ میرے کانوں میں وہی مانوس آوازیں آ رہی تھیں ''پاپڑ، ہاپوڑ کے پاپڑ'' آج سے تقریباً پچاس اور ساٹھ سال قبل جب ہم ہر ہفتہ گلاؤٹھی سے ہاپوڑ جاتے تھے تو بس رکتے ہی ٹوکروں میں تلے ہوئے پاپڑ لئے کئی لوگ بس کے دونوں طرف جمع ہو جاتے تھے، آج بھی میرے ذہن میں اس ادھیڑ عمر ہاکر کی تصویر سامنے آ جاتی ہے جو آواز لگاتا تھا ''آلو کے پاپڑ، دال کے پاپڑ، کچریاں، ہاپوڑ کے پاپڑ''۔

سادات گلاؤٹھی کا ذکر ہو اور سادات ہاپوڑ، سادات الدن، سادات دھولانہ اور سادات سینٹھہ کا ذکر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔اتنی آپسی رشتہ داریاں اور قرابتیں، میری ننھیال ہاپوڑ، میری والدہ اور والدہ کی ننھیال الدن، میری دو بہنوں کی شادی سینٹھہ میں اور خالہ زاد بہن کی شادی الدن میں ہوئی۔دراصل سادات گلاؤٹھی ان سب ہی کو ملا کر بنتے ہیں۔

اس جگہ سے جہاں ہماری گاڑی رکی ہوئی تھی، تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر الدن ہے، وہی الدن جو مولانا بدر عالم میرٹھی کا آبائی وطن تھا۔دارالعلوم دیوبند کے جید عالم جن کے درس حدیث کا ہندوستان میں کوئی ثانی نہیں تھا۔مظفر احمد ضیا اور ان کے والد ممتاز احمد اسی قصبہ سے تعلق رکھتے تھے۔اسی قصبہ میں نمبردار منظور اور ظفر رہتے تھے جن کے والد عطائے کریم میری والدہ کے نانا تھے اور جو مولانا اصلح الحسینی صاحب کے بھی نانا تھے۔کپورتھلہ میں آباد حکیم صادق علی، جعفر علی اور عاشق علی

بھی اسی الدن کے رہنے والے تھے اور انہی جعفر علی کے بیٹے جناب افتخار علی، میری اہلیہ کے نانا تھے۔ اسی گاؤں میں ایک بڑی حویلی تھی جو میرے والد کی ننھیال تھی۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں الدن میں متعدد بار گیا بھی۔ بھائی عزیز احمد کی شادی اور بھائی نصر اللہ کی شادی میں شرکت کرنا مجھے یاد ہے۔ حویلی کے کھنڈرات میں نے بھی دیکھے ہیں۔

ہاپوڑ کے اس بس اڈے کے دائیں جانب مدرسہ السادات ہاپوڑ کا قبرستان ہے جہاں پر میرے نانا سید شرف الدین اور پرنانا سید مظہر الدین مدفون ہیں۔ اس کے بائیں جانب مدرسہ سادات ہاپوڑ ہے جہاں بادشاہی دور کا یہ محلّہ آباد ہے۔ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا سید فخر الدین صاحب اسی خاندان کے فرد تھے۔ میرے ماموں سید قطب الدین اور سید سلطان عارفین ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستان چلے گئے۔ میرے سب سے بڑے ماموں جمیل احمد کی صاحبزادی کی شادی گلاؤٹھی میں سید فاخر حسن سے ہوئی تھی، محلّہ مدرسہ کے بیشتر گھروں کو کھنڈرات کی شکل میں دیکھا۔ میری امی کے تایا کی اولاد کے کچھ افراد اس محلّہ میں قیام پذیر ہیں۔

مدرسہ سادات سے نکل کر پرانے بازار سے ہوتے ہوئے دائیں جانب محلّہ قاضی واڑہ اور بائیں جانب نئی آبادی ہے۔ قاضی واڑہ میں میری امی کی خالہ محترمہ عبیدہ کا گھر تھا۔ محلّہ نئی آبادی میں برادر بزرگ جناب عزیز احمد کی رہائش گاہ تھی جہاں بڑی کثرت سے آنا رہا ہے۔ یہ وہی گھریا حویلی ہے جہاں سید وہاج احمد اور سید نور احمد قیام پذیر تھے۔ حکیم وہاج نابینا حکیم تھے اور ان کی اہلیہ فردوسی بیگم میرے والد کی ماموں زاد بہن ہیں۔ نور احمد صاحب کے صاحبزادے سید آفتاب احمد اخیر تک اسی حویلی میں قیام پذیر رہے۔ نور احمد کے صاحبزادے سید اظہار احمد پاکستان آ گئے، سید اقبال احمد مقیم لندن ان کے صاحبزادے ہیں۔

بس گلاؤٹھی کی طرف رواں دواں تھی۔ حافظ پور سے گزرتے ہوئے اب ہم اکبر پور کے قریب پہنچ چکے تھے جو گلاؤٹھی سے محض دو میل دور ہے۔ لیجئے ہم بمبہ (آبپاشی کے استعمال ہونے والی چھوٹی نہر) تک جا پہنچے۔ سڑک کے دونوں جانب گھنے سایہ دار درخت ہیں، نہر کے ایک جانب سید ممتاز علی اور صابر علی کا نوّے بیگھے کا باغ اور دوسری طرف وقار صاحب کا لگایا ہوا ۱۰ بیگھے پر محیط آم کا باغ ہے۔ ذرا سا آگے بڑھئے تو بھائی ذکی الدین کا باغ، ساتھ ہی دھولانا جانے والی کچی سڑک جو اب پختہ ہو چکی ہے، یہیں پر قاضی عبدالقدوس کا، قاضی عبدالسلام اور والد صاحب سید شفیع الدین صاحب کے لگائے ہوئے باغات ہیں۔ ہمارے انہی باغوں کے بیچ ہماری دادی اور بھائی ریاض الدین کی والدہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ ہمارے دو باغوں کے بیچ ڈپٹی احمد علی کا باغ تھا اور اس کے بعد فصیح الدین صاحب کا قدیم باغ۔ ان باغوں میں روزانہ گلابوں اور چنبیلی کے پھولوں کا چننا اور گیندے کے پھولوں کی مخصوص خوشبو آج بھی اُس معطر فضا کی یاد دلاتی ہے۔

سڑک کی دوسری جانب ہمارا خاندانی حافظ والوں کا قبرستان تھا جہاں ہمارے پردادا سید اکرام الدین کی قبر بھی ہے۔ خاندان کے دوسرے بزرگ مولانا سید محی الدین، مولانا سید حمید الدین، مولوی سید محمد میاں، بھائی ذکی الدین اور خالو بشیر احمد یہیں مدفون ہیں۔ اللہ ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ ملحقہ اراضی میں حافظ سید حکیم اللہ کے باغات اور زرعی اراضی ہے۔

اب ہم قصبہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ دائیں جانب چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں۔ ذرا آگے کی طرف بڑھئے تو مقدم

فیضیاب کی اراضی، علاقہ دار سید رحمت کی سکنی جائیداد ہے۔ بائیں جانب قصبہ میں اندر داخل ہونے والی سڑک ہے جس پر گورنمنٹ پرائمری اسکول اور ٹاؤن ہائی اسکول واقع ہے۔ اس اسکول سے ہم نے پانچویں جماعت پاس کی۔ زرد رنگ کی عمارت عنابی کھڑکیاں اب صرف ہمارے حافظہ ہی میں موجود ہیں۔ ذرا سا آگے بڑھے، لیجئے بس اڈا آ گیا جو ایجنٹی کے نام سے معروف تھا۔ اس اڈہ پر لکڑی کی بنی دکانوں کی قطار تھی اور ان دکانوں میں علاء الدین کی چائے کی دکان جو برادری کے لوگوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ بس اڈے پر حنیف صاحب کی شخصیت بڑی جانی پہچانی تھی، بسوں کو پارک کرانا اور سیٹی بجا کر ان کو روانہ کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ علاء الدین کی دکان کے سامنے ایک پنڈت جی کا اسٹال تھا جہاں وہ دہی بڑے اور آلو کی ٹکیاں بیچا کرتے تھے اور ہم ان بچوں میں شامل تھے جو ہر روز یہاں آ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان دکانوں کے پیچھے ٹاؤن ایریا کی بلڈنگ تھی جو اب نگر پالیکا کہلاتی ہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء کے عرصہ میں کم و بیش سب کچھ ایسا ہی تھا۔

منشی مہربان علی کا تعمیر کردہ کالی ندی کا پل

چند قدم آگے جائیے تو الٹے ہاتھ پر والد محترم کا قائم کردہ مفید عام اسکول جوان کی کوٹھی ''رین بسیرا'' میں قائم ہے، سیدھے ہاتھ پر حافظ صاحب کی بنائی ہوئی کوٹھی جو عرصہ تک بیج بھنڈار کے طور پر جانی جاتی تھی۔ آس پاس کی ساری سکنی جائیداد ''شفیع پورہ'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اسی جائیداد سے ملحق منشی مہربان علی کا عظیم الشان مقبرہ تھا جس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مقبرہ کے سامنے ایک قدیم قبرستان ہے جہاں مشہور عالم دین مولانا عبدالعزیز مدفون ہیں، انہی مولانا عبدالعزیز کے پوتے جناب دیویندر اگروال ولد جگدیش اگروال میرے کلاس فیلو بھی رہے ہیں، ان کے خاندان نے اسلام قبول نہیں کیا۔ آدھا میل کے فاصلہ پر گلاؤٹھی کا تھانہ اور مشہور تھانے والی مسجد تھی جو اس زمانہ میں اچھی حالت میں تھی، اسی سڑک پر آگے علاقہ دار رحمت اللہ کی کوٹھی، دیوناگری کالج اور آخری عمارت کوٹھی فاطمہ تھی جو کبھی قصبہ کی خوبصورت ترین عمارت تھی اور لوگ سیر کرنے یہاں تک آتے تھے۔

مفید عام کالج اور ٹاؤن ایریا کے ساتھ جانے والی سڑک پر اب ہم اندرون قصبہ کی طرف چلتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنے وقت کی عظیم الشان عمارت بڑا محل واقع ہے، اس سے منسلک ''مسجد رحمت'' ہے۔ دونوں عمارتیں اب موجود نہیں۔ مسجد کی تعمیر نو قاضی عبدالسلام کے صاحبزادے شکیب کرا رہے ہیں اور جلد ہی مسجد مکمل ہونے والی ہے۔

بڑا محل جو محلّہ شرافت اللہ میں واقع ہے، سید رحمت اللہ مرحوم نے ۱۲۵۰ھ میں تیار کرایا تھا۔ مسجد کی تعمیر ۱۸۰ سال قبل ۱۲۵۳ ہجری میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں کی مکین حافظ حکیم اللہ، ڈاکٹر بقاء اللہ، سید نعمت اللہ، سید بشارت اللہ، سید حکمت اللہ،

حافظ حکیم اللہ صاحب کے صاحبزادے اسد اللہ غالب جو میرے ہم عمر اور کلاس فیلو تھے۔ آج کل علی گڑھ میں قیام پذیر ہیں اور ان کی والدہ احسانی بیگم جو نوے سال کی عمر میں علی گڈھ میں مقیم تھیں چند سال قبل انتقال ہوا۔ یہ بہادر خاتون بلند شہر کے قاضی سید عبداللطیف کی صاحبزادی تھیں، نہایت نامساعد حالات میں اپنی دونوں بیٹیوں قمر اور شہناز اور بیٹے اسد اللہ کی پرورش کی اور اپنی جائیداد کی دیکھ بھال کی۔ یہاں تک کہ وہ خود کھیتوں اور باغوں میں جا کر اپنے حق کے لئے لڑتیں اور اپنے مسائل حل کر لیتیں۔ قمر باجی کی شادی عمر برنی سے ہوئی اور اب دہلی میں مقیم ہیں۔ شہناز باجی کی شادی افضال صاحب سے ہوئی۔ دونوں بہنوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

اس محل کے ایک اہم مکین ڈاکٹر بقاء اللہ اور ان کی بیگم پھوپی محفوظی تھے۔ انہی ڈاکٹر بقاء اللہ کے صاحبزادگان میں بھائی محمد احمد سالار، اور مرحوم بھائی نور احمد تھے۔ ایک بھائی سید حبیب جواب کینڈا میں مقیم ہیں۔ ان کی دو بیٹیوں کی شادی کوٹھی فاطمہ والی کے سید وجیہ الدین اور سید محمد سے ہوئی۔ چھوٹی بیٹی جناب سید شاہد واسطی صاحب (ونگ کمانڈر) سے منسوب ہوئیں جن کا تعلق کھرنجہ سے ہے اور سید فخر الحسن واسطی کے صاحبزادے سے ہوئی۔

اس محل کے تین مکینوں نے ہمارے محلّہ فضل اللہ میں مسجد رحمت سے متصل اپنے مکانات تعمیر کرائے۔ سید بشارت اللہ سالار، سید حکمت اللہ اور سید حامد اللہ عرف اچھے میاں۔ سید بشارت اللہ کے ایک صاحبزادے سید بدر کا حال ہی میں علی گڑھ میں انتقال ہوا ہے۔ چھوٹے بیٹے جاوید سالار گلاؤٹھی ہی میں قیام پذیر ہیں۔ سید حکمت اللہ کے صاحبزادے سید ذکی اللہ قطر میں لمبے عرصہ تک ملازم رہے، ابھی حال ہی میں انوری بیگم کا میرٹھ میں انتقال ہوا ہے۔

گزرا ہوا زمانہ اچھا لگتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ مذکورہ بالا بزرگوں سے صحبت ملی۔ ان کے گھروں پر آنا جانا، انکے شفیق برتاؤ مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں۔ پھوپی محفوظی جو ہمارے رشتہ کی پھوپی تھیں، میرا بالخصوص بے حد خیال رکھتی تھیں اور ان کی اولاد نے بھی اپنے حق بخوبی ادا کئے۔ یہ محبتیں بڑا قیمتی سرمایہ تھیں۔

رحمت مسجد کے ساتھ ہی محلّہ فضل اللہ شروع ہو جاتا ہے۔ محلّہ قاضی فضل اللہ صاحب کے نام سے موسوم ہے جو قصبہ میں قضا کے عہدہ پر فائز تھے۔ قاضی صاحب کے والد قاضی عنایت اللہ اور دادا قاضی سید فیض اللہ بھی گلاؤٹھی کے قاضی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۲۵ ہجری میں ہوا۔ اسی خاندان میں ۱۹/ ویں ہجری کے بزرگ قاضی سید سمیع اللہ اور قاضی حبیب اللہ تھے جن کی اولادیں بڑی لائق وفائق تھیں اور سب نے پاکستان ہجرت کی۔ اسی خاندان کے قاضی عبداللطیف کے صاحبزادے قاضی عبدالقدوس ہمارے زمانے میں حیات تھے۔ ان کے بیٹے ذکی پاکستان منتقل ہو گئے، تقی، اسلم اور طارق آج بھی اس محلّہ میں قیام پذیر ہیں۔

محلّہ فضل اللہ میں داخل ہوتے ہی گلی میں جناب بشارت اللہ سالاری اور حکمت اللہ صاحب کے مکان ہیں۔ دونوں کے درمیان ہمارے خالو بشیر احمد صاحب کا مکان ہے۔ یہ مکان خالو نے ہمارے والد سے خریدا تھا۔ آج اس مکان میں برادر فاروق احمد رہتے ہیں اور ہماری خالہ عثمانی جہاں ہیں۔ اللہ دیر تک ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے (آمین)۔ خالو بشیر احمد صاحب ہم بھائیوں کے استاد تھے، ان کی دی ہوئی تعلیم و تربیت نے ہمیں کسی قابل بنا دیا، اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

اسی محلّہ میں ہمارا مکان ''شہاب منزل'' واقع تھا جو دادا شہاب الدین کے نام پر رکھا گیا۔ والد نے سید ضامن علی سے خریدی زمین پر بھاولپور کی نوکری کے زمانہ میں اس کو تعمیر کرایا تھا۔ ہمارا بچپن اور نوجوانی اسی مکان میں گزری اور نہایت خوشگوار یادیں آج بھی ماضی کی یاد دلاتی ہیں۔ والد صاحب کے دو بھائی سید رفیع الدین اور نظام الدین صاحب بہاولپور ہی میں رہے اوران کی اولاد کراچی میں مقیم ہے۔ دادا کے بھائی سید ظہور الدین صاحب کا مکان ساتھ ہی میں تھا، ان کی اولاد سید حسام الدین ،سید عماد الدین اور سید اعجاز الدین پاکستان منتقل ہو گئے تھے اور سب خوش باش ہیں۔

شہاب منزل کے سامنے سید صدیق علی صاحب کا مکان تھا، سید صابر علی اور سید شاہد علی ہمارے بہترین پڑوسی تھے۔ صابر علی صاحب ہمارے خالو بھی تھے، ان کے صاحبزادے سید شاکر علی حال ہی میں مفید عام کے وائس پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

حکمت اللہ صاحب کے مکان سے ذرا آگے بڑھئے تو مضطر صاحب کا مکان ہے، ہمارے زمانے میں ان کی صاحبزادی خالہ کنیز اوران کی بیٹی نسیم رہتی تھیں۔ ہمارے علی گڑھ کے ہم عصر اور دوست ڈاکٹر سجاد سید انہی کے بیٹے ہیں جو آج کل دمام میں ڈاکٹر ہیں اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ اسی گلی میں کچھ آگے بڑھ کر پھوپا صادق علی کا گھر تھا جو کسی زمانہ میں ہمارے والد کے مختار کار ہوتے تھے، اخیر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، کبھی کبھی ان کی لاٹھی پکڑ کر پلکھن والی مسجد پہنچانا نہیں بھولے۔ ان کی بیگم پھوپی اللہ دی کا انتقال ہمارے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔

چند ہی قدموں کے بعد قاضی فضل اللہ کے خاندان کے مکانات ہیں۔ اپنے بچپن میں ہم نے قاضی سید سمیع اللہ اور قاضی

مفید عام اسکول۔ قائم کردہ حافظ سید شفیع الدین

حبیب اللہ صاحب کے مکانات کھنڈر ہی کی صورت میں دیکھے ہیں۔ آباد مکان صرف قاضی عبدالقدوس صاحب کا ہی تھا جو طویل العمر بھی تھے، جن کا انتقال تقریباً ۱۰۰ سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے پاس جانا بیٹھنا اور باغوں میں گھومنا آج بھی یادداشت میں محفوظ ہے۔

اب ہم محلّہ فضل اللہ کے اخیر میں پہنچ گئے ہیں۔ اونچی کرسی والا محل نما مکان ڈپٹی کلکٹر سید احمد علی صاحب کا ہے (صادق علی منشی مہربان علی کے بھانجے تھے) صادق علی صاحب کے بیٹے سید خسرو ہمارے علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں سیشن جج علی گڑھ تھے۔ اچھے میاں جو برابر والے مکان میں تھے ان کی بیٹی نشاط باجی کے شوہر تھے۔

یہ ہمارا محلّہ حافظان ہے جسے محلّہ عظیم الدین بھی کہتے ہیں۔ یہ محلّہ ہمارے جدامجد حافظ سید سراج الدین کا ہے جو حفظ قرآن کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے چھ صاحبزادگان تاج الدین، مولوی معز الدین، حافظ شمس الدین، سید جلال الدین اور سعید الدین تھے۔ میرے دادا اکرام الدین، تاج الدین کے بیٹے تھے۔ ایک بھائی کی اولاد ماسٹر سید ظفر الدین والد سید شریف الدین اور ایک بھائی کی اولاد میں چچا قمر الدین، قطب ابن سید نجم الدین تھے۔ چچا ظفر کے صاحبزادگان سعودی عرب میں مقیم ہیں، اسی طرح داد قطب کے پوتے اور چچا نصیر کے بیٹے حارث اور جاوید نصیر جدہ کے ساکن ہیں اور عرفان امریکہ میں ہیں۔

ہمارے گلاؤٹھی کے قیام کے زمانہ میں ہمارے اکلوتے خاندانی رشتہ دار مولوی سید حمید الدین صاحب تھے۔ اس وقت وہ مدرسہ منبع العلوم کے مہتمم اور جامع مسجد کے امام تھے۔ قصبہ بلکہ ضلع کی انتہائی محترم شخصیت تصور کئے جاتے تھے۔ ان کے صاحبزادگان میں مولانا قاری سید محمد میاں مدرسہ عالیہ فتحپوری کے استاذ حدیث تھے، جمعیۃ علمائے ہند صوبہ دہلی کے صدر نیز مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ تھے۔ مولانا اسعد مدنی، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا عثمان فارقلیط ایڈیٹر الجمعیۃ سے ان کے قریبی روابط تھے۔ آپ کا انتقال ۲۰۰۷ء میں ہوا۔ آج بھی آپ کا نام دینی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔

مولانا احمد میاں مدرسہ منبع العلوم اور مفید عام اسکول سے وابستہ رہے۔ مولانا حمید الدین صاحب کے انتقال کے بعد بھائی نسیم الدین کی خدمات مسجد اور مدرسہ کے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ مولوی قسیم الدین حماد گڑھ مکتیشور میں مقیم ہوئے جہاں قاضی طیب صاحب کی صاحبزادی آپ کے عقد میں تھیں اور سیانہ میں محکمہ بجلی میں ملازم ہوئے اور ریٹائر ہوئے آپ گڑھ مکتیشور میں آج بھی قاضی شہر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولوی سلیم الدین حسان سے میری دوستی بھی رہی اور خاص تعلق بھی۔ اس پورے خاندان نے جس طرح ہمارے والد صاحب کی خدمت کی اور ان سے محبت کی، اس کا قرض ہم اور ہمارے بھائی ادا نہیں کرسکتے۔ بھائی نسیم کے صاحبزادے سید فرید الدین مدرسہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دوسرے ندیم ماہر قطر میں مقیم ہیں اور ان کا شمار اردو کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔ مولوی نسیم الدین کی صاحبزادی ڈاکٹر شہزادی خاتون نہ صرف میری ہونہار شاگردہ رہی ہیں بلکہ تعلیم نسواں کے سلسلہ میں میری کاوشوں میں معاون اور مددگار بھی۔ غالباً ۱۹۶۷ء کی بات ہے کہ گلاؤٹھی کی درجن سے زیادہ لڑکیوں نے علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔

محلّہ حافظان میں مولوی صاحب کے گھر سے متصل مولوی عبداللہ اور مولوی عبیداللہ کے گھر ہیں۔ اس گھر کا ایک دروازہ

ہمارے گھر میں کھلتا ہے۔اس گھر کا شمار علمی اور دینی اعتبار سے قصبہ کے قابل ذکر خاندانوں میں ہوتا ہے۔اس خاندان کے بیشتر افراد حیدرآباد میں مقیم رہے۔مولوی عبداللہ کے صاحبزادہ مولوی منظور تھے۔ بھائی سید احمد انہی کے پوتے اور سید حامد کے بیٹے تھے۔ بھائی سید مرحوم کے بڑے صاحبزادہ امریکہ میں مقیم ہیں اور چھوٹے بیٹے کویت کی رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں، مشہور سنگر احمد رشدی اسی خاندان کے فرد تھے۔

اس گھر کے برابر میں میر برکت اللہ صاحب کا مکان تھا جو ۱۸۰۰ء کے اخیر میں بہاولپور ریاست میں اعلی عہدہ پر فائز تھے، یہی میر صاحب میری بڑی اماں کے والد یعنی بھائی ریاض الدین کے نانا تھے۔ان کی اولاد میں ماموں ناصر الدین اور ماموں کرامت اللہ، ماموں ناصر الدین کے بیٹے بھائی وجیہ الدین اور غیاث الدین کانپور میں سکونت پذیر ہوئے، ماموں کرامت اللہ کے بیٹے بھائی نسیم الدین کا خاندان گلاؤٹھی ہی میں آباد ہے۔

اگلا محلّہ پلولیان ہے جو لال ڈگی کی نسبت سے محلّہ لال ڈگی کے نام سے معروف ہے۔ پہلا مکان سید حسن خورجوی کا تھا،ان کے صاحبزادگان راغب حسن اور اقبال حسن نے علی گڑھ سے ماسٹرز کیا اور کراچی آکر آباد ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔ بڑے صاحبزادے سید شاہد حسن نے گلاؤٹھی میں انتقال کیا۔شمیم بھائی نے مسلم اسکول بلند شہر میں پڑھایا ہے۔میرا گلاؤٹھی میں یہ دوسرا گھر ہے، جہاں بچپن اور نوجوانی کا ایک بڑا وقت گزرا۔سید صاحب بابوجی کے بہترین دوست تھے۔ان کی بیگم پھوپی نبی گلاؤٹھی میں جگت پھوپی تھیں۔ناطق گلاؤٹھوی کی بہن، ناطق صاحب سے اسی گھر میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ان کی صاحبزادیاں شاہدہ باجی،ظہرا باجی اور چھوٹی تسنیم میری منہ بولی بہنیں تھیں۔میری استاذ اور قیام علی گڑھ کے زمانہ میں رہبر اور دوست۔اب آپ بھی علی گڑھ میں مقیم ہیں۔میڈیکل کالج میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز رہیں، مجھے انگریزی پڑھائی اور اردو ادب سے روشناس کرایا۔آل انڈیا ریڈیو اردو محفل میں انہی سے خط لکھواتا اور جب ریڈیو پر خط سنتا تو بہت خوش ہوتا۔میری عمر اس وقت ۱۴ سال تھی۔

لال ڈگی جو اس وقت بہت بڑا تالاب تھا جواب سوکھ چلا ہے (بلکہ اب تو کالونی بن چکی ہے) اس کے بالکل سامنے ماموں حفیظ اللہ کا گھر جو دوکڑیا کے نام سے مشہور تھا۔سید سلیم اللہ صاحب کے صاحبزادے اور بھائی سید کفایت اللہ کے بھائی، ممانی پربتی اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں۔ بھائی نصر اللہ جو حبیب اللہ صاحب کے صاحبزادے تھے ساتھ ہی رہتے۔ ماموں حفیظ اللہ بابوجی کے دست راست بھی اور ان کے مختار عام بھی۔ بڑی اماں ان کی خالہ تھیں، میری امی کو بھی وہ خالہ ہی کہتے اور سمجھتے تھے۔ بھائی نصر اللہ نے مجھے علی گڑھ میں داخلے کا سبق دیا۔آگرہ کا تاج محل دیکھنے ہم انہی کے ساتھ گئے، بعد میں وہ ہمارے خالو بن گئے اور پڑوس میں ایک بڑے عرصہ ساتھ رہے۔ان کے بیٹے شہزاد اور بدر آج بھی اسی مکان میں مقیم ہیں۔اس زمانے میں پلکھن والی مسجد میں حافظ رحمت اللہ امام تھے۔

ساتھ ہی گلی میں چچا سید مختار الدین اور چچا حافظ رشید الدین کے گھر تھے۔ یہ دونوں مولوی حمید الدین صاحب کے برادران تھے۔اسی گھر کے ایک حصے میں مولوی احمد میاں صاحب رہتے تھے۔اسی گلی میں داروغہ عبدالوہاب صاحب کا گھر تھا، جن کے بیٹے ساجد اور ماجد گلاؤٹھی میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔اگلا گھر بھائی مسرور واسطی اور پھوپی احسانی کا تھا، ہمارے بچپن میں

ہی مسرور بھائی علی گڑھ سے ڈگری لے کر کراچی میں آباد ہوئے۔ یہ گھر دراصل کھرنجہ کا ہی حصہ تھا۔اس گلی کا آخری مکان چچا علی حسن کا تھا جن کے اکلوتے بیٹے آل حسن علی گڑھ سے ڈگری لے کر ہمارے بچپن میں کراچی ہجرت کر گئے، ان کی والدہ ہماری استانی تھیں اور ہماری تعلیم کی ابتدا یہاں آنے کے بعد ہوئی اور اردو کا پہلا قاعدہ اسی گھر میں پڑھا۔

کھرنجہ کیا تھا، کئی گھروں پر مشتمل صوفی محمد حسن کا خاندان۔صوفی صاحب مدرسہ منبع العلوم کے مہتمم اور استاد۔آپ کے بیٹے سید فخر الحسن اور سید شمس الحسن، حکیم محمد ارشد اور حکیم صالح۔ ہمارے وقتوں میں حکیم محمد صالح کے صاحبزادے حکیم مصلح حیات تھے۔مولانا اصلح الحسینی اور مولانا اکمل الحسینی پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ یہ حضرات ہماری والدہ کے خالہ زاد بھائی اور ہمارے ماموں ہوتے تھے۔ ماموں اصلح کی بیٹھک اور شام میں اس کے سامنے موڑھے پر بیٹھے، ان کی بارعب شخصیت مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ان کے انتقال کے بعد کشور باجی اور ممانی کا گلاؤٹھی آنا اور ان سے ملاقات یقیناً نصف صدی کا قصہ ہیں۔تائے شمس الحسن کا دبدبہ، ان کی صاحبزادیاں، آپا جمیلہ اور داماد حنیف صاحب جو ہمارے بزرگ دوست بھی تھے اور تعلیم نسواں کے بہت بڑے داعی اور گرلز اسکول کے بانی پڑھے لکھے انسان اور نہایت مخلص اور سادہ تھے۔اسی گھر میں خالہ سعیدہ رہتی تھیں جو سید حسن صاحب کی اہلیہ اور کھرنجہ کی ایک بڑی جانی پہچانی شخصیت تھیں۔محبت بانٹنے والی خاتون اور ایک باغ و بہار شخصیت تھیں۔ان کی صاحبزادی شاکرہ کی شادی بھائی نصر اللہ کے بیٹے سید بدر سے ہوئی اور یہ خاندان اسی گھر میں مقیم ہے۔

سید فخر الحسن صاحب میرے والد کے بہترین دوست تھے۔اپنے بچپن میں انکو میں والد صاحب کے ساتھ گھنٹوں محو گفتگو دیکھا اور بارہا ان کے ساتھ ڈاک گھر جانا اور خطوط کا انتظار کرنا ہوتا تھا، انہیں اپنے صاحبزادے محمود واسطی، شاہد واسطی، صاحبزادی رضیہ اور قیصرہ کے خطوط کا انتظار ہوتا تھا۔ہم اپنے والد کے ساتھ آتے، بھائی ریاض، بھائی شمیم اور فصیح کسی نہ کسی کے خط کا انتظار کرتے۔ رضیہ باجی اور آپا نوابن کے خطوط کا بھی انتظار کرتے۔ بڑے صاحبزادہ راغب حسن کوتوال لکھنؤ سے ریٹائر ہو کر جب گلاؤٹھی آئے تو ان کی رعب دار شخصیت سے ہم بھی مسحور ہو گئے تھے۔منجھلے صاحبزادہ سید محمود حسن کی صاحبزادی عابدہ ہماری اہلیہ ہیں اور ہمارے سو سالہ خاندانی تعلق کو قریب ترین لانے کا سبب بھی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہمارے صاحبزادے کامران کی شادی بھی محمود واسطی صاحب کے صاحبزادے اور ہمارے دوست سید مسرور واسطی کی صاحبزادی سے ہوئی۔اور ان کی اور عزیزی نیلوفر کی اولاد کی شکل میں ہم اب کھرنجہ کی پانچویں نسل دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔الحمد للہ حافظ صاحب کا شمار قصبہ کے نہایت زیرک اور فہیم اشخاص میں ہوتا تھا۔قصبہ کی مسلم لیگ کے پر جوش ورکر اور میرے والد کے ساتھ تحریک پاکستان کے گمنام سپاہی، ہمارے والد نے مدرسہ منبع العلوم سے متعلق معاملات میں حافظ صاحب کا ساتھ دیا اور حافظ صاحب نے بھی مفید عام اسکول اور دیگر تعلیم سرگرمیوں اور جدوجہد میں والد صاحب کا ساتھ دیا۔حافظ صاحب کی دوسری بیگم سے بڑے جناب فاخر حسن واسطی گلاؤٹھی میں مقیم رہے اور پچھلے سال انتقال کر گئے۔تین صاحبزادگان عادل حسن، صاحب حسن اور شہنشاہ حسن نے بمبئی کا رخ کیا اور وہیں کے ہو رہے۔شہنشاہ حسن حیات ہیں۔

حافظ صاحب کی بڑی صاحبزادی رضیہ خاتون کی شادی محلّہ رسالداران کے بھائی شمیم واسطی سے ہوئی اور جناب تنظیم

واسطی انہی کے فرزند ہیں، دوسری بیٹی قیصرہ خاتون کی شادی والدہ کے پھوپی زاد بھائی مبین احمد جن کا تعلق مدرسہ سادات ہاپوڑ سے تھا ہوئی اوران کے صاحبزادہ متین احمد دمام میں مقیم ہیں۔

محلّہ پلولیان میں کھرنجہ سے ذرا آگے بڑھیۓ تو بائیں طرف نواب عبدالرشید کا محل ہے اور سیدھے طرف سید ظفر احمد صاحب کا گھر ہے۔نواب عبدالرشید خالہ نواب بانو کے شوہر ایک فرشتہ صفت انسان ہیں،جنھوں نے خالہ نواب بانو کے پہلے شوہر کی اولاد اور بھائی سے بہنوئی سید حامد علی صاحب کی پرورش،تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ایسے جیسے کوئی اپنی اولاد کی کرسکتا ہے۔خالہ نواب بانو،خالہ شہر بانو،کفیل محمد اور جمیل محمد کا خاندانی گھر محلّہ کھرنجہ میں ہی آتا ہے۔ہمارے بچپن میں کفیل محمد صاحب کی رہائش بلند شہر میں تھی۔مسلم لیگ کے ضلعی صدر اور قاید ملت لیاقت علی صاحب کے دستِ راست اور مشہور وکیل تھے۔بابو جی کے بہترین دوست تھے۔۱۹۴۶ء کے الیکشن میں وہ ان کے پولنگ ایجنٹ تھے بلکہ مسلم لیگ کے صوبائی اسمبلی کے امیدوار کنور عمار احمد خان نواب صاحب دانپور کے قریبی دوست تھے۔مفید عام اسکول میں مسلم لیگ کا کامیاب جلسہ کرانے میں بابو جی کوان کا تعاون حاصل تھا۔ان کے ایک بیٹے شکیل احمد دہلی میں مقیم تھے اور گلاؤٹھی آتے جاتے ہمارے بھی مہمان ہوتے۔دوسرے بیٹے خلیل احمد پاکستان کے ممتاز سائنس دان عبدالقدیر خان اے کیو لیبارٹری کے دست راست تھے۔خلیل بھائی کے صاحبزادے شاہد بھائی،محمد احمد واسطی کے داماد ہیں۔جمیل محمد صاحب کے صاحبزادے عقیل محمد مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور وہیں جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔اللہ تعالی ان بزرگوں کو غریق رحمت کرے(آمین)۔خالہ شہر بانو کی شادی ڈپٹی عبدالواسع صاحب سے ہوئی اوران کا محل نما مکان کھرنجہ سے نکل کر جامع مسجد کی پشت پر تھا۔گلاؤٹھی کا سب سے پڑھا لکھا خاندان ڈاکٹر رئیس احمد کا تھا جو وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے صدر ڈاکٹر نفیس احمد اور حسیب احمد صاحب سنگر کمپنی کراچی کے جنرل منیجر تھے۔بڑی بیٹی گلاؤٹھی کی پہلی گریجویٹ خاتون اور داماد کمشنر کے عہدہ پر فائز رہے۔بدر باجی حسیب احمد صاحب کی بیگم اور سید ممتاز الدین صاحب کی بیٹی تھیں جو گلاؤٹھی کی دوسری گریجویٹ خاتون تھیں۔۱۹۵۰ء کے آخر عشرہ میں ان کی شادی بھائی حامد علی جعفری سے ہوئی تھی جن کی پاکستان سے تشریف آوری مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

تو میں ذکر کر رہا تھا خالو ظفر احمد صاحب اوران کے گھر کا۔جی یہ گھر پھوپی اصغری کا ہے،ان کے اکلوتے بیٹے قمر بھائی کا چند سال قبل انتقال ہوا۔خالہ اصغری نہ صرف ہماری دادی کی قریبی رشتہ دار تھیں بلکہ میری بیوی کی ننھیال یعنی عابدہ کے نانا کی بہن (کپورتھلہ کا مشہور خاندان صادق علی صاحب کی اولاد) ایک عرصہ گلاؤٹھی میں قیام رہا اور بعد ازاں علی گڑھ میں،اکثر ان سے ملاقات ہوئی اوران بزرگ خاتون سے تعلق داری ،شفقت اور محبت کل کی ہی بات تو لگتی ہے۔۱۹۶۷ء میں ان کے بیٹے قمر بھائی کی شادی میں گاتے بجاتے بس میں جے پور جانا اور وہ برادری کے لڑکے اور لڑکیوں کی راستہ میں آگرہ اور فتح پور سیکری میں ہنگامہ آرائیاں۔بڑوں کی طرف سے خاص چھوٹ۔ابھی پچھلے سال قمر بھائی علی گڑھ میں وفات پا گئے(انا اللہ وانا الیہ راجعون)۔

پلولیان سے نکل کر اب چلتے ہیں محلّہ رسالداران کی طرف۔اسی چوک میں داروغہ عابد،حکیم سید حامد علی صاحب کا مکان ہے جن کے صاحبزادہ سعید اختر تھے،ابھی چند سال پہلے دمام سعودی عرب میں انتقال کر گئے۔ناظم آباد کراچی کے مشہور ڈاکٹر اور

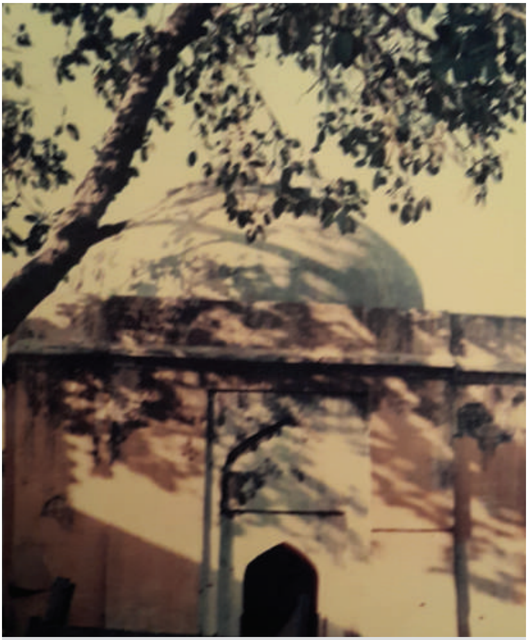
پیر جی کا مقبرہ

مشہور زمانہ عزیز الحق تھانوی کے داماد۔ہم ان کے بڑے مشکور ہیں، والد صاحب کے نہ صرف معالج رہے بلکہ اولاد کی طرح سعادت منداور تعلق برتنے والے شخص تھے، اخوان السادات گلاؤٹھی کے بڑے سرگرم کارکن اور ہمدرد رہے۔حکیم صاحب کا گلاؤٹھی میں رہنا اور کراچی میں بیٹے کے پاس چلا آنا ابھی کل ہی کی سی بات لگتی ہے

باز بخواں ایں

قصۂ پارینہ را

محلّہ رسالداران جسے عرف عام میں محلّہ گھوڑے والا بھی کہتے تھے، ہمارے گلاؤٹھی کے قیام کے دوران آباد نہ تھا، بیشتر مکیں پاکستان چلے گئے تھے جن میں شمیم واسطی، نسیم واسطی اور قسیم واسطی کے خاندن کے علاوہ بھائی کفیل احمد، میجر شکیل، وکیل احمد صاحبان کے خاندان بھی شامل ہیں۔قیام پاکستان سے پہلے بھی شمیم واسطی صاحب ریاست جودھپور میں مقیم رہے اور میجر شکیل صاحب کے والد شکوہ آباد میں بغرض ملازمت چلے گئے تھے۔اس محلّہ (چوک) میں داروغہ عابد کا سب سے آباد مکان تھا۔

سید فصیح الدین صاحب اور آپا انوری کا تھا۔آپا انوری گلاؤٹھی کی ایک بڑی خوددار اور غیور خاتون تھیں جنھوں نے بڑی محنت سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ان کے بیٹے بھائی ذکی، وجیہ، وصی اور نقی اور صاحبزادی فرحت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ بھائی وصی پاکستان آ گئے تھے اور حبیب بینک میں اعلی عہدہ پر فائز رہے۔فرحت علی گڑھ میں شعبہ کامرس کی پروفیسر رہیں۔گلاؤٹھی سے ہائی اسکول کرنے کے بعد جب میں مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے علی گڑھ پہنچا تو بالخصوص میری بڑی رہنمائی کی اور میں ان کے مشفق رویہ کا آج بھی مشکور ہوں۔

اب ہم منشی مہربان علی کے محل کی طرف رواں دواں ہیں۔آباد گھروں میں یوسف صاحب کا گھر جن کے صاحبزادے شاہ نواز اپنی والدہ کے ساتھ قدیم مکان میں رہتے تھے۔یوسف صاحب کی بیگم بھی ایک بڑی باہمت اور محنتی خاتون تھیں، جنھوں نے شوہر کے انتقال کے بعد کھیتوں اور کھلیانوں میں جا کر اور محنت کر کے اپنے گھر کو چلایا۔ یہ چوک مقدم عزیز اور چوپال کا علاقہ ہے۔مقدم عزیز جناب ناطق گلاؤٹھوی کے بھائی تھے اور برادری کی اہم شخصیت تھے۔محل سے پہلے گلی کے اخیر میں عبدالرحیم صاحب کا گھر آتا تھا۔یہ برادران ریاست چھتاری میں ملازم تھے اور ان کے بیٹے ظہیر پانچویں کلاس میں ہم جماعت۔انہی کے بھتیجے ڈاکٹر

غیور و برادران علی گڑھ شہر کی ممتاز شخصیت اور اپر کوٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ بلیغ میرے یونیورسٹی کے ساتھی تھے۔ محل کے سامنے منشی سلیم اللہ صاحب کا گھر تھا۔ منشی صاحب محل کے کارندہ تھے، ان کی ایک بیٹی کی شادی محل میں ہوئی تھی، بڑی صاحبزادی مولوی نظام الدین صاحب کی اہلیہ بھائی صفدر علی صاحب (مرحوم) کی ساس تھیں۔ تیسری بیگم اپنے شوہر داروغہ جی کے ساتھ علی گڑھ میں قیام پذیر ہیں۔

اب محل کو چلتے ہیں۔ منشی مہربان علی صاحب کا محل اور ہمارے زمانہ یعنی تقسیم کے بعد وہاں کے مکین دو صاحبزادیاں پھوپی محفوظ اپنے شوہر امتیاز الدین، بیٹے ممتاز الدین اور صابر صاحب کے ساتھ محل کے بالائی حصہ میں رہائش پذیر تھیں۔ دوسری عائشہ بیگم، صدیق علی صاحب کی بیگم تھیں اور محل کی ابتدائی داخلی حصے میں رہیں اور بیٹے ایکسائز انسپکٹر وقار احمد اور حسن بھائی کے ہمراہ قیام پذیر تھیں۔

پھوپی محفوظی کی خدمت میں اکثر حاضری رہتی جو ہمیشہ بھائی شفیع کی خیریت پوچھنا نہ بھولتیں، ان کی بہو ممتاز صاحب کی بیگم آپا نفیس جو ممتاز بھی تھیں اور نفیس بھی، ہمیشہ بڑی شفقت اور تعلق کا اظہار کرتیں، ان کی بیٹی بدر باجی (کراچی) ایسے ہی اوصاف کی مالک ہیں دوسری بیٹی کو تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن ننھی اللہ رکھی اور بھائی حسن سے ہم کبھی ملنا نہ بھولے۔ بھائی وقار اور ان کی بیگم شفیق اسم بامسمی تھیں جو پھوپی محمودی کی صاحبزادی تھیں، ان کے بچے کامران، ارمان، عمران علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ محل میں داخل ہوتے ہی سامنے ایک بڑا مہمان خانہ تھا، بھائی وقار کے شکار کئے ہوئے چیتے اور شیروں کے سر یہاں بڑی تعداد میں آویزاں تھے اور پورا مہمان خانہ ہی نادر اشیاء اور قدیم فرنیچر سے آراستہ تھا۔ بائیں جانب محل کی مسجد اور فیل خانہ تھا۔ مہمان خانہ کا اوپری چبوترہ بلند تھا اور عمارت کی شان کا مظہر بھی، ساتھ ہی فیل خانہ تھا جو ہم نے قدرے غیر آباد ہی دیکھا۔ منشی مہربان علی کی ایک بیٹی یعنی پھوپی صغیر سیٹھ کے سید شفقت اللہ صاحب کی بیگم تھیں۔ سید شفقت اللہ صاحب ہمارے زمانے میں قصبہ کی میونسپلٹی کے چیئرمین رہے۔ ان کے دوسرے الیکشن میں ہم نے بھرپور حصہ لیا۔ سید صاحب نے علی گڑھ سے وکالت پاس کی اور میرٹھ شہر میں وکالت کرتے رہے۔ منشی صاحب کی تیسری بیٹی اور عزیز الدین صاحب کی بیگم فاطمہ کا قیام کوٹھی پر رہا۔ کوٹھی ایک وسیع وعریض اور ایک عظیم الشان عمارت تھی جو گرانٹ ٹرنک روڈ دیوناگری کالج کے ساتھ واقع تھی۔ اس کا دروازہ اتنا بڑا تھا، خود عمارت بھی کافی بڑی تھی، جس میں کئی منزلیں تھیں اور غالباً نوکروں کی رہائش گاہ بھی رہی ہوگی۔ اس کا بیشتر حصہ ہمارے بچپن میں کھنڈر ہو چکا تھا۔ دروازہ سے رہائشی حصہ تک جانے کے لئے ایک پگڈنڈی تھی جس کے دونوں طرف باغات اور کھیت تھے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ کسی زمانہ میں یہ ایک سبزہ گاہ تھی۔

عزیز الدین صاحب کے بڑے صاحبزادہ ریاض الدین ہمارے بچپن میں انتقال کر چکے تھے جو قصبہ کی میونسپلٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کی بڑی صاحبزادی ننھی آپا (ریاض فاطمہ) تھیں۔ کوٹھی کے داخلی حصہ میں وہاج الدین صاحب ننھی آپا اور مسرور باجی کا قیام تھا اور بیرونی حصہ میں بھائی سید وجیہ الدین اور بھائی محمد احمد قیام پذیر تھے۔ بھائی محمد احمد کے بیٹے سلیم ہمارے دوست اور روز کے ملاقاتی۔ بھائی وجیہ کے صاحبزادے فصیح الدین نرورہ میں انجینئر تھے، چھوٹے عرفان بڑی کم عمری میں قصبہ کے

چیئر منتخب ہوئے (تین سال قبل اس دارفانی سے کوچ کر گئے)۔ بھائی محمد احمد اور بھائی وجیہ الدین کی بیگمات ڈاکٹر بقاءاللہ صاحب کی صاحبزادیاں تھیں، جنھوں نے ہمارے والد کو ہمیشہ کو ماموں کا درجہ دیا۔ اور ان کی شفقتیں اور نوازشیں یقیناً پھوپی محفوظ سے کم نہیں تھیں۔ ان کی بیٹی شمیم باجی علی گڑھ میں ہم سے سینئر تھیں اور چھوٹی انیس آج بھی اسی کوٹھی میں مقیم ہیں اور عارف بھائی کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہی ہیں۔

محلّہ شرافت اللہ اور رحمت مسجد سے ہم نے محلّہ فضل اللہ کی آبادیوں کا ذکر کیا تھا۔ سیدوں کی اس بستی میں اگر بازار کی طرف سے داخل ہوں تو محل کے ساتھ ساتھ پرانا بازار شروع ہوتا ہے۔ محل کے سامنے والے حصے میں عطاءاللہ صاحب کا محل تھا جو ہمارے بچپن میں ہی کھنڈرات کی شکل اختیار کر گیا تھا، معلوم نہیں اس خاندان کا کوئی وارث حیات ہے یا نہیں۔ آگے کی طرف چلیں تو بنارسی پنساری کی دکانیں اور سیدھے ہاتھ پر سید قمر عطار صاحب کا یونانی دواؤں کا مطب تھا۔ ہمارے بچپن میں ان کے والد محمد عمر حیات تھے، آج ان کے پوتے محمد عامر عطارے کا کامیاب مطب چلا رہے ہیں۔ اس چوراہے پر مراری کا جنرل اسٹور تھا، سیدھی طرف مشہور زمانہ راؤ صاحب کے عطارے کی قدیم دکان تھی جن کا بیٹا ریوتی چند سال پہلے تک حیات تھا۔ اسی کے سامنے نانک اور بابو حلوائی کی دکانیں تھیں۔ راؤ صاحب کی دکان سے پہلے الٹے ہاتھ کو مڑیں تو ڈاکٹر کوہلی کا مطب تھا اور اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرشید کا مطب جو ہمارے بچپن ہی میں احمد پور شرقیہ جا آباد ہوئے۔ اسی بازار سے آگے بڑھئے تو ڈاکٹر امر سنگھ کا مطب تھا۔ راؤ صاحب کے ساتھ ہی ڈاکٹر خزان سنگھ کا مطب اور پنّا لال کے کپڑے کی دکان تھی۔

پرانے بازار سے اگر جامع مسجد کی طرف چلیں تو ڈاکٹر کنج بہاری لال کا مطب اور کریم پان والے کی دکان اور ذرا آگے بڑھئے تو الٹے ہاتھ پر علیم کی چکّی اور لیجئے یہ پیر صاحب کا مزار اور پیر جیوں کا محلّہ آ گیا۔ مولوی فضل الرحمٰن کا گھر اسی محلّہ میں تھا لیکن وہ بلند شہر میں وکالت کرتے تھے، مشہور ادیبہ اور شاعرہ کشور ناہید ان ہی بزرگ کی نواسی ہیں۔ انہی کی نانی نے گلاؤٹھی میں پہلا لڑکیوں کا اسکول قائم کیا تھا۔ الٹے ہاتھ پر قاضیوں کے مکانات تھے۔ قاضی عبدالسلام، قاضی اسلام اور قاضی محمد احمد گلاؤٹھی کا ممتاز خاندان ہے۔ قاضی عبدالسلام کے باغات ہمارے باغوں کے ساتھ تھے، وہ ہمارے والد کے بہت اچھے دوست اور ان کے صاحبزادے محمد عرفان ہمارے اچھے دوست تھے۔

پرانا بازار جہاں ختم ہوتا تھا، چھوٹا بازار جو بزریا کے نام سے جانا تھا، شروع ہوتا ہے۔ یہاں برادی کے کئی افراد کی دکانیں تھیں جن میں سید نور احمد اور سید علی حسن ممتاز تھے۔ علی حسن کے صاحبزادے اقبال حسن مفید عام اسکول میں ہمارے استاذ تھے بعد ازاں پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ دوسرے صاحبزادے جاوید میرٹھ میں مقیم ہیں۔

اب ہم جامع مسجد کی پشت پر آ گئے۔ یہیں چچا سبحان اللہ کا گھر اور دکان تھی۔ اور برابر میں سینٹھ والے حکیم جی کا مطب تھا۔ ذرا آگے بڑھئے تو عزیز اور یٰسین کی آمنے سامنے قصائی کی دکانیں تھیں۔ جامع مسجد کے مدرسہ منبع العلوم میں چچا احمد میاں سے کچھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا شرف ہمیں بھی رہا ہے۔ اسی طرح چچا سبحان اللہ اور چچا علی حسن کی بیگم ہماری استاذ تھیں۔ خدا ان سب بزرگوں کو غریق رحمت کرے۔ (آمین) چچا علی حسن کے بیٹے آلِ حسن کراچی میں ہیں اور سبحان اللہ کا خاندان دہلی میں۔ مسجد سے

جامعہ مسجد قصبہ گلاؤٹھی

ملحق اراضی میں محمود باجے والے کی دکان تھی اور آگے راستہ چوپال کی طرف جاتا تھا۔ یہاں مقدم عزیز کے سوا بیشتر آبادی قصابوں کی تھیں۔

گلاؤٹھی کی آب وہوا معتدل ہے لیکن گرمی، سردی اور برسات کے موسم مخصوص مہینوں میں آتے ہیں لیکن نہ سردی بہت شدید ہوتی ہے اور نہ گرمی۔ بارشیں خوب ہوتی ہیں لیکن نکاسی آب کا نظام فعال ہونے کی وجہ سے زحمت کا باعث نہیں بنتیں۔ آموں کی باغات کی کثرت ہے۔ پرانے باغوں میں آموں کی سینکڑوں قسمیں ہیں، ان میں سب سے مشہور بر کھلی تھا جو شفقت اللہ صاحب کی ملکیت تھا۔ بابو جی نے قلمی آموں کے باغوں میں کمرشل بنیاد پر پہل کی۔ دسہری، چونسا، رٹول ہمارے باغوں میں ضلع میں متعدد بار نمبر ایک قرار دیا گیا۔ آموں کے علاوہ بیری کے باغات بھی بہ کثرت ہیں۔ گنگا جمنا کے اس دوآبہ میں گنّا و گیہوں اور کپاس کی کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور یہ خطہ یوپی کا زرخیز ترین خطہ ہے۔

تہوار بہت ہی جوش وخروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں۔ قدیم عیدگاہ رحمت اللہ صاحب کی بنائی ہوئی ہے جو اگنجٹی کے عقب میں واقع ہے، عید کی نماز مولوی سید حمید الدین یا ان کے صاحبزادے قاری محمد میاں پڑھاتے تھے۔ عید سے واپسی میں پہلا پڑاؤ ہمارا گھر ہوتا تھا۔ چچا وحید الدین اور چچا حمید الدین اور ان کے سب صاحبزادگان سب سے پہلے آنے والوں میں ہوتے تھے۔ شب برأت پر پھلجھڑیاں، انار کلی اور بازار میں اکھاڑے ہیں اور زور آزمائی میں اپنی بہادری دکھاتے۔ حلوے مختلف انواع واقسام میں نہ صرف بنتے بلکہ برادری میں تقسیم ہوتے۔ گو بیشتر گھروں میں نذر و نیاز نہیں ہوتی تھی چونکہ اکثریت فقہ دیوبند سے تعلق

رکھتی تھی۔

محرّم الحرام بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اَلَم ،مہندی اور تعزیے کے جلوسوں میں ہم نے بھی شرکت کی ہے،الم اور تعزیوں کے جلوس کے ساتھ پٹا (لاٹھیوں کا کھیل) کھیلنے کا رواج تھا۔ان جلوسوں میں چچا سید ابرار احمد بھی اپنے کمالات دکھاتے ۔الم کا ایک قافلہ حکیم اللہ رکھے کی بیٹھک سے اور مہندی نور احمد تیر گر کے مکان سے نکلتی ۔یہ سب لوگ اہل سنت حضرات ہی مناتے تھے،قصبہ میں کوئی شیعہ آبادی نہیں تھی۔عبد الکریم نائی کالا کرتا پہنے عزہ داروں کے جلوس میں مرثیہ پڑھتے ہوئے گزرتا۔آج بھی مجھے اس کا یہ مرثیہ یاد ہے

اصغر پیاسے رن کو چلے بانو کی گودی کے تلے

یہ سب وہ یادداشتیں ہیں جنہوں نے ''گلاؤٹھی'' کو ہم سے کبھی الگ اور علیحدہ ہونے نہیں دیا۔آج بھی جب کبھی سورج ہمارے سر آتا ہے تو بیساختہ ہم کسی نیم یا آم کے درخت کے سائے کو تلاش کرنے لگ جاتے ہیں۔کبھی میٹھی نیند لینے کا دل چاہتا ہے تو کچی مٹی سے لِپا ہوا وہ چبوترہ جس پر گولر کے پیڑ نے اپنی شفقت بھری زلفیں بکھیر رکھی ہوں اور بلا لحاظ مذہب وملت سایہ تقسیم کر رہا ہو یاد آتا ہے۔جب کبھی کوئی عمدہ خوشبو استعمال کرتے ہیں تو آموں کے بور کی خوشبو،کھیتوں کی گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو کے تصور کے بعد ہر خوشبو ہیچ لگنے لگتی ہے۔اعلیٰ ترین برتنوں میں ہم آج بھی کھانے کا وہ مزا تلاش کرتے ہیں جو چولہے پر پکی تازہ روٹی اور اس پر اصلی گھی اور سرخ مرچوں کی چٹنی لگا کر کھانے میں آتا تھا۔گرمی کی دوپہر میں دوستوں کے ہمراہ گھروں کی چھتوں پر وقت گزاری، گرمی کی شاموں میں سڑکوں اور راستوں پر پانی کے چھڑکاؤ کے بعد جو طبیعت میں فرحت وانبساط محسوس ہوتا تھا وہ آج تمام آسائشوں کے بعد بھی دستیاب نہیں ۔بزرگوں کا احترام ،چھوٹوں پر شفقت ، ذہنی آسودگی ،تفکرات سے عاری شب وروز، صلہ رحمی ،کتابوں میں سوکھے ہوئے پھول، یہ وہ سب چیزیں جو ہماری زندگی کا ایک حصہ تھیں،اُن سب نے آج تک ہمیں اپنے وطن سے نہ تو دور ہونے دیا اور نہ ہی وطن کو بھلانے دیا۔

گلاؤٹھی کتاب ان ہی کیفیات کے مجموعے کا نام ہے۔اس میں محض تاریخ نہیں۔ بلکہ یہ کتاب ایک یادداشت ہے، ایک ڈائری ہے۔وہ سب کچھ جو ہمارے ذہنوں میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ محفوظ اور باقی ہے،اس کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

☆☆☆